مطالعہ علومِ اسلامیہ
اردو ترجمہ
كِتَابُ الصَّلَاةِ
مِنَ الهداية
تصدرها:
المكتبة العلمية
١٥ - ليک روڈ، لاہور
للطباعة والنشر والتوزيع
مغرب پاکستان

اردو ترجمہ

كتاب الصلاة

من

الهداية

غازی احمد

ایم : اے (عربی ، گولڈ میڈلسٹ)
ایم - اے (علوم اسلامیہ ، گولڈ میڈلسٹ)
ایم - او - ایل ، بی - ایڈ
مولوی فاضل (میڈلسٹ)
منشی فاضل - فاضل درس نظامی
ڈبلیو - پی - ای - ایس (I)

المكتبة العلمية ○ لاهور

طبع دوم : اگست ۱۹۹۰ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار

قیمت : 65/= روپے

ناشر : خان عبیدالحق ندوی
طبع فی مطبعة المكتبة العلمية
۱۵- لیك روڈ ، لاہور

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان عظیم ہے جس نے مجھے ایک بلند پایہ دینی کتاب کے چند ابواب کا ترجمہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں میری تقرری شعبۂ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں استاذ فقہ کے طور پر ہوئی۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے دو اجزاء کتاب النکاح اور کتاب الطلاق ایم۔ اے کے نصاب میں شامل تھے۔ طلبہ کی سہولت کے مدنظر خیال آیا کہ اگر ان دو اجزاء کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے تو ان کے لیے اس کتاب کے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ پروفیسر بشیر احمد صاحب صدیقی نے نہ صرف میرے خیال کی تائید ہی کی بلکہ انہوں نے ہر طرح سے تعاون کرنے کا وعدہ کر کے میری ہمت بھی بندھائی۔ لیکن میری سب سے پہلی سعی ناتمام کے ساتھ کسی پبلشر کا تعاون اس وقت تک ایک امر موہوم تھا۔ اس سلسلے میں میں بڑی حد تک مولانا عبیدالحق صاحب ندوی مالک المکتبة العلمية ۱۵ ۔ لیک روڈ، لاہور کا مرہون منت ہوں جن کے پرخلوص وعدۂ اشاعت نے میرے خیال کو عزم صمیم سے بدل دیا۔ پروفیسر بشیر احمد صاحب نے اصلاح ترجمہ کا کام بڑے خلوص سے سر انجام دیا۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی میں قیام کے دوران کتاب النکاح اور

کتاب الطّلاق کا ترجمہ زیور طبع سے آراستہ ہو گیا جس کے لیے میں پروفیسر بشیر احمد صاحب اور مولانا عبیدالحق صاحب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ ان دونوں اجزاء کے ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن مارکیٹ میں آ چکا ہے۔

ایک دن صاحب المکتبۃ العلمیۃ سے دوران ملاقات ہدایہ اولین کے باقی اجزاء یعنی کتاب الصلاۃ، کتاب الزکاۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج کے متعلق بات چیت ہوئی۔ تو انھوں نے ان اجزاء کے تراجم کی اشاعت کے لیے بھی اصرار کیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد کتاب الزکاۃ کا ترجمہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو گیا۔

اب کتاب الصلاۃ کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ اس ترجمہ میں میں نے حضرت علامہ قاضی شمس الدین صاحب مد ظلہ العالی ساکن گوجرانوالہ کے ان ارشادات سے بھی بڑا فائدہ اٹھایا ہے جو زمانۂ تلمُّذ میں قلمبند کرتا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں دین و دنیا کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ اسی طرح نور الدرایہ کی چند اقساط بھی زیر مطالعہ رہیں اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا۔

کتاب الصلاۃ اور کتاب الزکاۃ کے مسودات کی اصلاح کے سلسلے میں مولانا عبیدالحق صاحب میرے شکریے کے خصوصاً مستحق ہیں جنھوں نے گونا گوں مصروفیات کے باوجود علمی خدمات میں میرا ہاتھ بٹایا اور ہر مشکل میں خندہ پیشانی سے میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اجرجزیل عطا

فرمائے اور سعادت دارین سے نوازے۔

مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اعتراف ہے لیکن بایں ہمہ یہ اللہ پاک و برتر کا فضل اور اس کی عنایت ہے کہ اس نے مجھ جیسے اسلام میں نو وارد شخص کو ھدایہ جیسی عظیم المرتبۃ دینی کتاب کی خدمت کی توفیق بخشی۔

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

تعارف مترجم

اگر میں اپنا مختصر سا تعارف کرادوں تو بے جا نہ ہوگا شاید اسی بہانے قارئین کی نیک دعائیں اپنے لیے حاصل کر سکوں ۔

میں ۱۹۲۲ء میں ضلع جہلم کے ایک دور افتادہ گاؤں میانی میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا ۔ والدین نے میرا نام کرشن لال تجویز کیا، میرے خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے اور شروع میں میرا میلان طبع بھی انہی عقائد و نظریات کی طرف تھا۔ لیکن جب آٹھویں جماعت میں پہنچا تو میرا رجحان خود بخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔ اسی اثناء میں بوچھال کلاں ضلع جہلم کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف صاحب سے میری ملاقات ہوئی ، آنھوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کی ۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متأثر ہوا ، لیکن چونکہ میں ابھی بچپن کی منزل ہی کا راہی تھا ، اس لیے اپنے آبائی مذہب اپنے خاندان ، اپنے بہن بھائیوں ، اپنے والدین اور اپنے گھر بار کو چھوڑنے کا خیال بھی میرے ننھے سے دل میں قیامت خیز زلزلہ بپا کر دیتا ۔ میرا معصوم سا ذہن ایسی سوچ سے لرز جاتا ۔ جب بھی مجھے اسلام قبول کرنے کا خیال آتا ، دل میں ماں اور بھائیوں کی محبت کا بھاؤ تیز ہو جاتا تھا ۔

بچپن کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی میرے آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتا - یکم مارچ ۱۹۳۸ء کی سہانی اورمبارک رات کومیں نے خواب میں دیکھا کہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے عین سامنے کھڑا ہوں، سید الاولین والآخرین حضرت محمد رسول‌اللہ صلی‌اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی وأبی واُمّی) دیوار کعبہ سے تکیہ لگائے میرے سامنے جلوہ افروز ہیں اور ارد گرد صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں - میں والہانہ جذبہؑ و شوق کے عالم میں صحابۂ کرام کے درمیان سے گزرتا ہؤا سید الانبیاء کی بارگاہ اقدس میں پہنچا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر اپنے مبارک ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام لیا - جس سے میرے بدن کے ہر رگ و ریشہ میں مسرت و شادمانی کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی -

فرمایا ''کہو کیسے آئے ہو!''

''مشرف باسلام ہونے کے لیے آیا ہوں'' میں نے عرض کیا - یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پرانوار چہرہ وفورِ مسرت سے چمک اٹھا - آپ نے میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر آپؐ نے کچھ پڑھا جسے میں اس وقت سمجھ نہیں سکا - پھر فرمایا ''بس ! اب تم دولت اسلام سے بہرہ ور ہو گئے ہو'' -

حسب معمول صبح آنکھ کھلی تو میرا ننھا سا دل خوشی کے جذبات سے معمور تھا - جب والدہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تو انہوں نے مجھ سے خلاف معمول

اس قدر خوش خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی ۔ میں اس بات کو ٹال گیا ۔

مدرسہ کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف صاحب سے مل کر انھیں جب رات کا پُر لطف خواب سنایا تو انھوں نے فرمایا: ''روزانہ سوتے وقت اللہ تعالی سے راہ ہدایت کی دعا کیا کرو'' ۔ تین مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعرات کا دن تھا ۔ میں رات کو حسب معمول سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہؤا جیسے مدرسہ بند ہونے پر میں میانی کے تمام طلبہ کے ساتھ گھر آ رہا ہوں ۔ راستے میں ایک قوی ہیکل ، دیوقامت اور کریہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہوگیا ۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ دجّال ہے ۔ ہم میں سے جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو ۔ وہ یہی جواب دے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں ۔ پھر وہ میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا اور جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا اسے قسم قسم کے کھانے ، مزے مزے کے پھل اور طرح طرح کے کھلونے دیتا اور جو اس کی بات نہ مانتا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ۔ آخر میں جب میری باری آئی تو اس نے پوچھا ۔ کس کے بندے ہو ؟ ''اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ۔ یہ سنتے ہی اس نے میرے اس زور کا گھونسا رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا ، اور رونے لگا ۔ دجال نے تحکمانہ لہجہ میں آواز دیتے ہوئے کہا : ''ادھر آؤ'' ۔ میں ڈرتا کانپتا

آدھر چلا ہی تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شیریں آواز پڑی ۔ ''پہلے میرے پاس آؤ'' آپ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ ابھی دو دن پہلے تو میں نے آپ کو مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا آج یہاں کیسے تشریف لے آئے ۔ میں دجّال کی سخت مار کی وجہ سے روتا ہوا آنحضرتؐ کی بارگاہ عالی میں پہنچا ۔ آپ نے میری کمر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا ۔ ''دیکھو! میں صرف تمھاری خاطر یہاں آیا ہوں ۔ دجّال کی بات ہرگز نہ ماننا میں تمھارے لیے دعا کر رہا ہوں ۔ اللہ تعالی نے چاہا تو تم ناکامی کا منہ نہیں دیکھوگے'' یہ ارشاد فرما کر آپ جب تشریف لے گئے تو میں دجال کے پاس پہنچا ۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا ۔ اور میں نے بھی حسب سابق وہی جواب دے دیا ۔ اس پر وہ مارے غضب کے لال پیلا ہو گیا اور اس نے جھلّا کر جب میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مارے دہشت کے میری چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر صبح تک مجھے نیند نہ آ سکی ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج بوچھال کلاں پہنچ کر قبول اسلام کا اعلان کر دوں گا ۔ والدہ محترمہ نے جب صبح کو کھانا تیار کیا تو میں نے ان کے پاس بیٹھ کر کھایا ، اس وقت دل میں جذبات کا تلاطم بپا تھا ۔ جانتا تھا کہ آج ہمیشہ کے لیے ماں اور بھائیوں سے جدا ہو رہا ہوں ۔ پھر اس گھر میں جہاں زندگی کی کئی بہاریں لوٹی ہیں ۔ شاید ہی قدم رکھنا

نصیب ہو ۔ بھائیوں کی محبّت و شفقت نے مجھے مجبور کیا تو
بہانے بہانے ہی میں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر دل کو تسکین
دی ۔ اسی طرح حیلے بہانے سے پیاری اماں کے قدم چھو کر
ہدیہؑ عقیدت و احترام پیش کیا ۔ کھانے سے فارغ ہوا تو
بستہ اٹھایا اور اپنے گھر ، تینوں بھائیوں اور محترمہ والدہ
کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالی ، اور پرنم آنکھوں سے میں
اپنے آبائی گھر سے رخصت ہو گیا ۔ ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعہ
کا مبارک دن اور محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ میں دوپہر کے
وقت نہادھو کر سیدھا مسجد میں داخل ہوا ، مولانا عبدالرؤف
صاحب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا ، اور غازی احمد نام
تجویز ہوا ۔

میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی تو کہرام
سا مچ گیا ۔ سب نے رونا پیٹنا شروع کر دیا ۔ میرے والد
صاحب کشمیر میں ملازم تھے انہیں اور دوسرے رشتہ داروں
کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا ۔ ابھی تین چار روز بھی گزرنے
نہ پائے تھے کہ والد صاحب نے دوسرے ہندو رشتہ داروں
سے مل کر مولانا عبدالرؤف اور ملک محمد طفیل ہیڈ ماسٹر
پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انہوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ترغیب
وترہیب سے زبردستی مسلمان بنا لیا ہے ۔ ایس ۔ ڈی ۔ ایم
کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا ۔ ایک طرف والد محترم اور
متعدد ہندو رشتہ دار تھے اور دوسری طرف میں اور ہزاروں
کی تعداد میں مسلمان ۔ عدالت میں میرے بیان ہوئے ۔ میں نے
کہا : ”میں اپنی رضاء ورغبت سے مسلمان ہوا ہوں ۔ میرے

قبول اسلام میں کسی فرد بشر کا ہاتھ نہیں ۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا ۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔"
جب فیصلہ میرے حق میں ہوا تو مسلمان خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے عدالت سے واپس لوٹے ۔

میرے والد صاحب بھلا کب نچلے بیٹھنے والے تھے ۔ انھوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر انھیں کہیں بھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی ۔ پولیس نے ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر بڑی تحقیق وتفتیش سے کام لیا ۔ مگر میرے رشتہ داروں کو اپنا مقصد حل ہوتا نظر نہ آیا ۔ ہر عدالت میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان میرے ساتھ ہوتے ۔ جو اکثر اوقات بوچھال کلاں سے پیدل چل کر جایا کرتے ۔ اس کے بعد والد محترم نے سیشن جج جہلم کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ میرے نابالغ لڑکے کو زبردستی مسلمان بنا لیا گیا ہے ۔ جہلم کے سرکردہ ہندو ان کے ساتھ تھے ، جنھوں نے مل ملا کر جج صاحب پر دباؤ ڈالا ۔

عدالت میں پیشی ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ جج کا رویہ میرے بارے میں ٹھیک نہیں ۔ اس پیشی پر دو تین حضرات میرے ساتھ تھے ۔ جج صاحب نے مجھے دوسری تاریخ پیشی تک میرے والد کے سپرد کر دیا ۔ جب میں نے والد محترم کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا اور دریا کے کنارے ایک مندر میں مجھے لایا گیا ۔ جہاں سارا دن میں نے رو دھو کر گزارا ۔ والدہ محترمہ کو بھی جہلم بلایا گیا ۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اف

کے حق میں بیان نہ دے تو وہ گھر پر زندہ نہیں جائیں گی بلکہ دریا میں کود کر خود کشی کر لیں گی ۔ دوسرے ہندو بھی وقتاً فوقتاً آ کر مجھے سمجھاتے بجھاتے اور قسم قسم کے لالچ دیتے رہتے ۔

اس اثناء میں والد صاحب نے ہندو اکابر کے اثرو و رسوخ سے کام لے کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفیکیٹ حاصل کرلیا اور اسے مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے ہی عدالت میں پیش کر دیا ۔ جج صاحب نے جب مجھ سے یہ پوچھا کہ آپ والدین کے پاس رہنے میں خوش ہیں ؟ تو میں نے نفی میں جواب دیا ۔ لیکن افسوس کہ میری کسی بات کو وقعت نہ دی گئی اور زبردستی مجھے والدین کے سپرد کر دیاگیا ۔ تعجب تو اس بات پر تھا کہ والد محترم کے حق میں فیصلہ دینے والے جج صاحب مسلمان تھے ۔ والد محترم بتایا کرتے کہ انھوں نے ان صاحب کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرایا تھا ۔

اسی دن والد محترم مجھے ساتھ لے کر کشمیر روانہ ہو گئے ۔ دو تین دن جموں میں ایک پنڈت صاحب کے ہاں فروکش ہوئے ۔ پنڈت صاحب نے بھی مجھے رام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ان کے غیر معقول دلائل مجھے ذرا بھی متأثر نہ کر سکے ۔ یہاں پہنچ کر میں نے مولانا عبدالرؤف صاحب کو خط لکھنے کی کوشش کی ، مگر کامیاب نہ ہو سکا ۔ والد محترم نے سوتے میں وہ خط میری جیب سے نکال کر اپنے پاس محفوظ کر لیا ۔ چوتھے دن والد بھدرواہ کیلیے روانہ

ہو گئے ۔ بٹوت تک بس کے ذریعے پھر بھدرواہ تک پیدل ہی راستہ طے کیا ۔ دوسرے دن میرے والد مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کہا : دیکھو میں اس مقدمے میں تم پر دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا ہوں ۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا ۔ خاندان میں میری ذرہ بھی عزت نہیں رہی ۔ یہ کہا اور میرے والد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی والد محترم کی آنکھوں میں اس طرح آنسو دیکھے تھے، میرا دل پسیج گیا ۔ مگر معاً رحمت ایزدی نے مجھے سہارا دیا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے تمام حالات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے ۔

میں نے اپنے والد محترم کی خدمت میں عرض کیا ۔ ’ مجھے آپ کی پریشانیوں اور تکالیف کا احساس ہے ۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ۔ میرا دل ترک اسلام کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا ۔ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں تو تمام عمر آپ کی غلامی میں بسر کر دوں گا ۔“

والد نے یہ سنتے ہی چھڑی ہاتھ میں لے کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا ، اور اتنا پیٹا کہ بدن سے خون بہہ کر سارے کپڑے خون آلود ہو گئے ۔ اس پر بھی والد محترم کو رحم آیا نہ ان کے ہاتھ کی حرکت میں کوئی کمی آئی ۔ میں ادھ مؤا ہو کر بھی پڑا ٹھوکریں کھاتا رہا ۔ آخر جب دل کا غبار

اچھی طرح نکال چکے تو پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :
''کیوں نہ میں اسے دریا میں دھکیل دوں ۔ شاید اسی طرح کلنک کا یہ ٹیکا میرے ماتھے سے اتر جائے ۔'' پہاڑی کے دامن میں بپھرتا ہوا دریا میرے سامنے تھا ۔ اپنی موت کے خوف سے میں لرزگیا ، مگر اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی ، اور میرے دل میں یہ خیال بار بار ابھرنے لگا کہ اگروالد مکرم نے مجھے دریا میں پھینکا تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا : ''میرے آقا ! آپ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی تھی ، میں اس کو صحیح و سالم لے کر حاضر ہو گیا ہوں ۔''

پنڈت صاحب نے جو مارے خوف کے کانپ رہے تھے ۔ والد محترم سے کہا : ''بچہ ہے ۔ بڑا ہو کر سنبھل جائے گا ۔ آپ کوئی سخت اقدام نہ کریں'' ۔ والد صاحب نے اس کی بات مان لی اور مجھے ساتھ لے کر آپ نے چپ چاپ گھر کی راہ لی ۔گھر پہنچ کر والد نے خود میری مرہم پٹی کی ۔ چھڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا رواں رواں زخمی تھا ، حتّٰی کہ ناک ، منہ اور آنکھیں تک متورّم تھیں ۔ تقریباً ہفتہ بھر بستر ہی پر دراز رہا ۔ پھر والد محترم نے مجھے بھدرواہ ہائی سکول میں داخل کرا دیا ۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں روز سکول آنے جانے لگا ۔ مسلمان طلبہ کو میرے ساتھ بات تک کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ ہندو لڑکے ہی نہیں بلکہ ہندو اساتذہ بھی مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ یہ سکول میرے لیے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا ۔ آخر کار

میں نے دوست محمد نامی ہم جماعت سے تعلقات بڑھائے اور اس کے توسّط سے مولانا عبدالرؤف صاحب کو خط لکھا اور بتایا کہ میں بفضلہ تعالیٰ اسلام پر قائم ہوں۔ حضور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہی کی یہ برکت ہے کہ مجھے کوئی جسمانی تکلیف اسلام سے برگشتہ نہیں کر سکی۔

مولانا نے خط ملتے ہی قصبے کے سارے لوگوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا "کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے عذاب سے چھٹکارا دلائے"؟ اس پر ایک غریب لیکن جذبۂ شہادت سے سرشار شخص اٹھا اور اس نے اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اس کا نام جان محمد تھا۔

جان محمد صاحب اوقات مدرسہ ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے۔ اور دوست محمد کی وساطت سے جب مجھے ان کی آمد کا پتا چلا۔ تو میں تفریح کے بعد روتا روتا اپنے ماسٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور کہا میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ مجھے چھٹی عنایت فرمائی جائے۔ ماسٹر صاحب نے چھٹی دے دی۔ میں بستہ اٹھا چھپتا چھپاتا آنکھ بچاتا ہوا مدرسہ سے نکل آیا۔

جان محمد صاحب نے ایک مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم بھدرواہ سے بھاگ، راتوں رات سفر کرتے ریاست کشمیر سے نکل ریاست چنبہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ پھر مسلمان راہبر واپس ہو گیا اور ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل سفر طے کر کے تیسرے دن صبح ڈلہوزی پہنچے۔ تکان سے میرا برا حال تھا کپڑے میلے اور پاؤں متورّم تھے۔

شام کو بذریعہ پٹھانکوٹ جب امرتسر پہنچے تو میں نے اپنا آبائی لباس اتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور امرتسر سے کھیوڑہ کی راہ بوچھال کلاں پہنچ گئے ۔ بس سٹینڈ پر لوگوں کا ایک ہجوم پذیرائی کے لیے موجود تھا ۔

والد کو جب میرے فرار کا علم ہوا تو انھوں نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرنے کے لیے تاریں دلا دیں ۔ لیکن جس راستے کو ہم نے اختیار کیا تھا وہ والد صاحب کے علم میں بھی نہ تھا ، اس لیے ہم بچ نکلے ۔

چند روز بعد والدہ صاحبہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اشکبار ہو کر فرمایا : ''بیٹا ہمیں اس قدر ذلیل ہی کرنا تھا تو پہلے بتا دیا ہوتا ۔ تاکہ خرچ کرنے سے تو بچ جاتے ۔'' عرض کیا : ''اماں جی ! میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اسلام کو ترک کرنے پر کسی صورت بھی آمادہ نہیں ہو سکتا ۔ آپ میرے لیے کچھ نہ کریں ۔ ہاں ویسے میں آپ کا غلام ہوں ۔ آپ کی ہر خدمت میرے لیے سعادت کا موجب ہے ۔ مجھے آپ کے وہ احسانات یاد ہیں کہ جب بھی میرے خاندان والوں نے مجھے ختم کرنے کی کوئی سازش کی تو آپ نے مجھے اس سے پہلے ہی مطلع کر دیا ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے ۔''

میں نے والدہ صاحبہ سے صلح کر لی تھی اور اکثر والدہ مکرمہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ۔ مگر والد محترم کو میں نے چھ سال کے بعد دیکھا تھا راستے میں اچانک آمنا سامنا ہو گیا ۔ مگر وہ بغیر توجہ دئے ہی میرے

پاس سے گزر گئے ۔ میں بھی انہیں بلانے یا اُن سے ہاتھ ملانے کی جرأۃ نہ کر سکا ۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر میرے خاندان کے تمام افراد ہندوستان چلے گئے اور میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ پاکستان میں رہا اور اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو گیا ۔ ۱۹۵۰ء میں والد کی وفات ہوگئی ۔ والدہ مکرمہ اور تین بھائی انبالہ کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہیں ۔

۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان میں نے سکول میں اول رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا ۔ بعد ازاں میں نے علوم دینیہ کی طرف توجہ دی ، چنانچہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک مدرسہ خادم الشریعۃ پنڈی گھیپ ، مدرسہ عربیہ اشاعۃ القرآن گجرات اور دارالعلوم دیوبند میں علوم دینیہ کی تکمیل کی ، ۱۹۴۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں اول رہا ۔

میرا ایمان ہے کہ یہ ساری کامرانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی مرہون منت ہیں، ۱۹۵۴ء میں ایف اے ۔ ۱۹۵۶ء میں بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فرسٹ ڈویزن حاصل کی ۱۹۵۷ء میں بی ایڈ کیا ۔ ۱۹۵۸ء میں ایم ۔ اے عربی صوبے بھرمیں اول رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کیا ۔ ۱۹۵۹ء میں ایم ۔ اے علوم اسلامیہ کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اول رہا ۔ ان تمام عنایات پر میں اپنے مالک کا حقیقی کا شکرگزار ہوں ۔

۱۹۴۸ء سے محکمۂ تعلیم میں ملازمت شروع کی ۔ ۱۹۵۸ء

میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم و تعلّم کے فرائض سر انجام دیے۔ ۱۹۶۲ء میں شعبۂ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کام کرتا رہا اور اب گورنمنٹ انٹر کالج بوچھال کلاں ضلع جہلم میں علمی فرائض سر انجام دے رہا ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر ایک بہت بڑا ذہنی و روحانی انقلاب محسوس کیا۔ ورنہ اسلام لانے سے پہلے میں ایک متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی ترقی کے دروازے بھی میرے لیے کھول دئے اور دوسری بات جو میں نے اپنی عملی زندگی میں محسوس کی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر ہے کہ مجھے آج تک کسی امر میں ناکامی کا سامنا نہیں ہوا اور آنحضرت ﷺ کی دعا ہی میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایا ہے اور إن شاء اللہ قیامت کے دن یہی دعا میری نجات کا باعث ہوگی۔ آمین ثم آمین۔

اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے بے شمار ایسے مخلص دوست عطا فرمائے جنھوں نے والدین کی جدائی کے صدمے کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزاء خیر دے۔ میں نے تبدیلی مذہب کے مفصل حالات تحریری صورت میں جمع کئے ہیں۔ جو إن شاء اللہ کسی موقع پر پیش کر سکوں گا۔

آخر میں قارئین حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی نیک اور پر خلوص دعاؤں میں ضرور شامل فرمایا

کریں ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام کی خدمت کرنے کا شرف عطا
فرمائے اور حسن خاتمہ کی سعادت سے سرفراز ۔

وَاللہُ وَلِیُّ التَّوْفِیقُ

غازی احمد
ستمبر ۱۹۶۷ء

مصنف ھدایہ کا مختصر تعارف

مؤلف ھدایة کا اسم گرامی شیخ الاسلام برھان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل الفرغانی المرغینانی ہے - آپ کا شجرۂ نسب سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے - آپ صوبہ فرغانہ کے شہر مرغینان کے رہنے والے تھے - آپ کی ولادت آٹھ رجب ۵۱۱ھ میں ہوئی -

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور چارلس ھملٹن کے ترجمہ کے دیباچے میں آپ کا سن ولادت ۵۳۵ھ م ۱۱۵۳ء درج ہے چودہ ذی الحجہ ۵۹۳ء کو آپ عالم فانی سے عالم باقی کو سدھارے اور سمرقند میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا

تحصیل علم کی خاطر آپ نے مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا ، اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا - ان میں سے چند ایک کے اسماء گرامی یہ ہیں - مفتی الثقلین نجم الدین ابو حفص عمر النسفی - الصدرالشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز - امام ضیاء الدین محمد بن الحسین ، امام قوام الدین احمد بن عبدالرشید البخاری ، ابو عمرو عثمان بن علی البیکندری -

ضیاءالدین ابو محمد سعید بن ابو اسد سے ترمذی شریف پڑھی اور ان سے سند حدیث حاصل کی - آپ نے حصول تعلیم کے حالات ایک رسالے میں تحریر کیے ہیں، لیکن آجکل یہ دستیاب نہیں

چارلس ہملٹن انگریزی ترجمے کے دیباچے میں رقمطراز ہیں :

"As a lawyer his reputation was beyond that of all his Contemporaries."

"He produced several works upon jurisprudence, which are all Considered as of unquestionable authority."
(FP. xxxi)

آپ کی تصانیف کثرت سے ہیں - جن میں سے مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں : کتاب مجموع النوازل ، کتاب التجنیس المزید ، کتاب فی الفرائض ، کتاب المنتقی ، مناسك الحج ، هداية المبتدی - الهدایه -

جو شہرت اور عظمت ہدایہ کو نصیب ہوئی وہ دوسری کتب کو حاصل نہ ہو سکی - یہ کتاب حنفی مسلک کے مطابق تحریر کی گئی ہے دوسرے ائمہ کے مسلک کا تذکرہ بھی موجود ہے اور ان کے دلائل بھی - صاحب ہدایہ نے دوسرے ائمہ کے دلائل کے کافی و شافی جواب دے کر اپنے مسلک کی تائید کی ہے - اس لحاظ سے یہ کتاب لاثانی حیثیت رکھتی ہے -

شیخ عماد الدین فرماتے ہیں :

کتاب الهدایه یهدی الهدی - إلیٰ حافظیه ویَجْلُوا العمیٰ

فلازِمْهُ واحْفَظْهُ یاذاالحِجیٰ - فمن ناله نال أقصی المنیٰ

ایک اور شعر ہدایہ کے متعلق بہت مشہور ہے -

إنَّ الْهَدَایَةَ کَالْقُرْاٰن قَدْنَسَخَتْ مَاصَنَّفَتْ قَبْلَهَا فی الشَّرْعِ مِنْ کُتُب

علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے - الحمد للہ میں ہر کتاب کے مخصوص طرز پر کچھ نہ کچھ لکھ

مکتا ہوں لیکن چار کتابیں اس سے مستثنی ہیں: قرآن کریم بخاری شریف ' مثنوی مولانا روم ، اور ھدایہ (نور الدرایہ) ۔

علامہ محمد ابراہیم کا ارشاد ہے ۔ ''ھدایہ کی ایک اہم اور قابل لحاظ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے قیاس کے صغری و کبری میں متعین طور پر کسی مقدمہ کے ساتھ نتیجہ کا خصوصی تعلق ہے ۔ اس کا پتا کرنا انتہائی مشکل اور اہل بصیرت اور مہارت کا کام ہے'' ۔ (نور الدرایہ)

مصنف نے فقہ میں ایک مختصر سا رسالہ بدایۃ المبتدی کے نام سے تصنیف کیا ۔ بعد میں اسی کتاب کی ایک مفصل شرح کفایۃ المنتہی کے نام سے تحریر کی جو اسّی (۸۰) جلدوں پر مشتمل ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے ۔ مصنفؒ خود ھدایہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔

''حِينَ اَكَادُ اَتَّكِأُ عَنْهُ اَتَّكَاءَ الْفَرَاغِ تَبَيَّنْتُ فِيهِ نُبْذًا مِنَ الْأَطْنَابِ وَخَشِيتُ اَنْ يُهْجَرَ لِأَجْلِهِ الْكِتَابَ فَصَرَفْتُ عِنَانَ الْعِنَايَةِ إِلَى شَرْحِ آخَرَ مَوْسُومٌ بِالْهِدَايَةِ ۔

ھدایہ بھی بدایۃ المبتدی کی شرح اور کفایۃ المنتہی کی تلخیص ہے ۔ اس کی ابتداء ۵۷۳ھ میں کی اور پورے تیرہ سالوں میں اس کی تکمیل کی ۔ مصنفؒ کے زہد و اخلاص کا یہ عالم تھا کہ تیرہ سال مسلسل روزے رکھتے رہے ، مگر گھر والوں تک کو بھی اس کا علم نہ ہو سکا ۔ خادم صبح کا

کھانا لے کر مسجد میں آتا تو آپ کھانا کسی مسکین کو دے دیتے اور خالی برتن گھر بھیج دیتے ۔

ایک مرتبہ جامع مسجد میں درس دے رہے تھے ۔ شاگردوں نے ایک عجیب کیفیت کا مشاہدہ کیا ، کہ استاد مکرم بار بار اٹھتے اور بیٹھتے ہیں ۔ عرض کیا : حضرت ! کیا بات ہے ؟

فرمایا : میں نے اسی شہر کے ایک استاد سے حصول علم کی ابتداء کی تھی ، جو اب فوت ہو چکے ہیں ۔ ان کا لڑکا باہر سڑک پر کھیل رہا ہے ۔ جب وہ مسجد کے دروازے کے سامنے سے گذرتا ہے تو میں احترام استاد کے پیش نظر کھڑا ہو جاتا ہوں ۔

ایک بار آپ کے صاحبزادوں نے عرض کیا : ابا جان ! آپ ہمیں سب سے آخر میں سبق پڑھاتے ہیں ۔ اس وقت طبیعت کما حقه درس کی طرف متوجہ نہیں رہتی لہذا ہمیں سب سے پہلے سبق پڑھا کر فارغ کر دیا کریں ۔ فرمایا : جو طلبہ دور دراز سے تحصیل علم کی خاطر آئے ہوئے ہیں ان کا حق تم سے کہیں فائق ہے ، لہذا میں تمہارے سبق کو مقدم نہیں کر سکتا ۔

سبحان اللہ ! عدل و انصاف کا یہ عالم ۔ ایسے زاہد اور متقی شخص کی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے وہ فضیلت و قبولیت عطا فرمائی کہ کسی دوسرے مسلک کی فقہی کتاب اس کے پائے تک نہ پہنچ سکی ۔

علماء فقہ میں صاحب ہدایہ کا درجہ :-

علامہ محی الدین ابی محمد عبدالقادرؒ ''الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ'' جلد دوم صفحہ ۵۵۸ پر فرماتے ہیں کہ ہمارے حنفی علماء کو سات طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

۱ ۔ مجتہد فی الشرع :۔ جو قواعد اصول کے استخراج پر قادر ہوں اور اِدلۂ اربعہ یعنی ، کتاب ، سنت ، اجماع ، اور قیاس سے فروعی احکام کے استنباط کی اہلیت رکھتے ہوں ۔ جیسے ائمۂ اربعہ ۔ مجتہد فی الشرع اصول وفروع میں کسی کے مقلد نہیں ہوتے ۔

۲ ۔ مجتہد فی المذہب ۔ جو امام کے مقرر کردہ اصولوں سے استخراج احکام پر قدرت تامّہ رکھتے ہوں ۔ جیسے امام محمدؒ ، امام ابو یوسفؒ وغیرہ ۔ یہ حضرات فروع میں اپنے امام سے مختلف رائے اپنا سکتے ہیں ۔ مگر اصول میں مخالفت نہیں کرتے ۔

۳ ۔ مجتہد فی المسائل :۔ جن مسائل میں امام سے کوئی روایت مذکور نہ ہو مگر وہ مقرر کردہ اصولوں کے پیش نظر اپنی بصیرت واجتہاد سے مسائل کے حل پر قادر ہوں ۔ لیکن یہ حضرات اصول وفروع میں اپنے امام کی مخالفت نہیں کر سکتے ۔ جیسے : خصّافؒ ۔ ابو جعفر طحاویؒ ۔ ابوالحسن الکرخیؒ سرخسیؒ ۔ حلوائی ۔ بزدوی وغیرہم ۔

۴ ۔ صاحب تخریج :۔ جن حضرات کو اجتہاد پر قدرت حاصل نہیں مگر اصول میں مہارت رکھنے کی بنا پر وہ مجمل مسائل کی تشریح اور محتمل مسائل کی توضیح کر سکتے ہیں ۔

جیسے : رازیؒ ، ہدایہ کے بعض مقامات پر ہیں کذافی تخریج الکرخی اور کذا فی تخریج الرازی کے الفاظ ملتے ہیں۔

٥ - صاحب ترجیح - جو حسن درایت کی بناء پر بعض روایات کو بعض پر ترجیح دے سکتے ہیں - جیسے صاحب قدوری اور صاحب ھدایہ -

(٦) مقلد :- جو قوی اور ضعیف روایات میں تمییز کرنے پر قادر ہوں - جیسے صاحب کنز الدقائق صاحب مختار - صاحب وقایہ وغیرھم -

(٧) مقلّد جو صحیح وغلط اور قوی وضعیف میں بھی امتیاز کی اہلیت سے محروم ہوتے ہیں -

علامہ عبدالحیؒ لکھنوی نے ''فوائد البھیة فی تراجم الحنفیة'' میں آخری چھہ طبقات کا تذکرہ کیا ہے -

(ماخذ :- ١ - دیباچہ ھدایہ مطبوعہ مصر -

٢ - انگریزی ترجمہ چارلس ہملٹن -

٣ - انسائیکلو پیڈیا آف اسلام- الجواھر المضیئة فی طبقات الحنفیة) -

غازی احمد

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

تمام تر ستائش اور خوبیوں کی سزاوار اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے جس نے علم کے نشانات اور اس کے جھنڈوں کو رفعت سے سرفراز فرمایا ۔ شریعۃ کے شعائر و احکام کو ظاہر کیا ۔ انبیاء و رسل صلوات اللہ علیہم اجمعین کو مبعوث فرمایا تاکہ راہ حق کی طرف (لوگوں کی) رہنمائی کریں اور علماء کو انبیاءِ کرام کی نیابت سے مشرف فرمایا ، جو دوسروں کو انبیاء کرام کے اخلاق عالیہ اور کردار سامیہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان مسائل و احکام میں جو انبیاء سے منقول نہیں ہیں راہ اجتہاد اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے رشد و ہدایت کے طالب ہوتے ہیں ۔ رشد و ہدایت اللہ تعالی ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔

اللہ تبارک و تعالی نے متقدّمین مجتہدین کو توفیق خصوصی سے نوازا اور انھوں نے ہر نوع کے جلی و دقیق مسائل کی تدوین کی ۔ مگر واقعات عالم اور حوادث روزگار پے بہ پے وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ جنھیں ایک موضوع میں سمونا آسان نہیں اور جنگلی جانوروں کی طرح نامانوس مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنھیں گھاٹ پر قابو کرکے شکار کرنا سہل نہیں ۔

مثالوں پر قیاس کرنا ، (احکام کا استنباط کرنا) اور

مستند و محکم ماخذ سے شناسائی حاصل کرنا مردان حق کا کام ہے ۔

بدایۃ المبتدی کے دیباچہ میں میں نے وعدہ کیا تھا ۔ کہ ان شاء اللہ میں اس کو شرح و بسط سے آراستہ کروں گا ۔ جس کا نام کفایۃ المنتہی ہوگا ۔ تو میں نے (اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہوئے) اس کام کو شروع کر دیا اور وعدہ میں کچھ نہ کچھ گنجائش ہوتی ہے ۔ جب میں اس کام کے اختتام تک پہنچا ، تو میں نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ طوالت آ گئی ہے ، اس لیے مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ طوالت اصل کتاب ہی سے اعراض کا سبب نہ بن جائے اس لیے میں نے عزم و ارادہ کی باگ دوسری شرح کی طرف موڑی ۔ جس کا نام ھدایہ ہے ۔ جس میں عمدہ روایات اور مستند دلائل عقلیہ جمع کر رہا ہوں اور ہر باب میں غیر ضروری دلائل اور زوائد کو ترک کر رہا ہوں ۔ تا کہ طول بیانی سے احتراز کیا جا سکے ، لیکن بایں ہمہ یہ کتاب ایسے اصول اور قوانین پر مشتمل ہوگی جن سے جزئیات اور فروعات متفرّع ہو سکیں ۔

میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کرتا ہوں کہ مجھے اس کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے اختتام کے بعد مجھے حسن خاتمہ سے فیض یاب فرمائے ۔

اگر کسی کو ہمت عالیہ سے وافر حصہ عطا ہو اور وہ مزید واقفیت کا طالب ہو تو وہ شرح اکبر (کفایۃ المنتہی)

کی طرف راغب ہو اگر کسی کو فراغت دستیاب نہ ہو اور فقدان وقت کا سامنا ہو تو وہ شرح اصغر (ھدایہ) پر اکتفاء کرے - پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا -

فن فقہ سارے کا سارا باعث خیرو برکت ہے - بعض دوستوں نے اس مجموعہ ثانیہ کو املاء کرنے کی فرمائش کی- میں اپنے کلام کی تحریر میں اللہ تعالی سے مدد و اعانت طلب کرتے ہوئے اس کا افتتاح کرتا ہوں اور مقصد کی سہولت و آسانی کے لیے عاجزانہ التجاء کرتا ہوں کیونکہ مشکل کشائی اسی کی ذات سے مخصوص ہے- ہر چیز اسی کے تصرّف و قدرت میں ہے اور التجاؤں کو شرف قبولیت بخشنا اسی کے شایان شان ہے - ہمیں اللہ تعالی کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین کارساز ہے -

---

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الطهارات

طہارتوں کا بیان

مسئلہ :

وضو کے فرائض : اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد گرامی ہے ۔ ''اے ایمان والو ! جب نماز کے لیے اٹھنے لگو (یعنی جب نماز ادا کرنے کا ارادہ کرو) تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو ۔ اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو ۔ اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (دھو لیا کرو) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق (وضو میں) مذکورہ تین اعضاء کا دھونا اور سر کا مسح کرنا فرض ہے ۔ غسل پانی بہانے کو اور مسح پانی لگانے کو کہتے ہیں ۔

مسئلہ :

چہرے کی حد (لمبائی میں) سر کے بالوں کی حد سے ٹھوڑی کے نیچے تک ۔ اور (چوڑائی میں) ایک کان کی لو سے

دوسرے کان کی لو تک ہے کیونکہ مواجہۃ اس پورے مجموعہ سے ہوتی ہے۔ اور لفظ وجہ اسی مواجہۃ سے مشتق ہے۔

احناف کی رائے میں دونوں کہنیاں اور دونوں ٹخنے دھونے میں شامل ہوں گے۔ امام زفرؒ کو اس میں اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غایۃ مغیا کے حکم میں داخل نہیں۔ جیسا کہ روزے میں رات (شامل نہیں ہوتی) (امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی چیز کی غایۃ و انتہاء بیان کی جاتی ہے تو یہ غایت اس حکم سے خارج ہوتی ہے۔ مثلاً ''اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ'' میں صوم مغیا ہے اور لیل غایۃ ہے۔ لہذا مذکورہ قانون کے مطابق غایۃ (رات) مغیا (یعنی روزے) میں داخل نہیں ہے۔ اسی طرح مذکورہ مسئلے میں کہنیاں اور ٹخنے غایۃ ہیں۔ لہذا وہ دھونے کے حکم میں داخل نہیں ہوں گے)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ غایۃ تو کہنیوں اور ٹخنوں کے اوپر کے حصوں (یعنی بازو اور پنڈلیوں) کو غسل کے حکم سے ساقط کرنے کے لیے ہے کیونکہ اگر یہ غایۃ ذکر نہ کی جاتی تو (دھونے کا) یہ حکم پورے اعضاء کو شامل ہوتا (اور ہاتھ بغلوں تک اور پاؤں گھٹنوں تک دھونے پڑتے)۔

روزے کی مثال میں غایۃ حکم کو رات تک پہنچانے کے لیے ہے (کہ اپنے روزے کو رات تک مکمل کرو)

کیونکہ لُغوی طور پر لفظ صَوْم کا اطلاق تو گھڑی بھر کے امساک پر بھی ہوسکتا ہے۔ (مگر غاية بیان کر دینے سے امساک رات تک ضروری ہوگا۔ لہذا اس مسئلے کا صوم والی مثال پر قیاس کرنا درست نہ رہا۔

کعب (ٹخنہ) اور وہ آبھری ہوئی ہڈی ہے اور یہی صحیح رائے ہے۔ کاعب کا لفظ اسی کعب سے مشتق ہے (جس کے معنی ہیں ابھری ہوئی چھاتی والی لڑکی دیکھیے کاعب میں بھی کعب کی طرح ابھار کا معنی موجود ہے)۔

مسئلہ :

امام قدوری[ؒ] فرماتے ہیں کہ سر کے مسح میں فرض، پیشانی کی مقدار ہے اور وہ سر کا چوتھائی حصہ ہے۔ اس کی دلیل مغیرہ بن شعبہ[ؓ] کی روایت کردہ حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبیلے کی کوڑی پر تشریف لئے۔ آپ نے پیشاب کیا اور وضو فرمایا۔ سر پر بقدر پیشانی اور دونوں موزوں پر مسح کیا۔

قرآن کریم میں (مسح کے متعلق) حکم مجمل تھا۔ یہ حدیث اس کا بیان ہے۔ اور یہ (حدیث) امام شافعی[ؒ] کے خلاف بھی حجت ہے۔ جو تین بالوں کی مقدار کا مسح فرض قرار دیتے ہیں اور امام مالک[ؒ] پر بھی۔ جن کے نزدیک پورے سر کا مسح ضروری ہے۔

بعض روایات میں بعض احناف نے سر کا مسح ہاتھ کی تین انگلیوں کی مقدار فرض ٹھہرایا ہے کیونکہ یہ تین

انگلیاں آلۂ مسح یعنی ہاتھ کا اکثر حصہ ہیں۔

مسئلہ :

وضو کی سنتیں : ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب وضو کرنے والا نیند سے بیدار ہو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُن کو دھولے ۔ اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو وہ اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈالے ۔ جب تک کہ اسے تین بار دھو نہ لے کیونکہ معلوم نہیں کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں رہا'' ۔

دوسری (عقلی) دلیل یہ ہے کہ ہاتھ چونکہ طہارت کا آلہ ہے ۔ لہذا اسی سے صفائی کا آغاز کرنا مسنون ہے اور ہاتھوں کو کلائیوں تک دھونا طہارت اور نظافت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

مسئلہ :

وضو کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا (دوسری) سنت ہے اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے ''جو شخص وضو (کی ابتداء) میں اللہ تعالیٰ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا'' ۔ اس حدیث سے وضو کی (صحت کی نفی مراد نہیں بلکہ) تکمیل فضیلت کی نفی مراد ہے (کہ اگر وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے تو وضو تو درست ہوگا مگر اس کی فضیلت اور کمال میں کمی واقع ہو

جائے گی۔ صحیح رائے کے مطابق یہ (تسمیہ) مستحب ہے۔ اگرچہ امام قدوریؒ نے اسے سنت لکھا ہے۔

مسئلہ :

استنجا سے پہلے بھی اللہ کا نام لے اور (اس سے فارغ ہونے) کے بعد بھی اور یہی صحیح ہے۔

مسئلہ :

مسواک کرنا (وضو کی تیسری سنت ہے) کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پابندی سے کیا کرتے تھے۔ اگر مسواک نہ ہو تو دانتوں کو انگلی سے صاف کرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا ہے۔

مسئلہ :

کُلّی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا (وضو کی چوتھی اور پانچویں سنت ہے) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں باقاعدگی سے کیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ تین بار کلی کرے اور ہر دفعہ نیا پانی استعمال کرے۔ پھر اسی طرح ناک میں پانی ڈالے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو میں اسی طرح روایت کیا گیا ہے۔

مسئلہ :

دونوں کانوں کا مسح کرنا (چھٹی سنت ہے) اور سر

کے بچے ہوئے پانی سے (ن کا مسح) کرے امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے (وہ فرماتے ہیں کہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی استعمال کرے) ہماری دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''کان سر کا حصہ ہیں''۔ اس حدیث سے مراد حکم کا بیان ہے ۔ پیدائش (کا بیان) نہیں (یعنی اس حدیث میں کانوں کے مسح کا حکم بتایا گیا ہے ۔ کہ وہ وضو میں سر ہی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لہذا نئے پانی کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ سر کا بقیہ ہی کافی ہوگا ۔ اس حدیث سے کانوں کی خلقت کا بیان مراد نہیں ہے کیونکہ وظیفۂ نبوّت کا ان امور سے کیا تعلق) ؟

مسئلہ :

ڈاڑھی کا خلال کرنا (ساتویں سنت ہے) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل علیہ السلام نے اسی طرح کہا تھا ۔

بعض روایات میں وارد ہے کہ خلال لحیہ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں سنت ہے اور طرفین یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے میں جائز ہے کیونکہ سنت وہ ہے جو فرض کو اس کے محل میں مکمل کرے اور ڈاڑھی کا داخلی حصہ محل فرض نہیں ہے (کہ خلال سے اس کی تکمیل ہو اور اس کی سنیت ثابت ہو ۔ لہذا مذکورہ دلیل سے خلال کا سنت ہونا ثابت نہ ہؤا ۔ خلال کے متعلق متن والی روایت ہی صحیح ہے کہ خلال سنت ہے) ۔

مسئلہ :

اور انگلیوں کا خلال کرنا (آٹھویں سنت ہے) اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔ (وضو کرتے ہوئے) اپنی انگلیوں کا خلال کیا کرو۔ تاکہ کہیں جہنم کی آگ ان میں داخل نہ ہو" (سنت ہونے کی) دوسری دلیل یہ ہے کہ خلال سے فرض کی اس کے محل میں تکمیل ہوتی ہے۔ (یعنی وضو میں ہاتھوں اور پاؤں کا دھونا فرض ہے اور خلال سے فرض کی تکمیل ہوتی ہے کہ کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ اس لیے خلال سنت ہوگا۔ کیونکہ جو چیز فرض کی تکمیل میں مد و معاون ہو وہ سنت کا درجہ رکھتی ہے)۔

مسئلہ :

اور (اعضاء کا) تین تین بار دھونا (وضو کی نویں سنت ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک دفعہ اعضاء کو دھو کر فرمایا کہ یہ ایسا وضو ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتا اور آپ نے دو دو مرتبہ اعضاء کو دھو کر فرمایا کہ ایسے وضو پر اللہ تعالیٰ دہرا اور دگنا اجر عطا فرماتا ہے۔

اور آپ نے وضو کرتے ہوئے تین تین مرتبہ اعضاء کو دھو کر فرمایا کہ یہ میرا اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے وضو کا طریقہ ہے اور جس شخص نے اس دستور میں اضافہ کیا یا اس میں کمی کی تو اس نے ظلم و تعدی سے

کام لیا ۔ (ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ تین بار سے زیادہ دھونے میں تو پانی کا اسراف ہے اور وعید درست ہے ۔ مگر کمی کی صورت میں وعید کا کیا مقام ہوگا ؟ کیونکہ کمی کی صورت میں صرف ترک سنت کا ارتکاب ہوتا ہے اور ترک سنت پر اس قسم کی وعید نہیں آتی ۔ صاحب ھدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو اسے (یعنی تین بار دھونے کو) سنت نبوی نہ سمجھے ۔

مسئلہ :

مستحبات وضو ۔ وضو کرنے والے کے لیے طہارت کی نیت کرنا مستحب ہے ۔ لہذا علماء احناف کی رائے میں وضو میں نیت کرنا سنت ہے ۔ (صاحب ہدایہ پر اعتراض کیا گیا کہ صاحب متن نے نیت کو مستحب قرار دیا ہے ۔ مگر صاحب شرح اسے سنت کہہ رہے ہیں ۔ اس کے جواب میں صاحب عنایہ نے فرمایا ہے کہ متن والا مسئلہ امام قدوریؒ کے نظریہ کے مطابق ہے اور شرح والا صاحب ہدایہ کی رائے کے مطابق یا مستحب سے مراد عام ہے جو کہ سنت کو بھی شامل ہے'') ۔

امام شافعیؒ کی رائے میں وضو میں نیت فرض کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وضو ایک عبادت ہے لہذا وہ تیمم کی طرح نیت کے بغیر درست نہ ہوگا ۔

احناف امام شافعیؒ کے جواب میں کہتے ہیں ۔ ہمیں

بھی تسلیم ہے کہ وضو نیت کے بغیر عبادت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن مفتاح صلاۃ بن سکتا ہے ۔ (یعنی ایسے وضو سے نماز ادا ہوسکتی ہے) کیونکہ اس کا حصول پاک پانی کو کام میں لانے سے ہوا ۔ بخلاف تیمم کے (کہ اس کا حصول مٹی سے ہوتا ہے) اور مٹی خود پاک کرنے والی چیز نہیں ہے ۔ جب تک کہ نماز ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو ۔ (یعنی مٹی خود پاک کرنے والی چیز نہیں ۔ مجبوری کے تحت اسے پاک کرنے والا قرار دیا گیا ہے ۔ مگر پانی بہر صورت پاک کرتا ہے ۔ لہذا وضو کو تیمم پر قیاس کرنا درست نہیں) ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ لفظ تیمم سے لغوی طور پر قصد و ارادہ کا پتا چل رہا ہے ۔ (اس لیے اس میں نیت شرط قرار دی گئی ۔ مگر وضو کی یہ کیفیت نہیں ہے) ۔

مسئلہ :

اور پورے سر کا مسح کرے ، یہی سنت ہے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دوسرے دھوئے جانے والے اعضاء کی طرح تین دفعہ نیا پانی لے کر (سر کا تین بار) مسح کرنا مسنون ہے ۔

ہماری دلیل حضرت انسؓ کا عمل ہے ۔ انھوں نے تین تین بار (اعضاء دھو کر) وضو کیا اور سر کا مسح فقط ایک بار کیا اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو ایسا ہی تھا اور جو روایت تین بار مسح کرنے کی ہے ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی پانی سے تین بار سر پر ہاتھ پھیرا جائے اور وہ امام ابو حنیفہؒ کی روایت کے مطابق جائز ہے۔

احناف کی دوسری دلیل یہ ہے کہ فرض تو (سر کا) مسح ہے اور بار بار مسح کرنے سے وہ غسل بن جائے گا (مسح نہیں رہے گا) اس لیے مسنون نہ ہوگا۔

لہٰذا یہ موزے کے مسح کی طرح ہوگا (یعنی جس طرح موزے پر صرف ایک بار مسح مسنون ہے اسی طرح سر پر بھی ایک بار ہی مسنون ہوگا) بخلاف دھونے کے، کیونکہ دھونے میں تکرار باعث ضرر نہیں ہوتا۔ (یعنی بار بار مسح کرنے سے مسح غسل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس میں تکرار باعث خلل ہے۔ مگر دھونے میں تکرار مضر نہیں بلکہ اس سے غسل کی حقیقت اور زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔

مسئلہ :

(وضو کا تیسرا اور چوتھا مستحب یہ ہے کہ) وضو اللہ تعالیٰ کی ارشاد کردہ ترتیب کے مطابق کرے نیز (اعضاءِ وضو دھونے میں) داہنی طرف سے ابتدا کرے۔

احناف کے نزدیک وضو میں ترتیب سنت ہے۔ (لفظ سنت سے مراد عام ہے جو مستحب کو بھی شامل ہے) اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ ''فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ'' الآیۃ اس

آیت میں ''فا'' تعقیب کے لیے ہے (جو ترتیب کی واضح علامت ہے) ۔ (امام شافعیؒ کے استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ منہ کا سب سے پہلے دھونا توفاء سے ثابت ہوگیا ۔ اب باقی اعضاء میں بھی آپ کو فرضیت ترتیب کا اسی طرح قائل ہونا پڑے گا ۔ ورنہ اجماع مرکب کی مخالفت لازم آئے گی ۔ اجماع کی دو قسمیں ہیں ۔

۱ ۔ **اجماع بسیط** : اور وہ ہے کسی مسئلے کے حکم اور علت پر دو ائمہ کا باہم متفق ہونا ۔ مثلاً خروج الشيء من السبیلین سے وضو کا جاتے رہنا سب کے نزدیک مسلم ہے ۔ اس مثال میں علت خروج الشيء من السبیلین ہے اور حکم انتفاءِ طہارت ہے ۔

۲ ۔ **اجماع مرکب** : اجماع مرکب کی تفصیل یہ ہے ۔ کہ کسی مسئلے میں حکم پر دو ائمہ متفق ہوں اور علت میں اختلاف ہو ۔ مگر کسی تیسری صورت یا شق کے قائل نہ ہوں ۔ اسے علم اصول کی اصطلاح میں عدم القائل بالفصل کہا جاتا ہے ۔ مثلاً کسی شخص کو منہ بھر کر قے آئی اور اس نے شرمگاہ کو بھی ہاتھ لگایا ۔ تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ دونوں حضرات وضو ٹوٹنے کے حکم پر اتفاق رکھتے ہیں ۔ مگر احناف کے نزدیک انتفاءِ طہارت کی علت قے ہے اور شوافع کے نزدیک مس ذکر ، لیکن دونوں ائمة کا ساتھ ہی اس بات پر اتفاق ہے کہ اس مسئلے میں کوئی تیسری صورت یا شق ممکن نہیں ۔

اب مذکورہ اصول کے مدنظر امام شافعیؒ فرماتے ہیں

کہ منہ کا پہلے دھونا نصّ سے ثابت ہے ۔ اگر باقی اعضاء میں ترتیب کو فرض تسلیم نہ کریں ۔ تو آپ بعض اعضاء میں فرضیت کے قائل ہوئے اور بعض میں سنیت کے ، حالانکہ کوئی تیسری صورت ممکن نہ تھی ۔ یہ اجماع مرکب کی مخالفت ہے ۔ جسے اصول فقہ کی زبان میں قول بالفعل کہا جاتا ہے ۔ یہ اصولاً جائز نہیں ۔

احناف نے امام شافعیؒ کے استدلال کا بڑا شافی اور مکمل جواب دیا ہے کہ آیت مذکورہ میں فاغسلوا وجوھکم کے بعد حرف واؤ بھی موجود ہے ۔ جو تمام أئمّۂ لغہ کے نزدیک مطلق جمع کے لیے ہوتی ہے اور اس میں ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی ۔

آیت زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز ادا کرنے کا ارادہ کرکے اٹھو تو یہ تمام اعضاء دھو لیا کرو ۔ ترتیب کا کہیں ذکر نہیں اور فاء تعقیبیہ کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام اعضاء کا دھونا ارادۂ نماز اور قیام کے بعد ہوگا ۔

مسئلہ :

(اعضاء وضو میں) داہنی طرف سے (دھونے کی) ابتدا کرنا باعث فضیلت ہے ۔ اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالی ہر چیز میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند فرماتا ہے ۔ حتی کہ جوتا پہننے اور کنگھی کرنے میں بھی ۔

فَصْلٌ فِیْ نَوَاقِضِ الْوُضُوْءِ

وضو توڑنے والے اُمور کا بیان

مسئلہ :

من جملہ ان امور کے جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے (ایک تو) پیشاب یا پاخانہ کی راہ سے نکلنے والی ہر چیز ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے۔ اَوْجَاءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِنَ الغَآئِطِ ۔ الآیۃ (یا تم میں سے کوئی شخص حاجت قضاء سے فارغ ہو کر آئے) ۔

اس کی دوسری دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ حدث (یعنی بے وضو ہونا) کیا ہوتا ہے ۔ تو فرمایا جو کچھ بھی پیشاب پاخانہ کی راہ سے نکلے ۔

کلمۂ ''ما'' عام ہے جو معتاد اور غیر معتاد دونوں قسم کی چیزوں کو شامل ہے ۔

مسئلہ :

خون اور وہ پیپ (جس میں لہو شامل ہو) جب بدن سے نکل کر ایسے حصۂ بدن تک تجاوز کر جائیں جس کو پاک کرنے کا حکم ہے یا منہ بھر قے آجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو چیز سبیلین کے علاوہ بدن سے خارج ہو وہ ناقض وضو نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کے بعد وضو نہیں فرمایا۔

امام شافعیؒ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ ناپاک جگہ کے علاوہ دوسرے اعضاء کا دھونا تعبدی حکم ہے۔ لہذا اس کو شرع کی بیان کردہ حد تک ہی محدود رکھا جائے گا اور وہ نجاست خارج ہونے کی معتاد جگہ ہی ہے۔ (امام شافعیؒ ایک اصول کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ جو باتیں عقلی طور پر قیاس میں آسکیں ان پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر جو چیز قیاس کے مطابق نہ ہو اس پر دوسری چیز کو قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ پہلی چیز کا حکم دوسری پر بھی جاری ہو جائے۔

اب زیر بحث مسئلہ کو لیجئے۔ قیاس تو یہ تھا کہ سبیلین سے اگر کوئی چیز خارج ہو تو فقط اسی جگہ کو دھویا جائے یا سارے بدن کو مگر فقط چار اندام کا وضو کر

لینا کافی سمجھا گیا ، کیونکہ شرع نے اسی طرح حکم دیا ہے۔ تو وضو میں فقط چار اندام پر اکتفاء کر لینا شرعی حکم ہے قیاسی نہیں ۔ لہذا سبیلین پر غیر سبیلین کو قیاس کرتے ہوئے خون اور پیپ وغیرہ سے وضو ٹوٹنے کا حکم نہیں دیا جائے گا ۔ احناف امام شافعیؒ کے استدلال کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ ہمارے مسلک کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ہر بہ پڑنے والے خون کی وجہ سے وضو جاتا رہتا ہے ۔ نیز آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو (نماز کے دوران) قے آجائے یا اس کی نکسیر پھوٹ پڑے تو وہ وہاں سے ہٹ کر وضو کرے اور اگر اس نے کسی سے بات چیت نہ کی ہو تو وہ اپنی سابقہ (نماز) پر بنا کرے ۔

امام شافعیؒ کی عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ نجاست کا خروج زوال طہارت میں مؤثر ہوتا ہے اور اتنی بات اصل میں معقول (یعنی قیاس کے مطابق) ہے ۔ ہاں البتہ چار اعضاء پر اکتفاء کرنا غیر معقول (یعنی غیر قیاسی) ہے لیکن پہلے جزء کے متعدی ہونے کی وجہ سے دوسرے جزء سے بھی تعدیہ ماننا پڑے گا ۔ [اس کی تفصیل یوں ہے امام شافعیؒ نے فرمایا : چونکہ مقیس علیہ قیاسی نہیں ہے جو عقل میں آسکے لہذا اس پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا ۔ احناف جواب میں کہتے ہیں کہ زیر بحث مسئلے کے دو جزء ہیں ۔ جزء اول ''سبیلین سے کسی چیز کا نکلنا اور وضو کا زائل ہو جانا'' یہ جزء عقل و قیاس کے مطابق ہے لہذا اس پر قیاس کرنا بھی درست ہوگا

کہ غیر ''سبیلین سے کسی چیز کا نکلنا اور وضوکا زائل ہو جانا'' مسئلے کا دوسرا جزء کہ ''فقط چار اندام کے وضو پر اکتفاء کرنا'' یہ جزء قیاس کے مطابق نہیں لیکن جب جزء اول میں (انتفاءِ طہارت کا حکم) متعدی ہو گیا (یعنی مقیس علیہ سے مقیس تک) تو دوسرے جزء میں ضرورت کے تحت متعدّی تسلیم کرنا پڑے گا ۔ لہٰذا سبیلین والا حکم غیر سبیلین پر بھی جاری ہوگا] ۔

(سوال : آپ سبیلین میں سیلان یعنی بہ پڑنا شرط قرار نہیں دیتے لیکن غیر سبیلین میں بہنے کی شرط عائد کرتے ہیں ۔ اس کا جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں) ۔ ہاں البتہ غیر سبیلین میں خروج اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ خارج ہونے والی چیز اس حصے تک بہ کر آ جائے جس کو پاک کرنے کا حکم ہے یا قے منہ بھر ہو کیوں کہ زخم کا چھلکا ہٹ جانے سے نجاست اپنے محل ہی میں ہوتی ہے۔ اس صورت میں اسے خارج نہیں کہا جا سکتا بلکہ بادی (یعنی ظاہر ہونے والی) کہا جاتا ہے - [یعنی صرف چھلکے کے زوال سے نجاست ظاہر ہو جاتی ہے مگر اپنے محل میں موجود رہتی ہے اور جب تک بہ نہ پڑے اسے خارج نہیں کہا جا سکتا اس لیے سیلان کی شرط لگائی گئی ۔ اس کی اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً ایسا انڈا جو خراب ہو چکا ہواور اس کا اندرونی مواد گندے خون میں تبدیل ہو چکا ہو اگر وہ جسم کو لگ جائے تو نماز نہیں ہوگی ۔ لیکن اگر گندا انڈا صحیح و سالم جیب میں پڑا رہے تو نماز

درست ہوگی کیوں کہ پہلی صورت میں نجاست اپنے محل سے تجاوز کر چکی تھی اور دوسری صورت میں اپنے محل تک ہی محدود تھی] -

سبیلین کی صورت اس سے الگ ہے (وہاں نجاست کا ظہور ہی کافی ہے) کیوں کہ سبیلین محل نجاست نہیں (بلکہ محل نجاست تو معدہ ہے جہاں سے وہ منتقل ہو کر سبیلین تک جا پہنچتی ہے) اس لیے محض ظہور اس امر کا مظہر ہوگا کہ نجاست ہی منتقل ہو کر آئی ہے اور یہی اپنے محل سے خروج ہوتا ہے (لہٰذا سبیلین میں فقط ظہور ہی انتفاء طہارت کا باعث ہوگا) -

مسئلہ :

منہ بھر قے کا آنا اس طرح ہوگا کہ قے کرنے والا کسی تکلف کے بغیر اسے منہ میں روک نہ سکے کیوں کہ اتنی مقدار میں قے منہ سے خارج ہو کر رہتی ہے - اس لیے اسے منہ سے خارج ہی شمار کیا جائے گا -

امام زفرؒ کا ان مسائل میں اختلاف ہے - وہ فرماتے ہیں کہ قے قلیل ہو یا کثیر ناقض وضو ہوگی - اسی طرح معتاد مخرج پر قیاس کرتے ہوئے غیر سبیلین میں نجاست کا سیلان شرط نہیں ہے - (بلکہ نجاست کا ظہور ہی انتفائے طہارت کا سبب ہوگا) -

امام زفرؒ اپنی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قے حدث یعنی

بے وضو ہونے کا سبب ہے ۔ آپؐ کا ارشاد مطلق ہے جس میں قلیل یا کثیر کی کوئی قید نہیں ۔

ہمارے مسلک کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''خون کے ایک قطرے یا دو قطروں سے وضو زائل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بہ نہ پڑے ۔''

ہماری دوسری دلیل حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جب آپ نے ناقض وضو امور بتائے تو منہ بھر قے کو بھی ان میں شمار فرمایا ۔

(جب احناف ، شوافع اور امام زفرؒ ہر ایک نے اپنے مسئلے کی تائید میں احادیث پیش کی ہیں تو کونسی حدیث پر عمل کیا جائے ۔ صاحب ھدایہ جواب میں فرماتے ہیں کہ) احادیث میں کوئی خاص تعارض نہیں ۔ آسانی سے تطبیق دی جا سکتی ہے ۔ امام شافعیؒ کی ذکر کردہ روایت میں قے سے قلیل قے مراد ہے اور امام زفرؒ کی پیش کردہ حدیث میں قے سے مراد کثیر قے ہے ۔ لہٰذا اب کوئی تعارض نہ رہا) ۔

امام زفرؒ کا مخرج معتاد پر غیر سبیلین کا قیاس کرنا بھی درست نہیں ۔ اس پر ہم بحث کر چکے ہیں ۔ اگر کسی شخص نے بار بار تھوڑی قے کی جو یک جا کرنے سے منہ بھر کی مقدار ہو جائے تو امام ابو یوسفؒ کی رائے میں مجلس کے ایک ہونے کا اعتبار ہے ۔ (اگر ایک ہی بیٹھک میں ایسا ہو تو وضو زائل ہو جائے گا اگر مختلف مجالس میں ایسا ہو تو وضو برقرار رہے گا) ۔

امام محمدؒ کی رائے میں اتحاد سبب کا اعتبار ہے ۔ سبب

دل کا متلانا ہے اگر بار بار قے آنے کا سبب ایک ہی متلی ہے تو وضو زائل ہوگا۔ ورنہ باقی رہے گا)۔

امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے جو شے حدث نہیں ہوتی وہ نجس بھی نہیں ہوتی اور یہی صحیح بھی ہے کیوں کہ یہ چیز شریعت کے حکم کے مطابق نجس نہیں ہوتی اسی لیے اس سے طہارت ہوی زائل نہیں ہوتی [مثلاً جو خون اپنے محل میں ظاہر ہو اور سائل نہ ہو تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا ۔ اسی طرح اگر وہ کسی کپڑے سے لگ جائے تو اس کپڑے میں نماز جائز ہوگی]۔

مسئلہ :

قے کے مذکورہ احکام اس صورت میں ہیں جب قے صفراء کی شکل میں ہو یا کھانے کی یا پانی کی ۔ لیکن اگر قے صرف بلغم پر مشتمل ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے میں ناقض وضو نہ ہوگی ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر قے منہ بھر ہو تو ناقض وضو ہے ۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب بلغم معدہ سے خارج ہو ۔ اگر بلغم سر کی جانب سے خارج ہو تو بالاتفاق ناقض وضو نہ ہوگی کیوں کہ سر محل نجاست نہیں (محل نجاست تو معدہ ہے) امام ابو یوسفؒ اختلافی مسئلہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ معدہ سے نکلنے والی بلغم نجاست سے متصل ہونے کی بنا پر نجاست ہی قرار دی جاتی ہے (اور وہ ناقض وضو ہوتی ہے)۔

طرفینؒ فرماتے ہیں کہ بلغم میں حد درجہ کی چکناہٹ ہوتی ہے اس میں نجاست سرایت نہیں کر سکتی اگر قلیل سی نجاست اس کے ساتھ لگ بھی جائے تو مؤثر نہیں ہوتی کیوں کہ قلیل قے ناقض وضو نہیں ہوتی ۔ اگر جمے ہوئے خون کی قے کرے تو اس میں ''منہ بھر'' کا اعتبار ہوگا (اور ''منہ بھر'' ناقض وضو ہے) کیونکہ وہ سوداء سوختہ ہے (جو خون بستہ کی صورت میں خارج ہوا ہے) ۔

مسئلہ :

اگر قے مائع خون کی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک دوسرے اقسام قے کی طرح ''منہ بھر'' کا اعتبار ہوگا ۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ اگر خون خود بخود بہ نکلے تو ناقض وضو ہوگا اگرچہ مقدار میں تھوڑا ہی ہو کیوں کہ معدہ محل خون نہیں پس معلوم ہوا کہ یہ خون پیٹ کے کسی زخم سے رس رہا ہے ۔ لہٰذا تھوڑا ہونے کی صورت میں ناقض وضو ہوگا) ۔

اگر خون سر کی طرف سے نکلا اور ناک کی نرم جگہ تک پہنچ گیا تو متفقہ طور پر وضو جاتا رہے گا کیوں کہ وہ خون جسم کے ایسے حصے تک پہنچ گیا ہے جس کو دھونا طہارت کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔

مسئلہ :

لیٹ کر سونا یا تکیہ لگا کر یا کسی ایسی چیز کے

ساتھ سہارا لے کر اس طرح سونا کہ اگر اس چیز کو ہٹا لیا جائے تو سونے والا گر پڑے بھی ناقض وضو ہے کیوں کہ لیٹ کر سونے سے جسم کے جوڑ اور بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور عادۃً (ریح وغیرہ) کسی چیز کے نکلنے کا احتمال پایا جاتا ہے (اور احتیاط اسی صورت میں ہے کہ) جو بات عادت کی بنا پر ثابت ہو اسے یقینی تصور کیا جائے۔

تکیہ لگا کر سونے کی صورت میں بھی جائے پاخانہ کے زمین سے اٹھ جانے کی بنا پر بیداری جیسی رکاوٹ اور پختگی زائل ہو جاتی ہے۔ بلکہ تکیہ لگا کر سونے کی صورت میں تو اندام کا ڈھیلا پن انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ سونے والے کو صرف تکیہ ہی تھامے ہوتا ہے ورنہ وہ گر پڑے۔ ہاں اگر نمازی قیام یا قعود یا رکوع یا سجدے کے دوران سوجائے تو وضو برقرار رہتا ہے کیوں کہ اس میں کچھ نہ کچھ استمساک اور روک تو باقی ہے۔ اگر یہ روک بھی نہ ہوتی تو نمازی یقیناً گر پڑتا۔ لہٰذا ان صورتوں میں ڈھیلا پن کامل صورت میں نہ پایا گیا۔

مذکورہ صورتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اصل و دلیل کی حیثیت رکھتا ہے کہ ”جو شخص حالت قیام، قعود، رکوع یا سجدہ میں سو جائے اس کا وضو برقرار رہتا ہے۔ لیکن جو شخص لیٹ کر سو جائے اس پر وضو ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ لیٹ کر سونے سے اندام ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔

مسئلہ :

بیہوشی کی وجہ سے مغلوب العقل ہو جانا اور دیوانگی بھی ناقض وضو ہیں کیوں کہ مدہوشی اور دیوانگی اعضاء کے ڈھیلا کرنے میں لیٹ کر سونے سے بھی بڑھ کر ہیں ۔

مدہوشی تمام حالتوں میں ناقض وضو ہے اور نیند کی صورت میں بھی قیاس یہی تھا (کہ یہ بھی تمام حالتوں میں ناقض وضو ہوتی) لیکن سونے کی حالتوں کی بعض استثنائی صورتیں چونکہ روایات سے معلوم ہوئی ہیں ۔ للہذا قیاس کو اس میں دخل نہیں ہے اور مدہوشی چونکہ تأثیر میں نیند سے بڑھ کر ہے اس لیے اسے نیند پر قیاس نہیں کیا جائے گا ۔

مسئلہ :

رکوع و سجود والی نماز میں کھلکھلا کر ہنسنا بھی ناقض وضو ہے ۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ قہقہہ سے وضو زائل نہ ہو ۔ یہی امام شافعیؒ کی رائے ہے کیونکہ قہقہہ سے کوئی نجاست تو خارج نہیں ہوتی ۔ اسی بنا پر یہ قہقہہ نماز جنازہ ، سجدۂ تلاوۃ اور نماز سے فارغ اوقات میں زوال طہارت کا سبب نہیں ہوتا ۔ (اسی طرح نماز میں بھی نہیں ہونا چاہیے تھا مگر شرعی حکم کی موجودگی میں قیاس کو وقعت نہیں دی جاتی) ہماری دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ”تم میں سے کوئی شخص (نماز کے دوران) کھلکھلا کر ہنس پڑے تو وہ وضو اور نماز دونوں کی تجدید کرے“۔ ایسی روایت کے مقابلے میں قیاس

متروک ہو جاتا ہے ۔ حدیث میں چونکہ مطلق اور کامل نماز کے متعلق ذکر ہے لہذا اسی پر اکتفاء کیا جائے (نماز جنازہ سجدۂ تلاوۃ اور بچے کی نماز وغیرہ اس حکم کے تحت داخل نہیں ہوگی) ۔

قہقہہ کی تعریف یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو بھی اور آس پاس والوں کو بھی سنائی دے ۔ ضحک وہ ہنسی ہے جو صرف اپنے آپ کو سنائی دے ساتھ والوں کو پتا نہ چلے (تبسم ہنسی کی وہ قسم ہے جس میں فقط دانت ظاہر ہوں اور آواز پیدا نہ ہو ۔

بعض روایات کے مطابق کہا جاتا ہے کہ ضحک مفسد صلٰوۃ ہے ۔ مفسد وضو نہیں ہے ۔

مسئلہ :

وہ کیڑا جو پاخانے کی راہ سے نکلے ناقض وضو ہے ۔ لیکن اگر کیڑا زخم کے منہ سے نکلے یا زخم سے گوشت کا ٹکڑا (گل سڑ کر) گر پڑے تو وضو زائل نہیں ہوگا ۔

متن میں لفظ دابہ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کیڑا ہے ۔ مسئلہ کی دلیل یہ ہے کہ کیڑے پر لگی ہوئی نجاست بہت تھوڑی ہوتی ہے اور قلیل نجاست سبیلین میں تو حدث کا سبب ہوتی ہے غیر سبیلین میں نہیں ۔ (لہذا سبیلین کی صورت میں وضو جاتا رہے گا مگر ان کے علاوہ نہیں) پس ان کی مثال ڈکار کی اور اس ریح کی ہے (جو پاخانہ کی جگہ سے نکلے) (کہ ڈکار سے وضو نہیں جاتا کیونکہ وہ محل نجاست سے پیدا نہیں ہوتا اور ریح سے زائل ہو جاتا ہے کہ محل نجاست

سے گزر کر آتی ہے) ۔

مسئلہ :

جو ریح عورت کی پیشاب گہ یا مرد کے ذکر سے خارج ہو ، وہ مفسد وضو نہیں ہوتی کیونکہ محل نجاست سے اس کا گزر نہیں ہوتا ۔ ہاں البتہ عورت اگر مُفضات ہو (جس کی پیشاب گہ اور جائے پاخانہ کسی وجہ سے آپس میں مل گئے ہوں) تو خروج ریح کی صورت میں اُس کے لیے وضو کر لینا ہی مستحب ہوگا کیونکہ اس صورت میں دبر سے خروج ریح کا احتمال بھی موجود ہے ۔ (لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ وہ قبل سے خروج ریح کی صورت میں بھی وضو کر لے) ۔

مسئلہ :

آبلے کو چھیل دینے سے اگر پانی یا پیپ وغیرہ نکل کر زخم کے منہ سے بہ پڑے تو وضو ٹوٹ جائے گا اور نہ بہنے کی صورت میں نہیں ٹوٹے گا ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں صورتوں (سیلان اور عدم سیلان) میں وضو جاتا رہتا ہے ۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق دونوں صورتوں میں باقی رہتا ہے ۔ یہ خارج من غیر السبیلین کا مسئلہ ہے جس کا مفصل ذکر پہلے آچکا ہے ۔ یہ مذکورہ اشیاء (یعنی آبلے کا پانی ۔ پیپ وغیرہ) نجس ہیں کیونکہ ناپاک خون پک کر گھنا ہو جاتا ہے اور پیپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر بہنے لگتا ہے ۔

مسئلہ :

وضو زائل ہونے کے مذکورہ مسئلے کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ آبلے کو چھیلے اور پیپ وغیرہ خود بخود بہ نکلے ۔ لیکن اگر آبلے کو ہاتھ سے دبائے اور دباؤ کی بنا پر پیپ بہ نکلے تو وضو نہیں ٹوٹے گا کیونکہ پیپ خود بخود نہیں نکلی بلکہ (دباؤ سے) نکالی گئی ہے ۔ اللہ تعالیٰ حقیقت حال سے واقف ہے ۔

فَصْلٌ فی الْغُسْلِ

غُسل کا بیان

مسئلہ :

غُسل کے فرائض : غُسل مفروض ہے تین فرض ہیں ۔ (۱) کُلّی (غرغرہ) کرنا (۲) ناک میں پانی ڈالنا (۳) اور تمام بدن کا دھونا ۔ امام شافعیؒ کی رائے میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا دونوں سنت کا درجہ رکھتے ہیں ۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دس امور فطرتُ یعنی سنت میں سے ہیں (۱) مونچھوں کا کٹوانا (۲) داڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی داخل کرنا (۵) ناخن ترشوانا (۶) انگلیوں کے جوڑ وغیرہ صاف کرنا (۷) بغل کے بال صاف کرنا (۸) زیر ناف بال صاف کرنا (۹) استنجاء کرنا (۱۰) ان امور پر مداومت کرنا آپ نے مضمضہ اور استنشاق کو بھی ان دس امور میں شامل فرمایا اسی لیے یہ وضو میں بھی سنت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ۔ ''وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا'' یعنی اگر تم جنابت کی حالت میں

ہو تو خوب خوب طہارت کیا کرو ۔ اللہ تعالیٰ نے تطہیر کا حکم فرمایا ہے اور یہ سارے بدن کو خوب پاک کرنا ہے ۔ البتہ جس حصے تک پانی پہنچانا دشوار ہو وہ اس حکم سے خارج ہے ۔ (جیسے پانی کا آنکھ کے پپوٹوں تلے پہنچانا ممکن نہیں ، بخلاف وضو کے کہ اس میں وجہ یعنی چہرے کا دھونا واجب ہے ناک منہ کے اندرونی حصے مواجہہ سے خارج ہیں ۔

امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت میں سنت بحالت حدیث مراد ہے ۔ (حالت جنابت مراد نہیں) اس کی تاکید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ۔ یہ دونوں (یعنی مضمضہ و استنشاق غسل) جنابت میں فرض ہیں مگر وضو میں سنت ہیں ۔

مسئلہ :

غسل کی سنتیں : غسل میں سنت یہ ہے کہ جب غسل کرنے والا غسل شروع کرے تو سب سے پہلے اپنے دنوں ہاتھ صاف کرے ۔ پھر اپنی شرمگاہ کو دھوئے اگر بدن پر نجاست ہو تو صاف کرے ۔ پھر پاؤں دھونے کے سوا نماز کی طرح وضو کرے پھر سر اور سارے بدن پر تین بار پانی ڈالے (ہر بار بدن کو اچھی طرح ملے) پھر اس جگہ سے ایک طرف ہٹ کر اپنے پاؤں دھو لے ۔ حضرت میمونہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کو اسی طرح بیان فرمایا تھا ۔

پاؤں دھونا مؤخر کیا گیا کیونکہ نہانے کے دوران پاؤں استعمال شدہ گندے پانی میں ہوتے ہیں اس لیے دھونا بے فائدہ ثابت ہوتا ہے (جب کسی ٹب میں نہا رہا ہو) ہاں اگر لکڑی کے کسی تختے پر (یا کسی ایسی جگہ پر ہو جہاں سے استعمال شدہ پانی بہہ جاتا ہو) تو پاؤں کا دھونا مؤخر کرنے کی ضرورت نہیں۔ (بلکہ وضو کرتے وقت ساتھ ہی پاؤں بھی دھو لے) ہاں اتنا خیال ضرور رہے کہ بدن پر اگر کوئی ناپاک شے لگی ہو تو سب سے پہلے اسے دھوئے ورنہ پانی ڈالنے سے نجاست سارے بدن پر پھیل جائے گی۔

مسئلہ :

اگر بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے تو عورت کو گندھے ہوئے بالوں کا کھولنا ضروری نہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم سلمہ سے فرمایا کہ اگر پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے تو آپ کو کافی ہوگا۔ (کھولنے کی ضرورت نہیں ہوگی) صحیح روایت کے مطابق گندھے ہوئے بالوں یعنی گیسوؤں کو تر کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس میں عورت کو تکلیف ہوتی ہے کہ (ہر بار نہانے کے وقت مینڈھیاں کھولتی رہے)۔ بخلاف داڑھی کے بالوں کے کہ ان میں پانی پہنچانے میں کوئی خاص مشقت نہیں ہوتی (اگر داڑھی بہت گھنی ہو تو خلال پر اکتفاء کیا جا سکتا ہے)۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل امور میں غسل واجب ہو جاتا ہے :

اول مرد یا عورت کے بدن سے بیداری یا نیند کی حالت میں شہوت کی بنا پر اچھل کر منی خارج ہو -

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ منی کا خروج جس طور سے بھی ہو غسل واجب ہوگا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ'' یعنی منی سے غسل ضروری ہو جاتا ہے -

ہماری دلیل یہ ہے کہ (وَ اِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا میں) تطہیر کا حکم جنابت کو بھی شامل ہے اور لغۃ میں جنابت کہتے ہیں ''شہوت کی بنا پر منی کا نکلنا'' کہا جاتا ہے اُجْنِبَ الرَّجُلُ جب مرد عورت کے ساتھ شہوت پوری کر لے -

امام شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث میں مِنَ الْمَاءِ سے مراد وہ منی ہے جو شہوت کی وجہ سے خارج ہو - امام محمدؒ اور امام اعظمؒ کی رائے میں جب منی شہوت کی بنا پر اپنے محل سے خارج ہو تو غسل واجب ہو جاتا ہے - امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مستقر سے علیحدگی اور خروج دونوں حالتوں میں شہوت کا اعتبار ہوگا کیونکہ وہ منی کے خروج کو مستقر سے جدا ہونے پر قیاس کرتے ہیں - اس لیے

کہ غسل کا واجب ہونا ان دونوں حالتوں (یعنی انفصال اور خروج) سے تعلق رکھتا ہے۔ (یعنی ابو یوسفؒ کی رائے میں منی جب اپنے مستقر سے جدا ہو اور بدن سے نکلے تو دونوں صورتوں میں شہوت کا وجود شرط ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انفصال منی کے وقت شہوت تمہارے نزدیک بھی شرط ہے خروج کو اس انفصال پر قیاس کرتے ہوئے بھی شہوت کو شرط قرار دیں گے کیونکہ غسل کا حکم ان کے نزدیک بھی خروج ہی پر مرتب ہوتا ہے۔ فقط انفصال کافی نہیں)۔

طرفینؒ فرماتے ہیں کہ جب ایک لحاظ سے غسل واجب ہو جاتا ہے تو احتیاط اس میں ہے کہ دوسرے لحاظ سے بھی واجب قرار دیا جائے۔ (یعنی قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ ابو یوسفؒ کے نظریے کے مطابق خروج منی میں بھی شہوت کی شرط رکھی جائے مگر عبادات کو مد نظر رکھتے ہوئے احتیاط اس میں ہے کہ بلا خروج شہوت کی صورت میں نہانا لازم قرار دیا جائے کیونکہ نہانے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ لیکن اگر بغیر نہائے جنابت موجود رہے تو نمازیں اور دوسری جسمانی عبادات ضائع ہو جائیں گی۔ اس مسئلے کی تین صورتیں ہیں۔ انفصال اور خروج دونوں شہوت سے ہوں تو متفقہ طور پر غسل واجب ہوگا۔

(۲) اگر دونوں حالتوں میں شہوت موجود نہ ہو تو بالاتفاق غسل واجب نہیں۔

(۳) انفصال شہوت سے ہو مگر خروج اس طرح نہ

ہو - یہی صورت مختلف فیہ ہے -
مذکورہ مسئلے میں طرفینؒ کا مسلک احتیاط کے زیادہ قریب ہے - اسی پر عمل مناسب ہے) -

مسئلہ دوم :

عورت اور مرد کی شرمگاہوں کا باہم ملنا ، خواہ انزال نہ بھی ہو - اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''جب مرد و عورت کی شرمگاہیں آپس میں مل جائیں اور حشفہ (مرد کے عضو کا اگلا حصہ عورت کی) شرمگاہ میں داخل ہو جائے - تو غسل لازم ہوگا خواہ انزال ہو یا نہ ہو -'' دوسری دلیل یہ ہے کہ عضو تناسل کا داخل ہونا ہی انزال کا سبب ہوتا ہے اور عضو چونکہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات قلّتِ منی کی وجہ سے خود مرد کو یا عورت کو انزال کا پتا بھی نہیں چلتا - اس لیے التقائے ختانین کو ہی انزال کا قائم مقام قرار دیا گیا -

اور دُبر میں بھی دخول کا یہی حکم ہے (کہ دونوں پر غسل واجب ہوگا انزال ہو یا نہ ہو) کیونکہ سبب غسل بکمالہ موجود ہے - مفعول پر احتیاط کے طور پر غسل واجب ہوگا (ورنہ مفعول کے انزال کا احتمال نہیں ہوتا) -

ہاں اگر (العیاذ باللہ) کوئی چارپائے سے اس قبیح فعل کا مرتکب ہو یا شرمگاہ کے علاوہ کسی دوسرے حصۂ بدن سے مباشرت کرے تو انزال کے بغیر غسل واجب نہیں

ہوگا کیونکہ سبب ناقص ہے۔

مسئلہ سوم :

وجوب غسل کا تیسرا سبب حیض (کا اختتام) ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَتّٰی یَطَّھَّرْنَ تشدید کے ساتھ۔

مسئلہ چہارم :

نفاس کا ختم ہونا بھی اجماعی طور پر وجوب غسل کا سبب ہے۔

مسئلہ :

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ، عیدین، عرفہ اور احرام کے لیے غسل کو مسنون قرار دیا ہے۔ صاحب کتاب یعنی امام قدوریؒ نے تو اس کے سنت ہونے کی تصریح کی ہے۔ مگر بعض روایات کے مطابق یہ غسلِ استحباب کا درجہ رکھتے ہیں۔ امام محمد نے مبسوط میں غسل جمعہ کو حسن کہا ہے۔

امام مالکؒ وجوب کے قائل ہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے آئے وہ نہا کر آئے۔''

ہماری دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''جس نے جمعہ کے دن وضو کیا اس نے بہت

اچھا کیا ۔ لیکن جس نے غسل کر لیا اس کی فضیلت کے کیا کہنے ۔" اس حدیث کی بنا پر امام مالکؒ کی پیش کردہ حدیث کو بھی استحباب پر محمول کیا جائے گا ۔ یا اس حدیث کو منسوخ قرار دیا جائے گا ۔ (ابتداء اسلام میں صحابہؓ کرام چونکہ غریب تھے ۔ ان کے پاس ایک ہی پھٹا پرانا لباس ہوتا تھا ۔ سارا دن چلچلاتی دھوپ میں محنت و مشقت کرنے کی وجہ سے لباس اور جسم بدبودار ہو جاتے ۔ اس لیے آغاز اسلام میں غسل جمعہ واجب تھا ۔ تاکہ مسجد میں گندے لباس اور جسم کی وجہ سے نمازیوں کو اذیت نہ ہو ۔ مگر جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا اور صحابہ کرام کو لباس اور کام کاج کے سلسلے میں سہولت میسر آ گئی تو اسلام نے وجوب غسل کو استحباب میں تبدیل کر دیا) ۔

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ جمعہ کے روز غسل نماز جمعہ کے لیے ہوتا ہے ۔ یہی رائے صحیح ہے کیونکہ نماز جمعہ کو وقت جمعہ پر فضیلت حاصل ہوتی ہے ۔ نیز طہارت کا خصوصی تعلق بھی نماز ہی سے ہوتا ہے ۔ امام حسنؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے (وہ فرماتے ہیں کہ یہ غسل یوم جمعہ کے لیے ہوتا ہے) عیدین بمنزلۂ جمعہ ہیں کیونکہ ان میں بھی لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور جسمانی بدبو اور میل کچیل دور کرنے کے لیے غسل مستحب ہو گا ۔

عرفہ اور احرام کے غسل کا حکم ان شاء اللہ کتاب المناسک میں بیان کیا جائے گا ۔

مسئلہ :

امام قدوری فرماتے ہیں : مذی اور ودی نکلنے کی صورت میں غسل واجب نہیں ہوتا ۔ البتہ وضو ضروری ہوگا ۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر ''مرد'' کو مذی آتی ہے اور مذی کے آنے پر وضو زائل ہو جائے گا ۔

ودی دراصل گاڑھا پیشاب ہوتا ہے ۔ جو رقیق پیشاب کے بعد خارج ہوتا ہے ۔ اس لیے اسے پیشاب پر ہی قیاس کیا جائے گا (جس طرح پیشاب سے وضو ختم ہو جاتا ہے اسی طرح مذی اور ودی سے بھی وضو زائل ہو جائے گا لیکن غسل واجب نہ ہوگا) ۔ منی سفید رنگ کی اور گاڑھی ہوتی ہے ۔ جس کے خروج کے بعد عضو تناسل میں ڈھیلا پن آ جاتا ہے ۔ مذی سفیدی مائل رقیق مادہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی سے ملاعبت اور دل لگی کرنے پر نکلتی ہے ۔ یہ مذکورہ تشریح ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے ۔

بَابُ الْمَاءِ الَّذِی یَجُوزُبِهِ الْوُضُوءُ وَمَا لَایَجُوزُبِهِ

وہ پانی جس سے وضو جائز ہے اور جس سے جائز نہیں

مسئلہ :

بارش ، وادیوں ، چشموں ، کنوؤں اور سمندروں کے پانی سے ہر قسم کے حدث سے پاکیزگی حاصل کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُورًا) نیز ہم نے آسمان سے پاک (کرنے والا) پانی اتارا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "پانی (اپنے اصل کے لحاظ سے) پاک ہوتا ہے۔ اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی جب تک کہ اس کا رنگ ذائقہ یا بو متغیر نہ ہو جائے"۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے بارے میں فرمایا کہ "اس کا پانی پاک ہوتا ہے اور اس کا مُردہ جانور حلال ہے"۔ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ پانی کا مطلق اسم ان مذکورہ بالا تمام قسم کے پانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ :

جو پانی درخت یا پھل سے نچوڑ کر نکالا جائے اس سے وضو جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ مطلق پانی نہیں۔ (بلکہ مَاءُ الشَّجَرِ یا مَاءُ الثَّمَرِ کہلاتا ہے) اور مطلق پانی میسر نہ ہونے کی صورت میں تیمم کرنے کا حکم ہے۔ (مذکورہ مسئلے پر اعتراض کیا گیا کہ ماء الشجر اور ماء الثمر اگرچہ مطلق پانی کے فرد نہیں۔ مگر ازالۂ نجاست میں مطلق پانی کی طرح کام دیتے ہیں تو ان سے وضو کیوں ناجائز ہوگا۔ صاحب ہدایہ جواب میں فرماتے ہیں) ان اعضاء کا حکم تَعَبُّدِی ہے اس لیے غیر منصوص کی طرف (یہ حکم) متعدی نہیں ہوگا (یعنی خروج ریح وغیرہ کی وجہ سے وضو کا زائل ہو جانا اور تجدید وضو میں صرف چار اندام پر اکتفاء کر لینا قیاسی حکم نہیں بلکہ شرعی اور تعبدی حکم ہے لہٰذا اس سے متعلق امور پر دوسری اشیاء کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وضو کے لیے شرع نے مطلق پانی مقرر کیا ہے اس لیے مطلق پانی کے علاوہ (جو منصوص ہے) دوسرے کسی پانی کو مطلق پانی پر قیاس کرتے ہوئے جواز وضو کا فتوی نہیں دیا جائے گا)۔

مسئلہ :

جو پانی خود بخود انگوروں سے ٹپک پڑے (اور کسی برتن میں جمع کر لیا جائے تو) اس سے وضو جائز ہوگا۔

کیونکہ "یہ ایسا پانی ہے جو کسی مصنوعی طریقہ کے بغیر ہی نکل آیا ہے۔ اس مسئلے کو امام ابو یوسف نے اپنی کتاب جوامع میں ذکر فرمایا ہے اور قدوری میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ امام قدوری نے اعتصار (بزور نچوڑنے) کی شرط لگائی ہے۔ (اس لیے خود بخود ٹپکنے والا پانی اس حکم میں شامل نہیں ہوگا)۔

مسئلہ :

جس پانی میں کوئی اور (پاک) چیز مل کر غالب آ جائے اور اس (پانی) کی طبعی کیفیت بدل دے جیسے شربت، سرکہ، عرق گلاب، عرق باقلا، شوربہ اور عرق زردج تو اس سے بھی وضو جائز نہیں، کیونکہ ان کو مطلق پانی سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ عرق باقلا سے مراد یہ ہے کہ باقلا پانی میں پکائے جائیں اور پانی متغیر ہوجائے۔ اگر پکائے بغیر پانی میں تبدیلی آ جائے تو اس سے وضو جائز ہوگا۔ (یعنی اگر پانی میں باقلا کے دانے ڈال دیے جائیں اور آگ پر نہ پکائے جائیں بلکہ یونہی پانی میں تبدیلی آ جائے، تو ایسے پانی سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں)۔

مسئلہ :

اس پانی سے بھی وضو کرنا جائز ہے جس میں کوئی پاک چیز مل جائے اور کسی ایک وصف (رنگ بو یا ذائقہ) کو بدل دے جیسے سیلاب کا پانی (جو مٹی کے اختلاط

کی وجہ سے گدلا ہو جاتا ہے) یا وہ پانی جس میں زعفران یا صابون یا اشنان (گھاس) کی آمیزش ہو جائے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام قدوریؒ نے مختصر القدوری میں آب زردج کو شوربے کے ذیل میں شمار کیا ہے ، حالانکہ امام ابو یوسفؒ نے آب زردج کو آب زعفران وغیرہ کے حکم میں شامل کیا ہے اور یہی صحیح ہے ۔ امام ناطفیؒ اور علامہ سرخسیؒ کا بھی یہی موقف ہے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آب زعفران اور اس قسم کی دوسری اشیاء کے پانی سے جو زمین کی جنس نہیں ہیں وضو جائز نہیں کیونکہ اسے مطلق پانی نہیں کہا جاتا ، بلکہ یہ تو مقید پانی ہیں ۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ اسے ماءالزعفران کہا جاتا ہے ۔ (ماء کے ساتھ زعفران کی قید ہے) بخلاف ارضی اجزاء کے کہ ان سے تو کوئی پانی بھی عادۃً خالی نہیں ہو سکتا (اس لیے سیلاب وغیرہ کا پانی ماءالزعفران کی صف میں شامل نہیں ہوگا) ۔

احناف امام شافعیؒ کے جواب میں کہتے ہیں کہ (آب زعفران وغیرہ کی صورت میں) پانی کا اطلاق باقی ہے ۔ اس لیے اس کا کوئی الگ نام تجویز نہیں کیا جاتا (لہٰذا آب زعفران مطلق پانی کے حکم میں داخل ہوگا) رہی زعفران کی طرف اضافت تو یہ ایسی ہی ہے جیسے پانی کی اضافت کنوئیں یا چشمے وغیرہ کی طرف ہو (جس طرح مَاءُالْبِئْر وماءِ العَیْن میں اضافت پانی کے اطلاق میں کوئی نقص پیدا

نہیں کرتی اسی طرح ماءالزعفران میں اضافت سے کوئی حرج نہیں) ۔ نیز تھوڑے بہت اجزاء کی آمیزش کا اعتبار نہیں کیا جاتا (یعنی اگر پانی میں قلیل سا زعفران پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں) کیونکہ پانی کا تھوڑی بہت آمیزش سے الگ رہنا اسی طرح ممکن نہیں جس طرح کہ ارضی اجزاء کی آمیزش سے الگ رہنا ممکن نہیں ، اس لیے غلبہ کا اعتبار کیا جائے گا اور غلبہ بھی اجزاء کے لحاظ سے قابل اعتبار ہوگا ۔ صرف رنگ بدل جانے سے غلبہ متحقق نہیں ہوتا یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

اگر پانی میں کسی چیز کی آمیزش ہو جائے اور پکانے سے وہ متغیر ہو جائے تو ایسے پانی کے ساتھ وضو جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ پکا ہوا پانی آسمان سے نازل شدہ کیفیت پر نہیں رہا ۔ البتہ اگر پانی میں کوئی ایسی چیز ڈال کر آبالا جائے جس سے نظافت اور صفائی میں مبالغہ مقصود ہو ، مثلاً اشنان (یا سوڈا) وغیرہ ڈال کر آبالا جائے ، (تو ایسے پانی سے خواہ اس کا کوئی وصف ہی بدل جائے وضو جائز ہوگا کیونکہ یہ صفائی کے حصول میں زیادہ ممد ہوتا ہے) اس لیے کہ بیری کے پتے ڈال کر جوش دیے ہوئے پانی سے مردے کو غسل دینا سنت سے ثابت ہے ۔ ہاں اگر آمیزش کی ہوئی چیز مقدار میں پانی پر غالب آ جائے تو وضو جائز نہ ہوگا ۔ بلکہ یہ پانی میں مخلوط ستو کی طرح ہوگا جس کا نام بھی

بدل جاتا ہے۔ (اور پانی کی بجائے ستّو کہا جاتا ہے)۔

مسئلہ :

جس پانی میں نجاست شامل ہو جائے خواہ مقدار میں تھوڑی ہو یا بہت اس سے وضو جائز نہ ہوگا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب تک پانی کا کوئی وصف تبدیل نہ ہو وضو اس سے جائز ہوگا۔ ان کی دلیل مذکور حدیث ہے :
اَلْمَاءُ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ ۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر پانی دو قلوں (یعنی مشکوں) کی مقدار ہو تو اس سے وضو جائز ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''جب پانی کی مقدار دو مٹکے ہو تو وہ نجاست کا حامل نہیں ہوتا''۔

احناف امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا مسلک بھی سنة نبویة ہی سے ثابت ہے۔ ہماری دلیل وہ ارشاد نبوی ہے جو نیند سے بیدار ہونے والے کے متعلق ہے (إِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِه فَلَا يَغْمِسَنَّ يَدَهُ فِی الْإِنَاءِ حَتّٰی يَغْسِلَهُ ثَلَاثًا (الحدیث)۔

ہماری دوسری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ''تم میں سے کوئی شخص ساکن پانی میں پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں غسل جنابت ہی کرے''

آپ کا یہ ارشاد مطلق ہے جس میں قلہ وغیرہ کی تفصیل کا کوئی ذکر نہیں۔

اب اپنے مذکورہ دلائل کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

امام مالکؒ کی پیش کردہ حدیث بئر بضاعۃ کے متعلق ہے (اور یہ مدینہ منورہ میں ایک کنواں تھا، جس کا پانی باغوں میں لگتا تھا۔ (جاری پانی تو ہمارے نزدیک بھی پاک ہی رہتا ہے۔ اختلاف تو ساکن پانی کے متعلق ہے۔ جس کے بارے میں آپ نے کوئی دلیل نہیں دی) رہا امام شافعیؒ کا استدلال تو انہوں نے جو حدیث اپنے موقف کی تائید میں پیش کی ہے اسے ابو داؤد نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی امام شافعیؒ کا مقصد حل نہیں ہوتا کیونکہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ پانی جب دو قلے ہو تو وہ) احتمال نجاست کے مقابلے میں ضعیف ہوتا ہے (یعنی اس میں جاری پانی کی طرح طاقت نہیں ہوتی کہ نجاست کو برداشت کر لے، بلکہ اتنی مقدار میں پانی وقوع نجاست سے ناپاک ہو جاتا ہے)۔

نوٹ: علماء فقہ نے صاحب ہدایہ کے اس جواب پر جو امام شافعیؒ کو دیا گیا ہے تنقید کی ہے کہ جواب کے دونوں جزء درست نہیں کیونکہ ابو داؤد نے مذکورہ روایت کو کہیں بھی ضعیف قرار نہیں دیا۔ لہذا صاحب ہدایہ کا حوالہ صحیح نہیں۔

صاحب ہدایہ نے حدیث کے جو معنی بیان کیے ہیں کہ پانی کی مقدار جب دو قُلّے ہو تو نجاست برداشت نہیں

کر سکتا یہ بھی درست نہیں کیونکہ دوسری روایت میں
"اِذَا بَلَغَ الْمَاءُ قُلَّتَیْنِ لَا یَنْجُسُ" کے الفاظ مذکور ہیں۔ اس لیے
مذکورہ تأویل اس حدیث میں نہیں چل سکتی۔

امام شافعیؒ کے استدلال کا صحیح جواب یہ ہے کہ
آپ کی پیش کردہ روایت مضطرب الاسناد اور مضطرب المعنی
ہے بلکہ مضطرب المتن بھی ہے۔ اس کی سند میں ایک
راوی محمد بن اسحاق ہے جو محدثین کے نزدیک کذاب شمار
ہوتا ہے اور دوسرے راوی مغیرہ بن سقلاب بھی منکر الحدیث
ہیں۔ نیز علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرفوع
نہیں بلکہ ابن عمر پر موقوف ہے۔

مضطرب المعنی اس طرح ہے کہ لفظِ قُلّہ کئی معنی
میں مشترک ہے۔ مثلاً انسان کا قد۔ مشک۔ پہاڑ کی چوٹی۔
ہجر شہر کے مٹکے۔ پھر ہجر کے مٹکے بھی مختلف حجم اور
جسامت کے ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کہ روایت میں قُلّہ سے
مراد کون سے حجم کا مٹکا ہے۔ لہذا حدیث متن کے لحاظ
سے بھی واضح نہیں کہ اسے قابلِ تمسک قرار دیا جائے۔

مضطرب المتن اس طرح ہے کہ بعض روایات میں
قُلَّتَیْنِ ہے اور بعض میں ثلاثۃ قِلَالٍ ہے۔ بلکہ بعض روایات
میں تو اربعین قُلَّةً کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اب بتائیے کہ
کونسی روایات پر عمل کیا جائے۔ مذکورہ بالا تشریح سے
امام شافعیؒ کے استدلال کا شافی جواب مل گیا اور حدیث
کے معانی میں بھی کسی تأویل کی ضرورت نہ رہی۔

(بئر بضاعة والی روایت کی تفصیل یہ ہے کہ صحابہؓ کرام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا : یا رسول اللہ ، لوگ بُضاعة کے کنوئیں میں کئی قسم کی گندگی پھینک دیتے ہیں ۔ کیا اس کے پانی سے ہم وضو کر سکتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا کہ پانی پاک ہوتا ہے اور اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی ۔ یہ ارشاد ایک خاص واقعہ کے متعلق تھا ۔ کیونکہ اس کنوئیں سے پانی دن رات باغات کو دیا جاتا تھا اس لیے یہ جاری پانی کی طرح تھا جو چھوٹی موٹی نجاست سے نجس نہیں ہوتا ۔

مسئلہ :

جاری پانی میں جب نجاست پڑ جائے تو اس سے وضو جائز ہے بشرطیکہ اس میں نجاست کا کوئی اثر دکھائی نہ دے کیوں کہ پانی کے بہاؤ کی وجہ سے نجاست ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتی ۔ اثر سے مراد ذائقہ یا بو یا رنگ ہے ۔ جاری پانی وہ ہوتا ہے کہ اس کا استعمال دوبارہ نہ ہو سکے (یعنی جس پانی سے ایک دفعہ لیا جائے دوسری دفعہ لینے تک وہ بہ کر آگے جا چکا ہو) بعض علماء نے جاری پانی کی یہ تعریف کی ہے کہ جو تنکے کو بہا کر لے جائے ۔

مسئلہ :

اس بڑے تالاب یا حوض میں جس کے ایک طرف کے پانی کو حرکت دینے سے دوسری طرف کے پانی میں تحریک پیدا نہ ہو اگر ایک طرف نجاست واقع ہو جائے تو دوسری

جانب سے وضو جائز ہوگا۔ کیوں کہ بظاہر ایک جانب کی نجاست دوسری طرف نہیں پہنچتی اور تحریک کا اثر نجاست کے اثر سے جلد سرایت کرتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ غسل کی حرکت قابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ (کہ ایک طرف غسل کرنے سے دوسری جانب حرکت پیدا نہ ہو) امام ابو یوسفؒ سے بھی یہی منقول ہے مگر ان کے دوسرے قول کے مطابق ہاتھ سے حرکت دینا کافی ہوگا (یعنی اگر ایک طرف کے پانی کو ہاتھ سے ہلایا جائے تو دوسری جانب تحریک نہ ہو)۔ امام محمدؒ وضو کی حرکت کا اعتبار کرتے ہیں۔ پہلے قول (یعنی امام ابو حنیفہؒ کے ارشاد) کی وجہ یہ ہے کہ ایسے تالابوں میں وضو کی نسبت غسل کی زیادہ ضرورت درپیش ہوتی ہے (وضو تو لوگ عموماً گھروں ہی میں کر لیتے ہیں)۔

بعض علماء نے اس کی مساحت کپڑا ناپنے کے گز سے کی ہے کہ تالاب طول و عرض میں دس ضرب دس گز ہو (یعنی اس کا رقبہ $10 \times 10 = 100$ مربع گز ہو۔ مربع گز ہونا شرط نہیں۔ بلکہ رقبہ اوسطاً 100 مربع گز ہو) عوام کی آسانی اور سہولت کے پیش نظر اسی پر فتوی دیا جاتا ہے۔ حوض کی گہرائی اس قدر ہو کہ اگر اس سے چُلّو بھرا جائے تو نیچے کی سطح ظاہر نہ ہو یہی صحیح ہے۔ صاحب قدوریؒ کا یہ کہنا کہ ''جَازَ الْوُضُوءُ مِنَ الْجَانِبِ الْآخَر'' اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ نجاست گرنے کی جگہ ناپاک ہو جاتی ہے (لہذا اس جگہ وضو کرنا مناسب نہیں)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جب تک نجاست اثرات ظاہر نہ ہوں وہ جگہ بھی ناپاک نہیں ہوتی جیسا کہ جاری پانی میں ہوتا ہے۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جس جانور میں بہنے والا خون نہ ہو اس کے پانی میں مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ جیسے مچھر، مکھی، بھڑ اور بچھو وغیرہ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں ناپاک ہو جاتا ہے کیوں کہ جو حُرمت کرامت کی بنا پر نہ ہو وہ نجاست کی علامت ہوتی ہے۔ (آدمی کی حرمت بوجہ کرامت ہے) ہاں شہد کی مکھیاں اور پھلوں کے کیڑے اس حکم سے مستثنی ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر چارہ نہیں۔

احناف کی پہلی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ ''ایسے پانی کو کھانے، پینے اور وضو کرنے میں استعمال کرنا جائز اور حلال ہے''۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ پانی کو ناپاک کرنے والا وہ بہنے والا خون ہے جو موت کی وجہ سے پانی کے ساتھ مل جاتا ہے حتی کہ ذبح کیا ہوا جانور اسی خون کے نکل جانے کی بنا پر حلال ہو جاتا ہے۔ نیز یہ ضروری نہیں کہ جو چیز حرام ہو وہ نجس بھی ہو، جیسا کہ مٹی (کہ اس کا کھانا حرام ہے مگر ناپاک نہیں ہوتی)۔

مسئلہ :

جو جانور پانی میں زندگی گزارتے ہیں ان کے مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا جیسے مچھلی ، مینڈک اور کیکڑا وغیرہ ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مچھلی کے علاوہ دوسرے جانوروں کی موت سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ التحریم لا بطریق الکرامة آیة للنجَاسَة) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جو چیز اپنے اصلی مقام میں مرے اس پر نجاست کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ۔ جیسا کہ انڈا جس کی زردی خون میں تبدیل ہو چکی ہو ۔ (ایسا انڈا اگر جیب میں ہو اور نماز ادا کر لی جائے تو نماز جائز ہے کیونکہ نجاست اپنے محل ہی میں موجود ہے) ۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ نجاست کا حقیقی سبب تو خون ہے مگر مذکورہ قسم کے جانوروں میں خون نہیں ہوتا کیونکہ خون والے جانور پانی میں زندگی نہیں گزار سکتے ۔

مسئلہ :

پانی کے علاوہ اگر کسی دوسری چیز (مثلاً شربت ، دودھ یا سرکہ وغیرہ) میں یہ جانور مر جائیں تو بعض فقہاء کے قول کے مطابق مچھلی کے سوا دوسرے جانوروں کی موت (پانی کو) ناپاک کر دے گی کیونکہ وہ اصلی مقام اور معدن سے خارج ہیں ۔

دوسرے فقہاء کرام کا ارشاد ہے کہ پانی ناپاک نہ ہوگا کیونکہ یہ جانور خون سے عاری ہوتے ہیں اور یہی قول صحت کے زیادہ قریب ہے بحری اور بری مینڈکوں کا ایک ہی حکم ہے (کہ ان کی موت سے پانی ناپاک نہ ہوگا) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بری مینڈک کی موت سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں خون ہوتا ہے اور پانی اس کا اصل مقام نہیں ہوتا ۔ پانی میں بسیرا کرنے والے جانور وہ ہیں جن کی پیدائش اور ٹھکانا پانی ہی میں ہو ۔ لیکن وہ جانور جن کا بسیرا پانی میں ہو اور پیدا خشکی پر ہوں ان کی موت پانی کو فاسد کر دیتی ہے ۔

مسئلہ :

مستعمل پانی کے احکام : مستعمل پانی کسی قسم کے حدث کو پاک نہیں کرتا ۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کو اس میں اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں لفظ طہور کا مطلب یہ ہے کہ جو بار بار پاک کرے جس طرح قطوع (جس سے بار بار کاٹنا مراد ہے) ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے کہ اگر پانی کو استعمال کرنے والا با وضو ہو تو وہ پانی طہور ہوگا (یعنی خود بھی پاک اور دوسرے کو بھی پاک کرنے والا) اگر استعمال کرنے والا بے وضو ہو تو مستعمل پانی طاہر ہوگا مگر مطہر (یعنی دوسرے کو پاک کرنے والا) نہیں ہوگا کیونکہ (بے وضو ہونے کی

صورت میں) اعضاء حقیقةً پاک ہوتے ہیں اسی لحاظ سے پانی طاہر ہوتا ہے لیکن شرعی حکم کے مطابق اعضاء پاک نہیں ہوتے اور ان پر استعمال ہونے والا پانی حکماً ناپاک ہوگا۔ لہذا دونوں پہلوؤں کے مدنظر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا پانی خود تو پاک ہے۔ لیکن دوسرے کو پاک کرنے کے قابل نہ ہوگا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں اور امام اعظمؒ سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے کہ مستعمل پانی طاہر تو ہوتا ہے مگر طہور نہیں ہوتا کیونکہ کسی پاک چیز کا کسی پاک چیز سے ملنا نجاست کا سبب نہیں ہوا کرتا۔ البتہ وضو سے چونکہ ثواب و قربت کی نیت کی جاتی ہے اس لیے پانی کی صفت کمال میں تغیر آ جاتا ہے (یعنی پانی خود تو پاک رہا مگر اس سے دوسرے کو پاک کرنے والی صفت زائل ہوگئی) جیسا کہ صدقہ کے مال میں ہوتا ہے۔ (ویسے تو مال ہر شخص کو دیا جا سکتا ہے مگر نیت صدقہ سے اس کی صفت میں کمی آ جاتی ہے اور اغنیاء وغیرہ کے لیے جائز نہیں رہتا)۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ ماء مستعمل ناپاک ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص بھی ساکن پانی میں پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں غسل جنابت ہی کرے" (اگر مستعمل پانی ناپاک نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غسل سے منع نہ فرماتے) دوسری دلیل یہ ہے کہ اس پانی سے نجاست حکمیہ دور کی جاتی ہے۔ لہذا اس کی حالت اس پانی کی طرح

ہوگی جس سے نجاست حقیقیہ دور کی جائے۔

امام حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کیا ہے کہ مستعمل پانی کو نجاست غلیظہ کے ذیل میں شمار کیا جائے گا جیسا کہ نجاست حقیقیہ میں استعمال شدہ پانی کو نجاست غلیظہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے امام اعظمؒ سے نقل کیا ہے کہ مستعمل پانی میں چونکہ فقہاء کا کافی اختلاف ہے اس لیے نجاست خفیفہ کا حکم زیادہ محتاط اور سہولت آمیز ہوگا۔ (امام ابو یوسفؒ کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ اختلاف علماء کی بناء پر اس کو نجاست خفیفہ میں شمار کرنا مناسب ہے)۔

مسئلہ :

مستعمل پانی وہ ہوتا ہے جس سے حدث کو دور کیا جائے یا جسے حصول ثواب کے لیے بدن کے کام میں لایا جائے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ امام ابو یوسفؒ کا موقف ہے اور کہا جاتا ہے کہ امام اعظمؒ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ پانی صرف قربت کی نیت سے استعمال کرنے پر مستعمل ہوتا ہے کیونکہ بدن کے گناہوں کی نجاست پانی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور یہ نجاست صرف نیت قربت ہی سے زائل ہوتی ہے۔ لہذا پانی اسی صورت میں مستعمل ہوگا جب کہ اس کے استعمال میں نیت قربت و ثواب ہو)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ فرض کا ساقط کرنا بھی پانی کے مستعمل ہونے میں مؤثر ہے (یعنی حدث کو زائل کرنے کے لیے وضو کرنا یا جنابت کے ازالہ کے لیے غسل کرنا چاہے قربت کی نیت ہو یا نہ ہو پانی کو مستعمل بنا دیتا تو (نیت قربت اور ازالۂ حدث دونوں باتوں سے پانی فاسد ہو جائے گا۔

مسئلہ :

پانی کب مستعمل ہو جاتا ہے؟ صحیح یہ ہے کہ عضو سے علیحدہ ہوتے ہی پانی مستعمل ہو جاتا ہے کیونکہ علیحدہ ہونے سے قبل ضرورت کی بنا پر اس کو مستعمل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن علیحدگی کے بعد ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ :

جُنبی آدمی نے کنوئیں میں ڈول تلاش کرنے کے لیے غوطہ لگایا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جنبی حسب سابق جنبی ہوگا کیونکہ اس نے بدن پر پانی نہیں انڈھیلا۔ حالیکہ بدن پر پانی کا انڈھیلنا اور بہانا امام یوسفؒ کی رائے میں اسقاط فرض کی شرط ہے اور کنوئیں کا پانی بھی حسب سابق پاک ہے کیونکہ مستعمل ہونے کی دونوں شرطیں (یعنی پانی انڈھیلنا اور نیت قربت کرنا) معدوم ہیں۔

امام محمدؒ کی رائے میں (جنبی اور کنواں) دونوں پاک ہیں۔ جنبی اس لیے کہ بدن پر پانی انڈھیلنا امام محمدؒ کے

نزدیک شرط نہیں اور پانی اس لیے پاک رہا کہ اس کا استعمال قربت کی نیت سے نہیں کیا گیا۔

امام ابو حنیفہؒ کے نظریے کے مطابق آدمی اور پانی دونوں ناپاک ہیں۔ پانی اس لیے کہ اس کے بدن سے لگتے ہی بعض اعضاء کی جنابت دور ہو گئی (اور اس سے پانی مستعمل ہو گیا) اور آدمی اس وجہ سے ناپاک ہے کہ باقی اعضاء میں ابھی حدث موجود ہے۔ بعض کا قول ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک آدمی کا ناپاک ہونا مستعمل پانی کی نجاست کی بنا پر ہے۔

امام اعظمؒ ہی سے یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ آدمی پاک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے پانی سے علیحدہ ہونے سے پہلے پانی کو مستعمل نہیں کہا جا سکتا۔ امام اعظمؒ کی تمام روایتوں میں یہ روایت زیادہ مناسب ہے (اور یہی قابل عمل ہوگی)۔

کھال کے احکام

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ آدمی اور خنزیر کی کھال کے علاوہ ہر قسم کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے اس کے چمڑے پر نماز ادا کرنا جائز ہے اور (اس کی کھال کی مشک بنا لینے سے) اس سے وضو جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کے کہ ہر ”کھال دباغت سے پاک

ہو جاتی ہے" مردار کی کھال کے بارے میں یہ حدیث اپنے عموم کی بنا پر امام مالکؒ پر حجت ہے۔

دوسری حدیث جس میں مردار کی کھال سے نفع حاصل کرنے کی ممانعت ہے اس حدیث کے معارض نہ ہوگی، اور وہ حدیث یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مردار کی کھال سے نفع مت حاصل کرو"۔ دونوں میں تعارض اس لیے نہیں کہ اہاب سے مراد غیر مدبوغ کچی کھال ہے۔ (یعنی مذکورہ بالا حدیث أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ میں کھال سے مراد دباغت شدہ کھال ہے اور نہی والی حدیث میں کھال سے مراد غیر مدبوغ کچی کھال ہے لہذا تعارض نہ رہا)۔

نیز ہماری پیش کردہ حدیث امام شافعیؒ پر بھی حجت ہے کیونکہ وہ (آدمی اور خنزیر کی کھال کے علاوہ) کتے کی کھال کو بھی مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ حالیکہ کتا نجس العین نہیں ہوتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کتے سے نگہبانی اور شکار میں کام لیا جاتا ہے۔ بخلاف خنزیر کے کیونکہ وہ نجس العین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَإِنَّهُ رِجْسٌ میں ضمیر قرب خنزیر کی وجہ سے اسی کی طرف راجع ہے۔ آدمی کے اجزاء سے نفع حاصل کرنا اس کی کرامت و شرافت کی بنا پر ممنوع ہے۔ پس آدمی اور خنزیر دونوں بیان کردہ حدیث کے حکم سے مستثنیٰ ہوں گے۔

مسئلہ :

جو چیز کھال کو گلنے سڑنے اور خراب ہونے سے بچائے وہی دباغت ہے ، خواہ یہ مقصد دھوپ میں ڈال دینے سے حاصل ہو ، یا مٹی مل دینے سے ، کیونکہ جب ان امور سے مقصد حاصل ہو جائے تو کسی دوسری چیز کی شرط عائد کرنے کی کیا ضرورت ۔

مسئلہ :

جس جانور کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے اس کی کھال ذبح کرنے سے بھی پاک ہو جاتی ہے کیونکہ ذبح کرنا نجس رطوبتوں کے زائل کرنے میں دباغت جیسا عمل کرتا ہے ۔ اسی طرح ذبح کرنے سے گوشت بھی پاک ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ اس جانور کا گوشت کھایا نہ جاتا ہو یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

مردار کے بال اور ہڈیاں پاک ہوتی ہیں ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ناپاک ہیں کیونکہ بال اور ہڈیاں بھی مردار کا جز ہوتی ہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ بالوں اور ہڈیوں میں زندگی نہیں ہوتی اسی لیے ان کے کاٹنے سے اذیت نہیں ہوتی ۔ تو موت بھی ان میں مؤثر نہ ہوگی کیونکہ موت زوال حیات کا دوسرا نام ہے (اور بال وغیرہ تو پہلے ہی زندگی سے عاری ہوتے ہیں) ۔

مسئلہ :

انسان کے بال اور ہڈیاں پاک ہیں ۔ امام شافعیؒ کی رائے میں ناپاک ہیں ، کیونکہ نہ تو ان سے انتفاع روا ہے اور نہ انہیں فروخت کرنا جائز ہے ۔

امام شافعیؒ کے استدلال کے جواب میں احناف کہتے ہیں کہ عدم انتفاع اور عدم بیع انسان کی کرامت کی بنا پر ہیں ۔ نہ کہ اس کے ناپاک ہونے کی علامت ۔

فصل فی البئر

کنوئیں کا بیان

مسئلہ :

جب کنوئیں میں نجاست گر جائے تو اس کا سارا پانی نکالا جائے اور پانی کا اس طرح نکال دینا کنوئیں کی طہارۃ کا سبب ہوگا۔ سلف صالحین کا اسی عمل پر اجماع تھا۔ کنوئیں (کی طہارۃ) کے مسائل آثار سلف کے اتباع ہی پر مبنی ہیں۔ ان میں قیاس و رائے کا دخل نہیں۔

مسئلہ :

اگر کنوئیں میں اونٹ یا بکری کی ایک یا دو مینگنیاں پڑ جائیں تو استحسان کے مد نظر پانی ناپاک نہ ہوگا۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ناپاک ہو جاتا کیونکہ نجاست قلیل پانی میں گری ہے۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ آبادی سے باہر جنگلوں میں کنوئیں کی منڈیریں یا کوئی اور روک نہیں ہوتی، مویشی ان کے آس پاس (چرتے ہوئے) مینگنیاں کرتے ہیں جنھیں ہوائیں کنوئیں میں ڈال دیتی ہیں۔ لہذا ضرورت کے مدنظر قلیل

نجاست کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ [استحسان چار وجہ سے ہوتا ہے] ۔

اول ۔ قیاس جلی کے مقابلے میں قیاس خفی ہو تو قیاس خفی پر عمل کرنا استحسان ہوگا ۔

دوم ۔ قیاس جلی کے مقابل خبر واحد ہو تو خبر واحد کو معمول بنانا استحسان شمار ہوگا ۔

سوم ۔ قیاس جلی کے مقابل ضرورت ہو تو قیاس جلی کو چھوڑ کر ضرورت پر عمل کرنا استحسان کہلاتا ہے ۔ جیسا کہ مذکورہ مسئلے میں قلیل نجاست کو نظر انداز کرکے ضرورت کے مد نظر قیاس کو ترک کر دیا گیا ہے ۔

چہارم ۔ قیاس کے مقابل تَعَامُلُ النَّاس ہو تو تَعَامُلُ النَّاس پر عمل کرنا استحسان ہوگا ۔ مثلاً معدوم شے کی بیع جائز نہیں مگر لوگ ٹھیکے پر کام کراتے ہیں یا کچھ پیشگی دے کر چیزیں بنواتے ہیں ۔ اگر مذکورہ اصول کے پیش نظر ان امور کو ناجائز قرار دیا جاتا تو لوگوں کو دقت پیش آتی اس لیے قیاس کو ترک کر دیا گیا اور استحسان کے طور پر عوام کے تعامل کو روا رکھا گیا ۔

(صاحب کتاب پر اعتراض کیا گیا کہ اگر ضرورت کے تحت قلیل نجاست کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے تو کثیر نجاست کو بھی ضرورت کے تحت قابل معافی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ مصنف جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) کثیر نجاست کو نظر انداز کرنے کی کوئی مجبوری یا ضرورت نہیں (کہ استحسان پر عمل کیا جائے کیونکہ کثیر نجاست کا وقوع

اتنا عام نہیں ہوتا لہذا نجاست کثیرہ واقع ہونے کی صورت میں پانی نکالنا پڑے گا) ۔

امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق نجاست کثیرہ وہ ہے جسے دیکھنے والا کثیر سمجھے ۔ یہی رائے قابل اعتماد اور قابل عمل ہے ۔

تر یا خشک ، سالم یا ٹوٹی ہوئی مینگنی میں کوئی امتیاز نہیں ۔ لید ، گوبر اور مینگنی کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ ضرورت ان سب میں یکساں طور پر موجود ہے ۔

مسئلہ :

اگر بکری دودھ دوہنے والے برتن میں ایک دو مینگنیاں کر دے تو فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ضرورت کے پیش نظر مینگنیاں نکال کر پھینک دی جائیں اور دودھ استعمال کر لیا جائے (کیونکہ دودھ دوہتے وقت اکثر ایسا ہو جاتا ہے اور دودھ کا گرا دینا باعث نقصان ہے) دوسرے برتنوں میں چونکہ اس قسم کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی ۔ اس لیے نجاست کی قلیل مقدار بھی قابل معافی نہیں ہوگی ۔ (یعنی دودھ دوہنے والے برتن کے علاوہ اگر کسی دوسرے برتن میں بکری ایک دو مینگنیاں کر دے تو برتن والی چیز قابل استعمال نہیں ہوگی کیونکہ دوسرے برتنوں میں اس قسم کا واقعہ شاذ و نادر ہی پیش آتا ہے) ۔

امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ ایک دو مینگنیوں کے متعلق برتن کا حکم کنوئیں جیسا ہوگا (یعنی نجس نہ ہوگا) ۔

مسئلہ :

اگر کنوئیں میں کبوتر یا چڑیا کی بیٹ گر جائے تو پانی ناپاک نہیں ہوگا ۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ بیٹ پانی کے بدبو دار اور فاسد ہونے کا باعث ہوتی ہے لہذا مرغی کی بیٹ کی طرح ہوگی ۔

احناف کی دلیل پر ''تمام مسلمانوں کا اجماع'' ہے کہ مسجدوں میں کبوتروں کا رکھنا جائز ہے حالانکہ مساجد کو پاک و صاف رکھنے کا حکم وارد ہوا ہے (لہذا ثابت ہوا کہ کبوتروں کی بیٹ ناپاک نہیں) اور یہ بیٹ چونکہ زیادہ بدبو دار نہیں ہوتی اس لیے کیچڑ کے مشابہ ہوگی ۔

مسئلہ :

اگر بکری کنوئیں میں پیشاب کر دے تو شیخینؒ کی رائے میں سارا پانی نکالا جائے گا ۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب تک پانی پر پیشاب غالب نہ آ جائے سارا پانی نکالنے کی ضرورت نہیں ۔ (پیشاب غالب آنے کی صورت میں پانی طاہر تو ہوتا ہے مگر) طہور نہیں رہتا ۔

اس اختلاف کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا پیشاب پاک ہوتا ہے اور شیخینؒ کے نزدیک نجس ۔

امام محمدؒ کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے عُرینی قبیلے کے لوگوں سے فرمایا کہ ''اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیو'' ۔ شیخینؒ نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے کہ پیشاب سے احتراز کیا کرو کیونکہ عموماً عذاب قبر اس سے ہوگا" استدلال کرتے ہیں ۔ اس ارشاد میں ماکول اللحم (جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے) یا غیر ماکول اللحم جانوروں میں کوئی امتیاز نہیں ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ماکول اللحم جانوروں کا بول بھی بدبو دار اور فاسد ہو جاتا ہے اس لیے یہ غیر ماکول اللحم جانوروں کے بول کی طرح ہوگا ۔

امام محمدؒ کی پیش کردہ روایت کا مطلب یہ ہے کہ اہل عُرینہ ایک وبائی مرض میں مبتلا تھے جس کا علاج آپ نے بحکم وحی ارشاد فرمایا ۔ (اور ان کی شفاء اسی میں تھی ۔ لہذا یہ ایک مخصوص واقعہ تھا ۔ اس سے عام اصول اخذ نہیں کیا جا سکتا) ۔

پھر امام اعظمؒ کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب بطور دوا استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ شفاء حاصل ہونا یقینی نہیں اس لیے اس کی حرمت سے اعراض نہیں کیا جائے گا ۔

امام ابو یوسفؒ کی رائے میں اہلِ عُرینہ کے واقعہ کے پیش نظر دوا کے طور پر پیشاب کا استعمال جائز ہے ۔ امام محمدؒ کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا بول چونکہ پاک ہے اس لیے دوا وغیرہ کے طور پر استعمال کرنا جائز ہوگا ۔

مسئلہ :

اگر چوہا ، چڑیا ، بھجنگا ، ممولا یا چھپکلی کنوئیں میں گر کر مر جائے تو (جانور نکالنے کے بعد) کنوئیں سے بیس سے تیس تک ڈول نکالے جائیں اور یہ فرق ڈول کے چھوٹا یا بڑا ہونے کے لحاظ سے ہوگا ۔ لیکن خیال رہے کہ پانی کی مذکورہ مقدار کا نکالنا چوہا وغیرہ نکال دینے کے بعد ہوگا اس کی دلیل حضرت انس رض کا چوہے کے بارے میں ارشاد ہے آپ نے فرمایا کہ اگر کنوئیں میں چوہا گر کر مر جائے تو اسے اسی وقت نکال باہر کیا جائے اور کنوئیں سے بیس ڈول پانی نکالا جائے ۔

چڑیا وغیرہ بھی چونکہ جسامت میں چوہے کے برابر ہوتی ہے اس لیے چوہے والا حکم ان چیزوں پر بھی جاری ہوگا ۔ بیس ڈول نکالنا امر واجب ہے اور تیس نکالنا امر مستحب ۔

مسئلہ :

کنوئیں میں اگر کبوتر یا ایسا ہی کوئی جانور جیسے مرغی یا بلی وغیرہ گر کر مر جائے تو اس سے چالیس سے ساٹھ ڈول تک پانی نکالا جائے ۔

جامع الصغیر میں چالیس یا پچاس ڈولوں کا تذکرہ ہے یہی قول زیادہ واضح اور مناسب ہے کیونکہ حضرت ابو سعید الخدری رض نے مرغی کے متعلق فرمایا کہ وہ اگر کنوئیں میں گر کر مر جائے تو چالیس ڈول پانی نکالا جائے

یہ روایت چالیس ڈول واجب قرار دیتی ہے اور پچاس ڈول بطریق استحباب ہیں ۔

ہر کنوئیں کے بارے میں اسی ڈول کا اعتبار ہوگا جس سے عموماً پانی نکالا جاتا ہو ، بعض اصحاب سے یہ بھی منقول ہے کہ ڈول ایسا ہو جس میں کم از کم ایک صاع پانی آسکتا ہو ۔ (صاع چار سیر کے برابر ہوتا ہے) اگر کسی بڑے ڈول سے ایک بار ہی بیس ڈولوں کی مقدار پانی نکال لیا گیا تو کافی ہوگا کیونکہ مقصود اس صورت میں بھی حاصل ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ :

کنوئیں میں اگر بکری آدمی یا کتا مر جائے تو سارا پانی نکالا جائے گا ۔ (کتا اگر زندہ بھی نکال لیا جائے تو بھی سارا پانی نکالنا پڑے گا) کیونکہ چاہ زمزم میں جس وقت ایک حبشی گر کر مر گیا تھا ۔ تو حضرت ابن عباس رض اور ابن زبیر رض نے سارا پانی نکالنے کا حکم دیا تھا ۔

مسئلہ :

جانور اگر (کنوئیں میں) پھول جائے یا گل سڑ جائے تو سارا پانی نکالا جائے (خواہ گرا ہوا) حیوان چھوٹا ہو یا بڑا کیونکہ جانور کے جسم سے رطوبت نکل کر تمام پانی میں منتشر ہو جاتی ہے ۔

مسئلہ :

کنواں اگر چشمہ دار ہو کہ جس کا سارا پانی نکالنا ممکن نہ

ہو تو اس کا موجودہ پانی ہی نکال دیا جائے۔ ''موجودہ پانی'' کی معرفت کا یہ طریقہ ہے کہ جس قدر گہرائی میں کنوئیں کا پانی ہے زمین میں اتنا ہی گہرا گڑھا کھود لیا جائے اور اسے کنوئیں سے پانی نکال نکال کر بھر دیا جائے۔ یا کنوئیں میں بانس کے ذریعے پانی کی گہرائی معلوم کی جائے اور جہاں تک پانی ہو بانس پر نشان لگا لیا جائے۔ پھر مثلاً دس ڈول پانی نکالنے کے بعد بانس کنوئیں میں ڈال کر پھر دیکھا جائے کہ نشان سے کس قدر کم ہوا ہے اسی طرح بانس پر بنے ہوئے نشان کے مطابق حساب کرکے دس دس ڈول نکال لیے جائیں (مثلاً پانی میں بانس کھڑا کرنے سے معلوم ہوا کہ پانی کی گہرائی دس فٹ ہے دس فٹ پر نشان لگا لیا جائے۔ دس ڈول نکالنے سے دو انچ پانی کم ہوا تو اب حساب کے مطابق چھ سو ڈول نکالنے ہوں گے) یہ دونوں طریقے امام ابو یوسفؒ سے مروی ہیں، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دو سو سے تین سو تک ڈول نکال دیے جائیں، شاید امام محمدؒ نے اپنے علاقے کے کنوؤں کے مشاہدے پر اس اصول کی بنا رکھی ہے۔

الجامع الصغیر میں امام اعظمؒ سے روایت ہے کہ ایسے جاری پانی والے کنوؤں سے اتنا پانی نکالا جائے کہ لوگ تھک کر مغلوب ہو جائیں اور پانی ان پر غالب آ جائے۔ امام اعظمؒ نے غلبہ کی حد متعین نہیں فرمائی۔ جیسا کہ آپ کی عادت شریفہ ہے۔ (جہاں کسی کام کی حد اور مقدار اس کام میں مبتلا شخص ہی کو معلوم ہو سکے تو امام اعظمؒ

اس مبتلا شخص ہی کی رائے کو قابل اعتبار جانتے ہیں۔ مذکورہ مسئلے میں جب لوگ پانی نکال نکال کر تھک جائیں اور کہنے لگیں کہ اب پانی کی صحیح مقدار نکل چکی ہے تو ان کا اندازہ قابل قبول ہوگا)۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسے دو آدمیوں کے قول پر جنھیں پانی کے متعلق بصیرت اور تجربہ ہو اعتماد ہوگا اور یہ قول فقہ کے زیادہ قریب ہے۔

مسئلہ :

لوگوں نے دیکھا کہ کنوئیں میں چوہا یا کوئی اور جانور مرا پڑا ہے جو پھولا ہوا نہیں لیکن معلوم نہیں کہ وہ کب گرا ہے تو جن لوگوں نے اس پانی کو وضو میں استعمال کیا ہے وہ ایک دن رات کی نمازوں کا اعادہ کریں اور ہر وہ چیز دھو ڈالیں جس کو یہ پانی لگا ہو۔

اگر مردہ جانور پھول گیا ہو یا پھٹ گیا ہو تو تین دن رات کی نمازوں کا اعادہ کریں۔ یہ رائے امام اعظمؒ کی ہے صاحبینؒ کی رائے میں کسی نماز کا اعادہ ضروری نہیں جب تک کہ گرنے کے وقت کا یقینی طور پر پتا نہ چل جائے کیونکہ یقین محض شک کی بنا پر کس طرح زائل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص کپڑے پر نجاست لگی ہوئی دیکھے اور اسے معلوم نہ ہو وہ کہ کس وقت لگی ہے (تو اس پر کسی نماز کا اعادہ واجب نہیں ہوتا)۔

امام اعظمؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ موت کا ایک

ظاہری سبب یعنی کنوئیں میں گرنا تو واضح ہے۔ لہذا موت کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ البتہ جانور کا پھول جانا یا گل سڑ جانا قدامت کی علامت ہے جس کی حد ہم نے (کم از کم) تین دن رات مقرر کی نہ پھولنا قُرب عہد کی نشانی ہے اور نہ گلنا سڑنا ہی جس کا اندازہ ایک دن رات سے کیا گیا کیونکہ اس سے کم ساعتوں کا ضبط ممکن نہیں۔

رہا کپڑے پر نجاست کا مسئلہ تو اس میں بھی معلّی بن منصور کی روایۃ کے مطابق اسی طرح اختلاف ہے کہ اگر نجاست خشک ہو چکی ہے تو تین دن رات اس کا اندازہ ہوگا اگر مرطوب ہو تو ایک دن رات کا۔

اور اگر مسئلہٗ ثوب متفق علیہ بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی کپڑے اور کنوئیں کی کیفیت میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ کپڑا تو ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ مگر کنواں نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے (لہذا کنوئیں کا کپڑے پر قیاس کرنا درست نہیں)۔

فصل فی الاسآرِ وَغیرِھا

جھوٹے وغیرہ کا بیان

مسئلہ :

ہر جاندار کے پسینے کا وہی حکم ہوتا ہے جو اس کے جھوٹے کا ہوتا ہے ۔ کیونکہ پسینہ اور لعاب دونوں گوشت کی پیداوار ہیں ۔ لہذا ایک کا حکم دوسرے کا ہوگا ۔

مسئلہ :

آدمی اور ماکول اللحم جانوروں کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے ۔ کیونکہ جھوٹے پانی وغیرہ میں ان کا لعاب شامل ہو جاتا اور یہ لعاب پاک گوشت کی پیداوار ہے ۔ (اس لیے پاک ہوگا) جُنبی ، حائضہ اور کافر بھی اسی حکم میں داخل ہیں ۔ (یعنی ان کا جھوٹا بھی پاک ہے) ۔

مسئلہ :

کُتّے کا جھوٹا ناپاک ہے ۔ اس کے جھوٹے برتن کو تین بار دھویا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہے کہ ”کتے کے پینے سے برتن کو تین بار دھویا جائے“ ۔

کُتّے کی زبان پانی کو لگتی ہے برتن کو نہیں لہذا جب برتن ناپاک ہو گیا تو پانی بدرجۂ اولیٰ ناپاک ہو گا۔ مذکورہ حدیث سے دو باتوں کا پتا چلا۔ اول کتے کا جھوٹا ناپاک ہے دوم عدد غسل کا کہ برتن کو تین بار دھویا جائے) یہ حدیث امام شافعیؒ پر بھی حجت ہے کہ وہ برتن کو سات بار دھونے کی شرط عائد کرتے ہیں۔ نیز کتے کے بول سے آلودہ چیز اگر تین بار دھونے سے پاک ہو جاتی ہے تو اس کا جھوٹا برتن بدرجۂ اولیٰ تین بار دھونے سے پاک ہو جائے گا کیونکہ لعاب نجاست میں بول سے کہیں کم ہوتا ہے۔ سات بار دھونے کا حکم ابتداء اسلام کے زمانہ پر محمول ہو گا۔

مسئلہ :

خنزیر کا جھوٹا ناپاک ہے کیونکہ وہ نجس العین ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مسئلہ :

درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے سوائے کُتّے اور خنزیر کے۔ امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے۔ (وہ کُتّے اور خنزیر کے سوا دوسرے درندوں کا جھوٹا پاک قرار دیتے ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ان کا گوشت ناپاک ہے اور لعاب گوشت ہی سے پیدا ہوتا ہے اس لیے لعاب کی طہارت یا عدم طہارت کا مدار گوشت پر ہو گا۔

مسئلہ :

بلی کا جھوٹا پاک تو ہے مگر مکروہ ہے ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مکروہ نہیں ۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلی کے لیے برتن ٹیڑھا کر دیتے وہ پی لیتی اور آپ اسی پانی سے وضو فرما لیتے ۔

صاحبینؒ کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''بلی درندہ ہے'' اور اس ارشاد کا مقصد بلی کا حکم بتانا تھا (خلقت بیان کرنا نہیں تھا) حدیث مذکور کے مدنظر بلی کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے ۔ مگر کثرت سے آمد و رفت کی بنا پر نجاست ساقط ہوگئی ۔ لیکن کراہت رہ گئی امام ابو یوسفؒ کی پیش کردہ حدیث تحریم سے پہلے کی ہے ۔

بعض حضرات نے کہا کہ بلی کے جھوٹے کی کراہت اس کے گوشت کی حرمت کی بنا پر ہے اور بعض فقہاء نے کہا کہ وہ ناپاک چیزوں سے احتراز نہیں کرتی (اس لیے اس کا جھوٹا مکروہ ہے) یہ دوسرا قول کراہت تنزیہی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پہلا حرام کے قریب ہونے کی طرف ۔

مسئلہ :

بلی اگر چوہا کھانے کے فوراً بعد ہی پانی پیے تو باقی پانی ناپاک ہوگا اگر کچھ دیر ٹھہر کر پانی پیے تو ناپاک نہ ہوگا کیونکہ اتنی دیر میں وہ منہ کو لعاب سے صاف کر لیتی ہے ۔ یہ استثنائی صورت شیخینؒ کے مسئلے کے مطابق ہے اور (امام ابو یوسفؒ کے نزدیک) پانی بہانے

کی شرط ضرورت کے تحت ساقط ہو جائے گی ۔ (کیونکہ بلی تو اپنا منہ لعاب ہی سے صاف کرسکتی ہے پانی سے نہیں کہ پانی بہانے کی شرط مدنظر رکھی جائے) ۔

مسئلہ :

آزاد مرغی کا جھوٹا مکروہ ہے کیونکہ وہ نجاست کو کریدتی رہتی ہے ۔ اگر مرغی اس طرح بند ہو کہ اس کی چونچ قدموں سے نیچے نہ جا سکے تو اس کا جھوٹا مکروہ نہیں ہے کیونکہ وہ نجاست کی آلودگی سے محفوظ ہوتی ہے ۔

مسئلہ :

اسی طرح شکاری پرندوں کا جھوٹا بھی مکروہ ہے کیونکہ وہ مردار کھاتے ہیں ۔ اس لیے آزاد مرغی کے مشابہ ہوں گے ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر شکاری پرندے بند ہوں اور مالک کو یقین ہو کہ ان کی چونچ نجاست سے آلودہ نہیں ہے تو ان کا جھوٹا مکروہ نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ نجاست کی آلودگی سے محفوظ ہوتے ہیں ۔ مشائخ نے اس روایت کو مستحسن قرار دیا ہے ۔

مسئلہ :

سانپ اور چوہے وغیرہ جانوروں کا جھوٹا بھی مکروہ ہے ۔ جو گھروں میں بسیرا کرتے ہیں کیونکہ حرمت لحم کی وجہ سے ان کا جھوٹا بھی ناپاک ہونا چاہیے تھا ۔ مگر گھروں میں بکثرت آمد و رفت کی بنا پر نجاست

ساقط ہو گئی لیکن کراہت رہ گئی ۔ بلی کے مسئلہ میں اس علت پر متنبہ کر دیا گیا ہے ۔ (قولہؐ علیہ السلام إِنَّهاَ منَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ والطَّوَّافَات) ۔

مسئلہ :

گدھے اور خچر کا جھوٹا مشکوک ہے ۔ بعض نے کہا کہ اس کی طہارت میں شک ہے کیونکہ اگر ان کا جھوٹا پاک ہو تو جس پانی میں ان کا لعاب شامل ہو بشرطیکہ پانی پر غالب نہ ہو تو ایسا پانی (طاہر ہونے کے ساتھ ساتھ) مطہر بھی ہونا چاہیے اور بعض کے نزدیک اس کے مُطہّر ہونے میں شک ہے ۔ کیونکہ اگر گدھے یا خچر کے جھوٹے پانی سے سر پر مسح کر لے تو مطلق پانی میسر ہونے پر سر کا دھونا ضروری نہیں ہے ۔ (اگر پانی کی طہارت مشکوک ہوتی تو سر کا دھونا واجب ہوتا) ۔

مسئلہ :

اسی طرح گدھی کا دودھ بھی پاک ہے ۔ اور اس کا پسینہ بھی خواہ کتنا ہی کپڑوں سے لگ جائے جواز نماز سے مانع نہیں ۔ اس کے جھوٹے کا بھی یہی حکم ہے اور یہی رائے صحیح ہے ۔ امام محمدؒ سے اس کی طہارت بھی منقول ہے ۔ گدھے کے جھوٹے میں شک کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اباحت اور حرمت کے سلسلے میں دلائل متعارض

ہیں اور اس کی نجاست یا طہارت میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف بھی منقول ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے حرمت اور نجاست کو ترجیح دیتے ہوئے اسے نجس قرار دیا ہے (کیونکہ اصول فقہ کا مسلمہ قانون ہے کہ إِذَا تَعَارَضَ الْمُحَرِّمُ وَ الْمُبِيحُ فَالتَّرْجِيحُ لِلْمُحَرِّمِ۔ اسی طرح جب طہارت و نجاست میں تعارض ہو تو نجاست کو ترجیح ہوتی ہے۔ کیونکہ احتیاط اسی میں ہے) خچر گدھے ہی کی نسل سے ہوتا ہے۔ لہذا اس کے احکام بھی گدھے کے احکام جیسے ہوں گے۔

مسئلہ :

اگر گدھے یا خچر کے جھوٹے پانی کے علاوہ پانی نہ ہو تو اسی پانی سے وضو کر لے نیز تیمم بھی کرے جو بھی پہلے کر لے درست ہے۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ وضو کا مقدم کرنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ ایسا پانی ہے جس کا استعمال واجب ہے۔ پس یہ مطلق پانی کے مشابہ ہوگا۔

ہماری دلیل یہ ہے۔ کہ ان دونوں میں مطہر درحقیقت ایک ہی ہے۔ اس لیے جمع کرنے میں تو فائدہ ہے لیکن ترتیب سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔

مسئلہ :

صاحبینؒ کی رائے میں گھوڑے کا جھوٹا پاک ہے۔ کیونکہ اس کا گوشت حلال ہے اور صحیح روایۃ کے

مطابق امام اعظم کے نزدیک بھی پاک ہے ۔ کیونکہ اس کے گوشت کی کراہت اظہار شرف کے لیے ہے (یعنی گھوڑے کا گوشت اس کے احترام کی وجہ سے مکروہ ہے کیونکہ وہ آلۂ جہاد ہے اس لیے اس کی نسل کُشی سے منع کیا گیا) ۔

نبیذ کے احکام

مسئلہ :

اگر کھجوروں کی نبیذ کے سوا (پانی وغیرہ) کچھ پاس نہ ہو ۔ تو امام اعظمؒ کی رائے میں اسی نبیذ سے وضو کر لے اور تیمم نہ کرے ۔ اس کی دلیل لیلۃ الجن کی حدیث ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی موجود نہ ہونے پر نبیذ سے وضو فرمایا تھا ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ تیمم کرے اور نبیذ سے وضو نہ کرے امام اعظمؒ سے بھی ایک روایۃ یہی ہے ۔ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے ۔ یہ حضرات آیۃ تیمم کو معمول قرار دیتے ہیں ۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا ۔ یعنی اگر پانی میسر نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو ۔ کیونکہ آیۃ (حدیث کی بہ نسبت) زیادہ قوی ہے ۔ یا مذکورہ بالا حدیث آیت تیمم سے منسوخ ہے ۔ کیونکہ آیۃ تیمم مدنی ہے اور لیلۃ الجن کا واقعہ مکہ مکرمہ میں ظہور پذیر ہوا تھا ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ نبیذ سے وضو کرے اور تیمم بھی کرے ۔ کیونکہ حدیث میں اضطراب ہے (بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعودرضؓ بھی ساتھ تھے اور بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ ابن مسعودرضؓ ساتھ نہیں تھے اس لیے حدیث مضطرب ہے) اور تاریخ میں جہالت ہے (کیونکہ آپ متعدد بار جنات کو تبلیغ کرنے تشریف لے گئے ممکن ہے ابن مسعودرضؓ اس واقعہ کا تذکرہ کر رہے ہوں جو مدینہ میں آیۃ تیمم کے نزول کے بعد وقوع پذیر ہوا ہو ۔ لہذا حدیث کو منسوخ کہنا مناسب نہیں ۔ مذکورہ دلائل کے پیش نظر محتاط صورت یہی ہے کہ وضو کے ساتھ ساتھ تیمم بھی کر لیا جائے ۔ تاکہ نہ تو آیۃ پر عمل متروک ہو اور نہ حدیث کا دامن ہاتھ سے چھوٹے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ لیلۃ الجن والا واقعہ متعدد بار پیش آیا تھا ۔ اس لیے حدیث کو منسوخ قرار دینا درست نہیں اور یہ حدیث (خبر واحد بھی نہیں کہ آپ کا الزام صحیح ہو کہ ہم خبر واحد سے نص پر اضافہ کر رہے ہیں بلکہ یہ حدیث) مشہور ہے جس پر صحابہ کرامرضؓ کا تعامل ثابت ہے اور اس قسم کی مشہور حدیث سے نص پر اضافہ بھی جائز ہوتا ہے ۔

بعض فقہاء نے امام اعظمؒ کے نزدیک وضو پر قیاس کرتے ہوئے نبیذ سے غُسل بھی جائز قرار دیا ہے ۔ لیکن بعض نے ناجائز کہا ہے کیونکہ غسل تو وضو سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے ۔ (اس لیے وضو کے جواز ہی پر اکتفاء کیا

جائے گا)۔

جس نبیذ کے بارے میں اختلاف ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ شیرین اور پانی کی طرح رقیق اور اعضاء پر آسانی سے بہنے والی ہو۔ گاڑھی نبیذ حرام ہے اس سے وضو قطعاً جائز نہ ہوگا۔

آگ پر پکانے سے اگر اس کی شیرینی باقی رہے تو وہ حسب سابق مختلف فیہ ہے۔ لیکن گاڑھی ہونے کی صورت میں امام اعظمؒ کی رائے میں اس سے وضو جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کا پینا بھی جائز ہے۔ لیکن امام محمدؒ کی رائے میں چونکہ گاڑھی نبیذ کا پینا حرام ہے اس لیے اس سے وضو جائز نہ ہوگا۔

نبیذِ تمر کے علاوہ دوسری کسی نبیذ سے وضو جائز نہ ہوگا اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔

بَابُ التَّيَمُّم

تیمم کا بیان

مسئلہ :

جو شخص سفر میں ہو اور پانی اسے میسر نہ ہو ۔ یا شہر سے باہر ہو لیکن پانی اس سے ایک میل یا اس سے زائد فاصلہ پر ہو تو ایسا شخص پاک مٹی سے تیمم کر لے ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا" اگر پانی موجود نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کا فرمان ہے کہ مسلمان کے لیے مٹی پاکیزگی کا ذریعہ ہے خواہ اسے دس سال تک پانی نہ مل سکے ۔

ایک میل کی مسافت ہی مختار قول کے مطابق صحیح ہے ۔ کیونکہ شہر تک جانے (اور پانی حاصل کرنے میں) اسے مشقت کا سامنا ہوگا (اور شریعت انسانوں کے لیے یُسر و سہولت کا موجب ہے) اور پانی درحقیقت اس کے پاس موجود نہیں (تیمم کے جواز میں) اعتبار صرف مسافت اور دُوری کا ہوگا قلّت وقت کی بنا پر نماز کے فوت ہونے کا اعتبار نہیں

ہوگا کیونکہ کوتاہی اس کی اپنی جانب سے ہے (کہ اس نے ادا کرنے میں اتنی دیر کیوں کی کہ نماز جاتے رہنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا یہ کوتاہی خود اس کی جانب سے ہے۔ اس لیے معذور سمجھ کر تیمم کی اجازت نہ ہوگی)۔

مسئلہ :

اگر پانی موجود ہو لیکن استعمال کرنے والا مریض ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ پانی استعمال کرنے سے مرض شدت اختیار کر جائے گا تو ایسے مریض کے لیے تیمم جائز ہوگا۔ اس کی دلیل متذکرہ بالا آیت ہے۔ نیز مرض کی شدت کا نقصان اس مالی نقصان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جب کہ پانی کی قیمت ادا کرنا پڑے۔ جب قیمت ادا کرنے والی صورت تیمم کو مباح قرار دیتی ہے تو شدت مرض والی صورت میں بدرجۂ اولیٰ اس کا جواز ہوگا۔ خواہ بدن کو حرکت دینے سے بیماری میں اضافہ ہو یا پانی کے استعمال سے، کوئی فرق نہیں (بلکہ دونوں صورتیں جواز تیمم کی مقتضی ہیں)۔

امام شافعیؒ صرف ہلاکت نفس یا تلفِ عضو کا اعتبار کرتے ہیں۔ (کہ خوف تلف ہی کی صورت میں تیمم روا ہوتا ہے) لیکن نص ظاہر کے پیش نظر امام شافعیؒ کا قول درست نہیں۔ (کیونکہ آیۃ میں إِنْ كُنتُمْ مَّرْضَىٰ مطلق ہے جس کے ساتھ تلف وغیرہ کی کوئی شرط نہیں)۔

مسئلہ :

جنبی شخص کو اگر یہ اندیشہ ہو کہ پانی سے غسل کرنے سے اس کی جان جاتی رہے گی یا اس پر مرض کا حملہ ہو جائے گا تو وہ پاک مٹی سے تیمم کر سکتا ہے۔ یہ حکم شہر سے باہر ہونے کی صورت میں ہے (کیونکہ شہر سے باہر کھلی جگہ پر سخت برفانی موسم میں جہاں پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو یخ پانی سے نہانا خطرے کا باعث ہے۔ اس کی دلیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں (کہ شریعت حالت مرض میں بھی تیمم کی رعایت سے نوازتی ہے اور مرض لاحق ہو جانے کے خوف میں بھی تیمم کی اجازت دیتی ہے)۔

مسئلہ :

جنبی شخص اگر شہر میں ہو (اور اسے یہ اندیشہ ہو کہ غسل کرنے سے بیمار ہو جائے گا) تو امام اعظمؒ کے نزدیک وہ تیمم کر سکتا ہے۔ صاحبینؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شہر میں اس قسم کی کیفیۃ شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لہذا تیمم جائز نہ ہوگا۔(کیونکہ شہر میں غسل کی محفوظ جگہیں ہوتی ہیں۔ گرم حمام بھی جا بہ جا موجود ہوتے ہیں اور گھروں میں بھی پانی گرم کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ موسم سرما میں اکثر مساجد میں گرم پانی کا انتظام ہوتا ہے لہذا تیمم کی اجازت بھلا کیونکر دی جا سکتی ہے)۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ جب ضرر اور نقصان کا واقعی اندیشہ ہو تو اس کا لحاظ بھی ضرور کیا جائے گا۔

مسئلہ :

تیمم دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا ہوتا ہے ایک بار مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر مل لے اور دوسری بار ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”تیمم دو بار (مٹی پر) ہاتھ مارنے کا نام ہے۔ ایک بار منہ کے لیے اور ایک بار ہاتھوں کے لیے۔ مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد جھاڑ دے تاکہ مٹی جھڑ جائے اور ایسا نہ ہو کہ (مٹی سے) اس کا حلیہ ہی بگڑ جائے۔

مسئلہ :

ظاہر الروایہ کے مطابق تیمم میں استعیاب یعنی پورے اعضاء پر ہاتھ پھیرنا ضروری ہے کیونکہ تیمم وضو کے قائم مقام ہوتا ہے۔ (جس طرح وضو میں اعضاء کا استعیاب ضروری ہوتا ہے اسی طرح تیمم میں بھی ہوگا) اسی اصول کی بناء پر فقہاء عظام کا ارشاد ہے کہ تیمم میں ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال بھی کرے بلکہ انگوٹھی بھی اتار دے تاکہ مسح کا حقہ، پورے طور پر سر انجام دیا جا سکے۔

مسئلہ :

تیمم میں حدث اور جنابت یکساں حیثیت رکھتے ہیں (یعنی جس طرح وضو کے بجائے تیمم جائز ہے اسی طرح غسل

کے لیے بھی تیمم کافی ہوگا) ۔ حیض اور نفاس کا بھی یہی حکم ہے ۔ اس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ "آپ کی خدمت اقدس میں کچھ لوگ حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لوگ ایسے صحرائی اور ریتلے علاقے میں سکونت پذیر ہیں جہاں مہینہ مہینہ بلکہ دو دو ماہ تک پانی دستیاب نہیں ہوتا اور ہم میں جنبی بھی ہوتے ہیں اور حیض و نفاس والی عورتیں بھی" ۔ آپ نے فرمایا کہ "تم اپنی ضروریات زمین سے پوری کر لیا کرو" ۔

مسئلہ :

طرفین؁ کی رائے میں ہر اس چیز سے تیمم درست ہے جو زمین کی جنس سے ہو ۔ جیسے مٹی ، ریت ، سنگریزے ، گچ ، چونا ، سرمہ ، ہڑتال وغیرہ ۔

امام ابو یوسف؁ کا ارشاد ہے کہ مٹی اور ریت کے سوا کسی دوسری چیز سے تیمم جائز نہیں ۔ امام شافعی؁ کے نزدیک صرف اگانے (کی صلاحیت رکھنے) والی مٹی سے درست ہے ۔ امام ابو یوسف؁ سے بھی ایسی ہی ایک روایت ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَيَمَّمُوا صَعِيداً طَيِّباً یعنی تراب مُنْبِت ۔ جس مٹی میں اگانے کی اہلیت ہو ۔ یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس؄ سے مروی ہے ۔ البتہ ابو یوسف؁ نے مذکورہ حدیث (علیکم بأرضکم) کی بنا پر (مٹی پر) ریت کا اضافہ فرمایا ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ صعید کے معنی روئے زمین کے ہیں - یعنی زمین کا بالائی حصہ - کیونکہ روئے زمین بلند ہوتا ہے - طیب کے معنی جس طرح مُنبت ہیں اسی طرح طاہر بھی ہیں - اور طہارت والے معنی مقام طہارت و پاکیزگی کے مد نظر زیادہ مناسب اور موزوں ہیں - یا کہا جائے گا کہ طیّب سے مراد اجتماعی طور پر طہارت اور پاکیزگی کے ہیں - (یعنی مٹی کا پاک ہونا اجماعی طور پر ثابت ہے خواہ مُنبت ہو یا نہ ہو - جب مٹی کے منبت ہونے میں بھی طہارت شرط ہے - تو طیب کو طہارت کے معنوں میں استعمال کرنے میں کیا حرج ہے بلکہ یہ تو ایک واضح قرینہ ہے) -

مسئلہ :

امام اعظمؒ کے نزدیک تیمم کرنے کے لیے زمین پر غبار کا ہونا شرط نہیں - (صاف چٹیل اور سنگلاخ زمین پر ہاتھ مارنے سے بھی تیمم درست ہے) کیونکہ آیۃ تیمم مطلق ہے -

مسئلہ :

طرفینؒ کے نزدیک پاک مٹی پر قدرت ہوتے ہوئے بھی غبار سے تیمم کرنا جائز ہے کیونکہ غبار بھی رقیق مٹی کی ایک قسم ہے -

مسئلہ :

تیمم میں نیت فرض ہے - امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ

فرض نہیں کیونکہ تیمم۔وضو کا قائم مقام ہوتا ہے اس لیے وصف میں بھی اُس کے متضاد نہ ہوگا (تو جس طرح وضو میں نیت فرض نہیں اسی طرح اس کے قائم مقام تیمم میں بھی فرض نہ ہوگی)۔

ہماری دلیل یہ ہے۔کہ خود لفظ تیمم ہی لغوی طور پر قصد و ارادہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے نیت کے سوا اس کا تحقق نہ ہوگا۔

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ تیمم کو ایک مخصوص حالت میں پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ بنایا گیا ہے ورنہ جس طرح یہ پانی کے ہوتے ہوئے نماز ادا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا ، اسی طرح نیت کے بغیر بھی طہارت کا ذریعہ نہیں بنے گا) (مذکورہ اصول پر اعتراض کیا گیا ہے کہ پانی بھی تو مخصوص حالت میں ذریعۂ طہارت ہوتا ہے آپ نے وضو میں نیت کو کیوں شرط قرار نہ دیا ؟ صاحب ہدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) پانی تو ذاتی طور پر پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ (لہٰذا وہاں نیت کرنے یا نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ مگر مٹی بنفسہ طہارت کی صلاحیت سے محروم ہے بلکہ اس سے تو آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہذا نیت طہارت شرط قرار دی گئی)۔

مسئلہ :

تیمم کرنے والا اگر طہارت یا نماز کے مباح ہونے کی

نیت کرے تو کافی ہوگا ۔ ازالۂ حدث یا ازالۂ جنابت کی نیت کرنا ضروری نہیں ، یہی صحیح مذھب ہے ۔ (یعنی تیمم کی نیت میں صرف اس قدر ضروری ہے کہ طہارت یا استباحت صلاۃ کی نیت کرے حدث یا جنابت دور کرنے کی نیت کرنا ضروری نہیں ۔

مسئلہ :

اگر کوئی عیسائی مشرف باسلام ہونے کے ارادے سے تیمم کرکے اسلام قبول کر لے تو طرفینؒ کی رائے میں اس کا تیمم درست نہیں ہوگا ۔

امام ابو یوسفؒ کے اصول کے مطابق اس کا تیمم صحیح ہوگا کیونکہ اس نے ایک (عظیم) قربت مقصودہ (یعنی عبادت) کی نیت کی ہے ۔ بخلاف مسجد میں داخل ہونے یا قرآن کریم کو ہاتھ لگانے کی نیت سے تیمم کرنے سے (کہ اس صورت میں تیمم درست نہ ہوگا) کیونکہ یہ قربت مقصودہ نہیں ہے ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مٹی تو صرف اسی صورت میں طہارت کا ذریعہ ہے جب اس سے ایسی عبادۃ مقصودہ کے ادا کرنے کا ارادہ ہو جو بدون طہارت جائز نہیں ہے اور اسلام (لانا) تو ایسی قربت مقصودہ ہے جو اس (طہارۃ) کے بغیر بھی جائز ہے ۔ بخلاف سجدۂ تلاوۃ کے کہ وہ ایسی قربت مقصودہ ہے جسے طہارت کے بغیر ادا کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ :

اگر کافر نے ایسی حالت میں وضو کیا کہ وہ اس کے ذریعے اسلام لانا نہیں چاہتا ۔ پھر وہ اسلام لے آیا تو اس کا وضو درست ہوگا ۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے ۔ اختلاف کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہمارے نزدیک وضو میں نیت شرط نہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک شرط ہے ۔

مسئلہ :

اگر مسلمان تیمم کرے اور نعوذ باللہ مرتد ہو جائے لیکن پھر اسلام لے آئے تو اس کا سابقہ تیمم باقی رہے گا ۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا تیمم باطل ہو جائے گا ۔ کیونکہ کفر تیمم کے منافی ہے ۔ کفر ابتداءً ہو یا انتہاءً دونوں صورتوں میں منافی ہے ۔ جیسا کہ نکاح کی حرمت ہوتی ہے ۔ (ابتداءً اور انتہاءً کا یہ مطلب ہے کہ کافر اگر تیمم کرے تو باطل ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کیونکہ کفر اس کے منافی ہے ۔ اسی طرح مسلمان اگر تیمم کرنے کے بعد العیاذ باللہ کفر اختیار کر لے تو یہ کفر بھی مبطل تیمم ہے جس طرح کہ ابتدائی کفر اس کے منافی تھا اسی طرح نکاح میں ابتدائی اور انتہائی حرمت دونوں یکساں ہوتی ہیں مثلاً جس طرح ابتدائی طور پر ماں اور بیٹی کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اسی طرح انتہاءً بھی حرام ہے ۔

ایک شخص کی دو بیویاں ہیں ۔ ایک کبیرہ اور ایک

صغیرہ ۔ کبیرہ نے صغیرہ کو دودھ پلا دیا تو یہ نکاح باطل ہو گیا یا اپنی خوشدامن سے بدکاری کا ارتکاب کرے تو نکاح باطل ہو جائے گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ تیمم کے بعد (مرتد ہونے پر بھی) اس میں طہارت کی صفت باقی ہے (کیونکہ کافر بھی نہانے دھونے سے پاک صاف ہو سکتا ہے ۔ جب مسلمان تیمم کرنے سے طاہر ہو گیا تو مرتد ہونے کے بعد بھی طہارت والی صفت اس میں موجود رہے گی) کیونکہ عارضۂ کفر جس طرح کہ وضو کی طہارت کے منافی نہیں ہوتا اس طرح طہارت کے بھی منافی نہیں ہوگا ۔ البتہ ابتداءً کافر کا تیمم اس لیے صحیح نہیں ہے کہ کفر کی بنا پر اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا ۔

مسئلہ :

ہر وہ چیز جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس سے تیمم بھی زائل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اس کا قائم مقام اور نائب ہے لہذا اس کے احکام بھی ویسے ہی ہوں گے ۔

مسئلہ :

اگر پانی کے استعمال کی قدرت ہو تو اس کو دیکھ لینے سے بھی تیمم برخواست ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ پانی کی موجودگی سے جسے طهوریۃ تُراب کی غایۃ قرار دیا گیا ہے ۔ مراد قدرت کا حاصل ہونا ہے ۔ (فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً الآیة

میں پانی کی عدم موجودگی تمم کی علت ہے اور یہی مٹی کے پاک کرنے کی غایۃ ہے۔ اگر پانی موجود ہو مگر استعمال پر قدرت نہ ہو تو بھی مٹی کی طہوریۃ باقی ہوگی۔ اور تیمم برقرار رہے گا۔ تو مٹی کی طہوریۃ دو باتوں سے ختم ہوگی۔ پانی کا پایا جانا اور استعمال پر قدرۃ حاصل ہونا)۔

درندے یا دشمن یا پیاس سے خائف شخص بھی حکماً عاجز ہے۔ (اگر جنگل میں سیلاب ہو مگر جنگلی درندوں کا خوف ہو یا پانی تو میل سے کم فاصلے پر ہو لیکن ہو دشمن کے علاقے میں۔ یا اس کے اپنے پاس پانی کی چھاگل ہو مگر خوف ہو کہ اگر اسے وضو میں استعمال کر لیا تو کئی دن تک پینے کا پانی میسر نہ ہوگا۔ تو ایسا شخص پانی سے حکماً عاجز شمار ہوگا۔ امام اعظمؒ کے نزدیک سویا ہوا شخص بھی پانی پر تقدیراً قادر شمار کیا جاتا ہے حتی کہ سونے والا متیمم اگر (سوار ہو کر) پانی کے پاس سے گزرا تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کا تیمم باطل ہو جائے گا۔

پانی سے مراد اتنی مقدار ہے جو وضو کے لیے کافی ہو اس سے کم مقدار کا اعتبار شروع میں بھی نہیں کیا جاتا لہذا آخر میں بھی نہ ہوگا۔ (مثلاً اگر صرف چار پانچ گھونٹ پانی پاس ہو تو بھی تیمم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر چار پانچ گھونٹ پانی بعد میں میسر آ جائے تو بھی اسی طرح ناقض تیمم نہیں جس طرح کہ ابتداء میں اتنی مقدار پانی مانع تیمم نہیں تھی)۔

مسئلہ :

صرف پاک مٹی ہی سے تیمم جائز ہوگا کیونکہ طیب سے مراد پاک ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مٹی پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ پس پانی کی طرح خود اس کا بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ (ورنہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار)۔

مسئلہ :

جس شخص کے پاس پانی موجود نہ ہو لیکن اسے اس کے ملنے کی امید ہو تو اس کے لیے نماز میں آخر وقت تک تأخیر کرنا مستحب ہے۔ اگر پانی مل جائے تو وضو کر لے ورنہ تیمم کر کے نماز ادا کرے۔ (اس تأخیر میں یہ مصلحت ہے) کہ وہ کمال طہارت کے ساتھ نماز کو ادا کر سکے (یعنی وضو اور تیمم دو قسم کی طہارتیں ہیں۔ ان میں وضو اکمل طہارۃ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لیے تأخیر کا فائدہ یہ ہے کہ اسے پانی مل جائے تو اکمل درجہ کی طہارت سے نماز ادا کرنے کے قابل ہوجائے) جیسے کہ امیدوار جماعت (کو آخر وقت تک جماعت کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بھی افضل الادا ہے)۔

اور شیخینؒ سے غیر اصول کی روایۃ یہ ہے کہ نماز میں تاخیر کرنا واجب ہے کیونکہ غالب رائے تیقن کا درجہ رکھتی ہے (گویا اسے یقین ہے کہ پانی ضرور دستیاب ہوگا) اور ظاہر روایت کی وجہ یہ ہے کہ عجز حقیقۃً ثابت ہے۔ اس لیے اس کا حکم اس وقت تک زائل نہ ہوگا جب

تک اس کے برابر یقین نہ ہو (یعنی جب تک پانی ملنے کا صحیح یقین نہ ہو عجز ثابت ہوگا) ۔

[اصحاب حنفیۃ کے مسائل کے تین طبقے ہیں ۔ اول مسائل الاصول جنھیں ظاہر الروایۃ بھی کہا جاتا ہے اور یہ ایسے مسائل ہیں جو اصحاب مذہب ۔ یعنی امام اعظمؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ جنھیں علماء ثلاثہ کہا جاتا ہے سے مروی ہوں ۔

مسائل الاصول ظاہر الروایۃ وہ ہیں جو امام محمد کی مندرجہ ذیل کتابوں میں پائے جاتے ہیں ۔ الجامع الصغیر ، الجامع الکبیر ، زیادات ، مبسوط ، السیر الکبیر ، السیر الصغیر انھیں ظاہر الروایۃ اس لیے کہتے ہیں کہ امام محمدؒ نے انھیں ثقہ راویوں سے بیان کیا ہے ۔

دوم : **مسائل النوادر** ۔ جو ان مذکورہ کتابوں میں منقول نہیں ۔ بلکہ امام محمدؒ کی کیسانیات ۔ ہارونیات ۔ جرجانیات اور رقیات وغیرہ کتب میں مروی ہیں ۔

سوم : **مسائل النوازل** ۔ جو بعد میں مشائخ کرام نے مستنبط کیے ہوں ۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

و کتب ظاہر الروایۃ أتت ستًّا لکُلّ ثابت عَنْهُمْ حَوَتْ

اَلْجَامِعُ الصَّغِیرُ وَالْکَبِیرُ وَ السِّیَرُ الْکَبِیرُ وَ الصَّغِیرُ

کذا لَہٗ مسائل النوادر إسنادها فی الکتب غیر ظاهر

صنفها محمد الشیبانی حرّر فیها المذهب النّعمانی

ثم الزيادات مع المبسوط تواترت مع السند المضبوط
وبعدها مسائل النوازل خرّجها المشائخ بالدلائل

مسئله :

اور تیمم سے جس قدر چاہے فرائض و نوافل ادا کر سکتا ہے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر فرض کے لیے الگ تیمم کرے کیونکہ تیمم طہارت ضروریہ ہے (یعنی تیمم ضرورت کے مد نظر طہارت قرار دیا گیا ہے ۔ جب ایک بار فرض ادا کرنے سے ضرورت رفع ہو گئی تو طہارۃ بھی مرفوع ہو گئی پھر دوسرے فرض کے لیے جدید تیمم کر لے)
ہماری دلیل یہ ہے کہ جب تک پانی میسر نہ ہو تیمم کی طہوریت باقی رہتی ہے لہذا جب تک (پانی نہ ملنے والی) شرط موجود ہے تیمم (وضو کا) عمل کرتا رہے گا ۔

مسئله :

جب جنازہ سامنے آ جائے اور ولی کوئی اور شخص ہو ۔ اور اندیشہ ہو کہ اگر وضو میں مصروف ہوا تو نماز جنازہ جاتی رہے گی ۔ تو تندرست آدمی بھی شہر میں رہتے ہوئے تیمم کر سکتا ہے چونکہ جنازے کی نماز قضاء نہیں پڑھی جاتی اس لیے عجز متحقق ہے ۔

مسئله :

اسی طرح وہ شخص بھی تیمم کر سکتا ہے ۔ جو عید کی نماز پڑھنے جائے اور نماز تیار ہو اسے اندیشہ ہو کہ اگر

وضو میں مشغول ہو گیا تو نماز چھوٹ جائے گی - اس لیے
کہ نمازِ عید لوٹائی نہیں جا سکتی -

صاحب قدوری کا یہ قول کہ ''اَلْوَلِیُّ غَیْرُہٗ'' اس بات
کی طرف اشارہ ہے کہ ولی کے لیے تیمم جائز نہیں (کیونکہ
وہ ولایت کی بناء پر کچھ دیر نماز جنازہ میں تأخیر بھی کرا
سکتا ہے) - امام حسن نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح
روایۃ کیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے کیونکہ ولی کو
نماز کے اعادہ کا حق بھی حاصل ہوتا ہے - لہذا اس کے حق
میں نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں -

مسئلہ :

نماز عید کے دوران اگر امام یا مقتدی بے وضو ہو
جائے تو امام اعظمؒ کی رائے میں وہ تیمم کرکے اسی نماز پر
بنا کر سکتا ہے -

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ تیمم نہیں کر سکتا کیونکہ
لاحق امام کے فارغ ہونے کے بعد بھی نماز ادا کر سکتا
ہے اس لیے اس کے حق میں نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ
نہیں -

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ عید کے دن اژدہام اور
ہجوم کی کثرت ہوتی ہے اس لیے اندیشہ ہے کہ شاید کوئی
ایسا عارضہ پیش آ جائے - جو نماز ہی کو فاسد کر دے
(کیونکہ نماز کے ضائع ہونے کا احتمال موجود ہے) یہ
اختلاف اس صورت میں ہے جب وضو سے نماز کی ابتداء

کرے اگر تیمم کرکے نماز شروع کرے تو بالاتفاق تیمم
کرکے بنا کر سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں اگر ہم
وضو واجب کریں تو گویا اس کی نماز کے دوران پانی
موجود ماننا پڑے گا جس سے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ۔

مسئلہ :

جمعہ کے نماز کے لیے تیمم درست نہیں خواہ وضو
کرنے سے نماز باجماعت کے فوت ہونے ہی کا اندیشہ ہو ۔
اگر (وضو کرنے کے بعد) نماز جمعہ میں شامل ہو سکے تو
ہو جائے ورنہ ظہر کے چار فرض پڑھ لے کیونکہ نماز
جمعہ کا قائم مقام یعنی نماز ظہر موجود ہے ۔ بخلاف عید کے
(کہ اس کا قائم مقام نہیں ہے) ۔

مسئلہ :

اسی طرح اگر وضو کرنے سے نماز کا وقت جاتے رہنے
کا اندیشہ ہو تو بھی تیمم نہ کرے بلکہ وضو کرے اور
فوت شدہ نماز کی قضاء کرے کیونکہ وقتی نمازوں کا قائم
مقام موجود ہے اور وہ ہے قضاء ۔

مسئلہ :

اگر مسافر کو یاد نہ رہے کہ اس کے پاس کجاوے
میں پانی موجود ہے اس نے تیمم کرکے نماز پڑھ لی ۔ بعد میں
اسے پانی یاد آ گیا ۔ تو اس صورت میں طرفینؒ کے نزدیک
وہ اعادہ نماز نہ کرے ۔

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے (کہ وضو کرکے) نماز کا اعادہ کرے۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب پانی اس نے خود رکھا ہو یا اس کے کہنے پر کسی نے رکھا ہو۔ اسے وقت کے اندر یاد آئے یا بعد میں برابر ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ جب پانی اس کے پاس موجود ہے (تو وہ تیمم کیسے کر سکتا ہے) اس کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے وہ اپنے کجاوے میں کپڑا بھول جائے۔ (اور ننگے بدن نماز ادا کرے)۔ بعد میں، کپڑا یاد آنے پر اسے نماز پھر سے پڑھنا ضروری ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ مسافر کا کجاوہ عادةً کھانا پانی رکھنے کی جگہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر تلاش کرنا ضروری تھا۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ علم کے بغیر قدرت کا حصول نہیں ہوتا اور پانی کے موجود ہونے کا مطلب ہی پانی پر قدرت رکھنا ہے اور کجاوے میں پانی پینے کے لیے رکھا جاتا ہے عام استعمال کے لیے نہیں۔ کپڑے والا مسئلہ بھی اسی طرح مختلف فیہ ہے (لہذا آپ کا اسے دلیل بنانا درست نہیں) اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس مسئلے میں سب کا اتفاق ہے (تو بھی آپ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا)۔ کیونکہ ستر کا فرض قائم مقام کے بغیر فوت ہو جاتا ہے اور وضو کا قائم مقام موجود ہوتا ہے اور وہ تیمم ہے۔

مسئلہ :

جب تک تیمم کرنے والے کو پانی کے قریب ہونے کا ظن غالب نہ ہو اس پر پانی کی تلاش ضروری نہیں ۔ کیونکہ جنگلوں اور صحراؤں میں پانی عموماً معدوم ہوتا ہے اور پانی کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے تو گویا پانی پانے والا نہیں ۔

اگر اس کا ظن غالب ہو کہ پانی (قریب ہی کہیں) موجود ہے ۔ تو جب تک تلاش نہ کرے تیمم اس کے لیے جائز نہ ہوگا کیونکہ اس دلیل یعنی غلبۂ ظن کو ملحوظ رکھتے ہوئے گویا پانی اس کے پاس موجود ہے ۔ پانی کی تلاش اتنی دور تک کرے جتنی دور تک تیر جاتا ہے اور میل بھر تلاش کرنا ضروری نہیں ورنہ رفقاءِ سفر سے بچھڑنے کا اندیشہ ہے ۔

مسئلہ :

اگر اس کے ساتھیوں کے پاس پانی ہو تو تیمم کرنے سے پہلے ان سے مانگے کیونکہ لوگ پانی جیسی چیز سے عموماً انکار نہیں کرتے اگر ساتھی پانی دینے سے انکار کریں تو تیمم کر لے کیونکہ اب تو عجز متحقق ہے ۔

مسئلہ :

اگر ساتھیوں سے مانگے بغیر ہی تیمم کر لے تو امام اعظمؒ کی رائے میں تیمم جائز ہے کیونکہ دوسرے

کی ملکیت سے مالگنا ضروری نہیں ۔

صاحبین کہتے ہیں کہ تیمم جائز نہیں ہوگا کیونکہ پانی عادةً خرچ کرنے ہی کے لیے ہوتا ہے ۔

مسئلہ :

اگر اس کا رفیق سفر مناسب قیمت کے بغیر پانی دینے پر راضی نہ ہو اور وضو کرنے والے کے پاس قیمت بھی موجود ہو تو تیمم جائز نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں قدرت حاصل ہے البتہ (عام بھاؤ سے) زیادہ قیمت کا بوجھ برداشت کرنا ضروری نہیں ۔ کیونکہ اس قسم کا ضرر اور نقصان شریعت میں قابل معاف ہے ۔ (اگر پانی مناسب داموں پر نہ ملے ۔ تو تیمم جائز ہوگا) حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے ۔

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْن

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

مسئلہ :

موزوں پر مسح کرنا سنت نبویہ سے ثابت ہے اور اس بارے میں روایات مشہور ہیں۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ جو شخص اسے سنت خیال نہ کرے وہ بدعتی ہے۔ ہاں جو شخص اسے سنت تصور کرے مگر عزیمت اور اصل پر عمل کرتے ہوئے مسح نہ کرے (بلکہ وضو کے وقت پاؤں دھوئے) تو وہ اجر کا مستحق ہوگا (کیونکہ آیۃ قرآنی کے مد نظر اصل تو پاؤں کا دھونا ہے)۔

مسئلہ :

موزوں پر مسح کرنا ہر ایسے حدث کے بعد جائز ہے جو موجب وضو ہو بشرطیکہ ان (موزوں) کو مکمل طہارت کے بعد پہنا ہو اور پھر اس کو حدث لاحق ہو۔

امام قدوری نے ''حدث موجب لِلْوُضُوْءِ'' کی قید اس لیے لگائی ہے کہ جنابت کے بعد مسح جائز نہیں ہوتا۔ ہم اس مسئلے کو ان شاء اللہ تعالیٰ بالتفصیل بیان کریں گے۔

کے بعد'' کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ موزے
نع حدث ہیں اور اگر حدث سابق کی وجہ سے ہم مسح
کو جائز قرار دیں .. جیسے مستحاضہ جب سیلان استحاضہ کے
وقت موزے پہنے پھر وقت نکل جائے۔ یا تیمم کرنے والا جب
موزے پہنے تو اسے پانی دکھائی دے تو یہ موزے رافع
حدث ہوں گے (یعنی موزے رافع حدث نہیں بلکہ مانع
لسراية الحدث ہیں ۔ اس لیے اگر حدث سابق کی بنا پر بھی
مسح جائز قرار دیں ۔ تو خُفَّین کو رافع حدث ماننا پڑے گا۔
حالانکہ یہ صحیح نہیں) ۔

اور امام قدوریؒ کا یہ کہنا کہ ''کامل طہارت پر
پہنے جائیں'' اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موزے پہنتے
وقت طہارت کا مکمل ہونا شرط ہے ۔ بلکہ حدث پیش
آنے کے بعد طہارت کا مکمل ہونا ضروری ہے
حنفیہ کا یہی موقف ہے حتی کہ اگر کسی شخص نے
پاؤں پہلے دھو کر موزے پہن لے اور بعد میں طہارت کو
مکمل کیا ۔ پھر بے وضو ہوا تو اسے موزوں پر مسح جائز
ہے ۔ (کیونکہ حدث کے وقت طہارت مکمل تھی) اور
موزے پاؤں میں حدث کے سرایت کرنے سے مانع ہیں ۔ اس
لیے منع کے وقت ہی کمال طہارت کا لحاظ ہوگا حتی کہ اگر
اس وقت طہارت ناقص ہو (اور مسح جائز قرار دیا جائے)
تو موزہ کو رافع حدث ماننا پڑتا ہے (اور یہ درست نہیں
کیونکہ موزے رافع حدث نہیں بلکہ سرایت حدث کو مانع
ہوتے ہیں) ۔

مسئلہ :

مقیم شخص ایک دن رات موزوں پر مسح کر سکتا ہے اور مسافر تین دن رات تک ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مقیم ایک دن رات تک مسح کرے اور مسافر تین دن رات'' ۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مسح کی ابتداء حدث کے بعد سے شروع ہوگی کیونکہ موزے سرایت حدث کو مانع ہیں ۔ اس لیے مدت مسح کا اعتبار منع کے وقت سے ہوگا ۔

مسئلہ :

موزوں پر مسح کرنے کا یہ طریق ہے کہ موزوں کے ظاہری حصے پر ہاتھ کی انگلیوں سے خطوط کھینچتے ہوئے پاؤں کی انگلیوں سے شروع کرکے پنڈلیوں کی طرف لے آئے ۔ اس کی تائید مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ موزوں پر رکھے اور پاؤں کی انگلیوں کی طرف سے انہیں ایک بار اوپر کی طرف کھینچا ۔ گویا کہ ابھی تک مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موزوں پر مسح کا اثر انگلیوں کے خطوط کی صورت میں دکھائی دے رہا ہے ۔

مسئلہ :

موزوں کے بالائی حصہ پر مسح ضروری ہے۔ صرف نچلے حصے یا ایڑی یا پنڈلی پر اکتفاء کرنا جائز نہیں کیونکہ موزوں کا مسح ہی خلاف قیاس ہے اس لیے شرعی حدود کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ دھونا جو کہ اصل کی حیثیت رکھتا ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مسح کی ابتداء انگلیوں کی طرف سے کرنا مستحب ہے۔

مسئلہ :

مسح میں فرض ہاتھ کی تین انگلیوں کی مقدار ہے۔ امام کرخیؒ کے نزدیک پاؤں کی تین انگلیوں کی مقدار کے برابر فرض ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ آلۂ مسح (یعنی ہاتھ) کا اعتبار کرنا زیادہ مناسب امر ہے۔

مسئلہ :

اس موزے پر مسح جائز نہیں جس میں اتنا بڑا شگاف ہو جس سے پاؤں کی تین انگلیوں کی مقدار پاؤں نظر آ رہا ہو اگر مذکورہ مقدار سے کم ہو تو جائز ہے۔

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے شگاف اگرچہ قلیل ہی ہو مسح جائز نہ ہوگا کیونکہ جب ظاہر ہونے والے حصے کا دھونا ضروری ہے تو باقی کا دھونا بھی اسی طرح ضروری ہوگا۔ (غسل اور مسح جمع نہیں ہو سکتے)

ہماری دلیل یہ ہے کہ موزوں پر عموماً چھوٹا موٹا شگاف تو ہوتا ہی ہے اس لیے بار بار اتارنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن کثیر شگاف اکثر نہیں ہوتا اس لیے اس صورت میں اتارنے سے کوئی حرج نہیں۔ کثیر سے مراد یہ ہے کہ ہاتھ کی تین چھوٹی انگلیوں کے برابر پھٹ جائے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ قدم میں انگلیاں اصل کی حقیقت رکھتی ہیں۔ (کتاب الدیات میں مذکور ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاؤں کی انگلیاں کاٹ دے تو پوری دیت دینا پڑے گی) اور تین ان کا اکثر حصہ ہیں۔ اس لیے یہ کل کے قائم مقام ہوں گی۔ پاؤں کی چھوٹی انگلیوں کا اعتبار احتیاط کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اگر چلتے ہوئے موزہ نہ کھلے تو ہاتھ کی انگلیاں موزے میں ڈالنے کا اعتبار نہ ہوگا۔ اور پھٹن کی اس مقدار کا ہر موزے میں الگ الگ اعتبار ہوگا۔ ایک موزے کے شگافوں کو تو اکٹھا کر لیا جائے گا مگر دو موزوں کے شگافوں کو جمع نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایک موزہ کی پھٹن دوسرے موزے سے سفر کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ بخلاف (کپڑے پر) متفرق نجاست کے کہ وہ شخص پوری نجاست کا حامل کہلاتا ہے اور ستر کا کھلنا بھی متفرق نجاست کی طرح ہے۔

مسئلہ :

جس شخص پر غسل واجب ہو اس کے لیے مسح جائز نہیں اس کی دلیل صفوان بن عسال رض کی بیان کی ہوئی حدیث ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سفر کی حالت میں فرمایا کرتے تھے کہ اپنے موزے تین دن رات تک نہ

اتاریں ہاں اگر جنابت کا عارضہ لاحق ہو (تو اتارنے ضروری ہیں) ۔ البتہ اگر پیشاب یا پاخانہ یا نیند آ جائے تو مسح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ نیز جنابت چونکہ بار بار پیش نہیں آتی اس لیے موزے اتارنے میں کوئی خاص حرج نہیں ۔ مگر حدث میں تکرار ہوتا رہتا ہے (اور بار بار اتارنے میں حرج ہے) ۔

مسئلہ :

ہر وہ چیز جو وضو کو زائل کر دیتی ہے مسح کو بھی زائل کر دیتی ہے کیونکہ مسح بھی وضو ہی کا ایک حصہ ہے ۔

مسئلہ :

موزے کا اتر جانا بھی نقض مسح کا سبب ہے کیونکہ مانع زائل ہو جانے کی بنا پر حدث قدم میں سرایت کر جاتا ہے ۔ اسی طرح ایک موزے کے اترنے سے بھی مسح باطل ہو جائے گا کیونکہ غسل اور مسح کا ایک ہی جگہ جمع کرنا صحیح نہیں ہوتا ۔

مسئلہ :

مدت مسح گزر جانے سے بھی مسح باطل ہو جاتا ہے ۔ اس کے بارے میں حدیث پہلے بیان کی جا چکی ہے (کہ مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن رات مسح کرے) ۔

مسئلہ :

جب مسح کی مدت پوری ہو جائے تو موزے اتار کر پاؤں دھوئے اور نماز ادا کرے باقی وضو کا اعادہ ضروری نہیں۔ اگر تکمیل مدت سے پہلے ہی موزے اتار دے تو بھی، کیونکہ موزے اتارنے سے حدث سابق قدموں کی طرف سرایت کر جاتا ہے گویا کہ اس نے پاؤں دھوئے ہی نہ تھے۔ پاؤں کے ساقِ موزہ تک نکل جانے سے "اترنا" سمجھا جائے گا۔ کیونکہ مسح میں پنڈلی کا اعتبار نہیں ہوتا۔ یہی حکم اکثر حصۂ قدم کے پنڈلی کے حصے میں آ جانے کا ہوگا، اور یہی صحیح ہے۔

مسئلہ :

اگر کسی شخص نے مقیم ہونے کی حالت میں مسح شروع کیا پھر دن رات پورا ہونے سے پہلے اس نے سفر اختیار کیا تو وہ تین دن رات مسح کرے کیونکہ حدیث مطلق ہے اس لیے اطلاق پر عمل کیا جائے گا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ مسح کا حکم وقت سے متعلق ہے۔ اس لیے اس میں آخری وقت کا اعتبار کیا جائے گا۔ بخلاف اس کے کہ مدت اقامت مکمل کرے۔ پھر سفر اختیار کرے (اس طرح مسح جائز نہ ہوگا) کیونکہ تکمیل مدت کے بعد حدث قدم میں سرایت کر جاتا ہے اور موزہ رافع حدث نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)

مسئلہ :

اگر موزے پر مسح کرنے والا مسافر ایک دن رات پورا کر چکنے کے بعد اقامت اختیار کر لے تو موزے اتار دے کیونکہ اس کے بغیر سفر کی رخصت نہیں رہتی ۔ اگر مدت اقامت مکمل نہ ہوئی ہو تو پوری کر لے کیونکہ مقیم ہونے کی حالت میں یہی مدت اقامت ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص موزوں پر جرموق پہنے وہ اس پر مسح کرے (اور یہ جرموق ہی ایک قسم کا موزہ ہے جو موزے کو مٹی اور کیچڑ وغیرہ سے بچانے کے لیے اس کے اوپر پہنا جاتا ہے اور ہماری زبان میں اسے پائتابہ کہتے ہیں ۔

امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ بدل کا بدل نہیں ہوا کرتا (کیونکہ موزہ پہلے ہی پاؤں کا بدل ہے اور جرموق موزے کا بدل ہو گیا ۔ بدل کا اعتبار تو ہوتا ہے لیکن بدل البدل قابل اعتبار نہیں) ہماری تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جرموقین پر مسح فرمایا ۔ نیز جرموق غرض و استعمال کے لحاظ سے موزے کے تابع ہوتا ہے گویا کہ اس نے دو تہوں والے موزے پہن رکھے ہوں علاوہ ازیں جرموق پاؤں کا بدل ہوتا ہے موزے کا نہیں ۔

بخلاف اس کے جرموق حدث پیش آنے کے بعد پہنے جائیں ۔ (اس صورت میں ان پر مسح جائز نہیں) کیونکہ

حدث موزوں پر طاری ہو چکا ہے اور ان سے منتقل ہو کر کہیں دوسرے کی طرف نہیں جا سکتا ۔ (یعنی جو حدث موزوں پر طاری ہوا ہے اس کا ازالہ موزوں پر مسح ہی سے ہو سکتا ہے) ۔

اگر جرموق کپاس کے بنے ہوئے ہوں تو ان پر مسح جائز نہیں کیونکہ وہ پاؤں کا بدل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ البتہ اگر مسح کی تری ان سے گزر کر موزوں تک پہنچ جائے تو جائز ہے ۔

مسئلہ :

امام اعظمؒ کے نزدیک جرابوں پر مسح جائز نہیں ہاں اگر مجلد ہوں یا منعل (تو جائز ہے) صاحبینؒ فرماتے ہیں ۔ کہ اگر پتلی نہ ہوں بلکہ گاڑھی ہوں تو ان پر مسح جائز ہے ۔ آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے جورابوں پر پر مسح فرمایا ۔ نیز گاڑھی ہونے کی صورت میں انہیں پہن کر چلنا ممکن ہوتا ہے ۔ یعنی باندھے بغیر پنڈلی پر رک سکتی ہیں ۔ اس لیے موزوں کے مشابہ ہوں گی ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ جَوْرَبَیْن موزوں کی حیثیت نہیں رکھتیں کیونکہ انہیں پہن کر دور تک چلنا تاوقتیکہ منعل نہ ہوں ممکن نہیں ہوتا ۔ حدیث بھی انہیں معنوں پر محمول ہے (کہ آنحضرت ﷺ نے جن جَوْرَبَیْن پر مسح فرمایا وہ منعل تھیں) ایک روایت کے مطابق امام اعظمؒ نے بھی

صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع فرما لیا تھا اور اسی پر فتوی ہے ۔

مسئلہ :

پگڑی ، ٹوپی ، برقع اور دستانوں پر مسح جائز نہیں ۔ کیونکہ ان چیزوں کے اتارنے میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی اور مسح کی اجازت تو تکلیف کے ازالے کے لیے ہے ۔

مسئلہ :

اور پٹی پر مسح جائز ہے خواہ وہ غیر وضو ہی کی حالت میں باندھی گئی ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خود بھی اسی طرح کیا اور حضرت علیؓ کو بھی ایسا ہی کرنے کو فرمایا ۔ نیز پٹی کے کھولنے میں موزے کے اتارنے کی بنسبت کہیں زیادہ حرج ہے ۔ لہذا یہاں مسح بھی بدرجۂ اولی مشروع ہوگا ۔

امام حسنؒ نے بیان کیا ہے کہ پٹی کے اکثر حصہ پر مسح کرنا کافی ہوگا ۔ پٹی پر مسح کی کوئی مدت مقرر نہیں کیونکہ شریعت نے مدت کا تعین نہیں کیا (جب تک زخم وغیرہ مندمل نہ ہو مسح جائز ہوگا) ۔

مسئلہ :

اگر مندمل ہوئے بغیر ہی پٹی کھل جائے تو مسح باطل نہ ہوگا کیونکہ عذر باقی ہے پٹی پر مسح کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کے نچلے حصۂ بدن کو دھونا ۔

مسئله :

اگر اچھا ہونے کے بعد پٹی گر جائے تو مسح باطل ہوگا کیونکہ عذر زائل ہو چکا ہے۔ اگر نماز کے دوران ایسا واقع پیش آئے تو نماز از سر نو شروع کرے کیونکہ بدل سے مقصود حاصل ہونے سے پہلے ہی اسے اصل پر قدرت حاصل ہو گئی۔

بابُ الحَيضِ وَ الاستَحاضَةِ

حیض اور استحاضے کا بیان

مسئلہ :

حیض کی کم از کم مدت تین دن رات ہے جو (خون) اس مدت سے کم ہو وہ استحاضہ کہلاتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ غیر شادی شدہ اور شادی شدہ دونوں کے حیض کی کم از کم مدت تین دن رات ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن۔ یہ حدیث امام شافعیؒ پر حجت ہے کہ وہ کم از کم مدت کا ایک دن رات سے اندازہ کرتے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ کم از کم مدت دو دن پورے اور تیسرے دن کا اکثر حصہ ہے کیونکہ اکثر (حصہ) کل کا قائم مقام ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ تو مقدار شرعی میں کمی کرنے کے مترادف ہے (اور بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شرعی امور میں قطع و برید کرے)۔

مسئلہ :

حیض کے زیادہ سے زیادہ دس دن ہوتے ہیں۔ اس مدت

سے زیادہ استحاضہ ہوگا۔ اس کی تائید میں ہم حدیث پیش کر چکے ہیں۔ یہی حدیث (زیادہ سے زیادہ مدت کے سلسلے میں بھی) امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے کیونکہ وہ اکثر مدت پندرہ دن مقرر فرماتے ہیں۔

اقل اور اکثر مدت سے کم یا زیادہ استحاضہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ شرع کی تعیین دوسری چیز کے الحاق کو روا نہیں رکھتی (کہ تین روز سے کم یا دس روز سے زیادہ بھی حیض کے ساتھ ہی ملحق کیا جائے)۔

مسئلہ :

ان ایام میں عورت جس رنگ کا خون بھی دیکھے سرخ ، زرد یا گدلا سب حیض شمار ہوگا حتی کہ خالص سفید رطوبت آنے لگے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔ مٹیالہ پن اگر خون کے بعد ہو تو حیض ہوگا ورنہ نہیں کیونکہ اگر میلے پن کا تعلق رحم سے تسلیم کیا جائے تو گدلا خون صاف خون کے بعد آنا چاہیے۔

طرفینؒ کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے۔ آپ نے خالص سفید کے علاوہ سب رنگوں کو حیض سے شمار فرمایا اور ان چیزوں کا تعلق سماع سے ہے۔ نیز رحم (پیٹ میں الٹا ہوتا ہے جس سے اولاً گدلا خون ہی آنا چاہیے جیسے اگر گھڑے کے پیندے میں سوراخ کر دیا جائے (تو مٹی سے ملا ہوا پانی پہلے خارج ہوگا) سبز رنگ کا خون

صحیح تحقیق کے مطابق حیض ہی شمار ہوگا بشرطیکہ عورت ذَوَاتُ الْحَیْض سے ہو اور خون کا یہ رنگ فساد غذاء پر محمول ہوگا ۔

عورت اگر عمر رسیدہ ہو (مثلاً اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی ہو تو بڑھاپے کے اس دور میں حیض نہیں آیا کرتا ایسی عورت کو آئسہ کہا جاتا ہے) اور اسے صرف سبز رنگ کا خون آیا ہو تو اسے خرابیٔ رحم پر محمول کیا جائے گا اور حیض میں شمار نہیں کیا جائے گا (کیونکہ خون کا رنگ اصل میں سبز نہیں ہوا کرتا) ۔

مسئلہ :

حیض کی بناء پر عورت سے نماز ساکت ہو جاتی ہے اور روزہ رکھنا حرام ہوتا ہے ۔ البتہ اس کے ذمے روزوں کی قضاء ہوگی نمازوں کی نہیں ۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رض کا قول ہے کہ زمانۂ نبوی میں ہم میں سے کوئی عورت جب حیض سے پاک ہوتی تو روزوں کی قضاء کرتی لیکن نمازوں کی قضاء نہیں کی جاتی تھی ۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ نمازوں کی کثرت کی وجہ سے قضاء میں دقت پیش آتی ہے ۔ (کیونکہ یہ عارضہ ہر ماہ لاحق ہوتا ہے) مگر روزوں کی قضاء میں کوئی دقت نہیں (کہ وہ تو سال میں ایک بار آتے ہیں اور چند معدود دن ہوتے ہیں) ۔

مسئلہ :

حائضہ عورت اور اسی طرح جُنُبی کا مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے ۔ ارشاد نبوی ہے کہ ''میں حائضہ عورت اور جنبی آدمی کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا'' ۔ یہ حدیث مطلق ہونے کی بنا پر امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے کیونکہ وہ حائضہ اور جنبی کے مسجد میں عبور یا مرور کے طور پر داخل ہونے کو جائز کہتے ہیں ۔

مسئلہ :

حائضہ عورت کے لیے خانۂ کعبہ کا طواف بھی جائز نہیں کیونکہ طواف مسجد میں ہوتا ہے (اور حائضہ کا داخلہ ممنوع ہے) ۔

مسئلہ :

حائضہ عورت کے ساتھ خاوند کو مباشرت کرنا بھی جائز نہیں ۔ ارشاد ربانی ہے ''وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ'' یعنی جب تک تمھاری بیویاں حیض سے پاک نہ ہوں ان سے مقاربت نہ کرو ۔

مسئلہ :

حائضہ عورت ۔ جُنُبی آدمی اور نفاس والی عورت کے لیے تلاوتِ قرآن کریم ممنوع ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''حائضہ اور جنبی قرآن کریم کی

تلاوت نہ کریں"۔ یہ حدیث امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے کہ وہ حائضہ کے لیے قرآءۃِ قرآن کریم کو جائز کہتے ہیں۔ نیز یہ حدیث اپنے اطلاق اور عموم کی بنا پر ایک آیت سے کم حصے کو بھی شامل ہے۔ اس لیے امام طحاویؒ پر بھی حجت ہوگی کہ وہ آیت سے کم پڑھنے کو مباح کہتے ہیں۔

مسئلہ:

اور ان کے لیے غلاف کے بغیر قرآن کریم کا چھونا بھی جائز نہیں نہ ایسے سکے ہی کو ہاتھ میں لینا جائز ہے جس پر قرآن کریم کی کوئی آیت کندہ ہو۔ البتہ تھیلی کے ساتھ جائز ہے۔ اسی طرح بے وضو آدمی بھی غلاف کے بغیر قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "پاک شخص کے علاوہ کوئی بھی قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگائے"۔

حدث اور جنابت دونوں کا تعلق چونکہ ہاتھوں سے بھی ہوتا ہے اس لیے چھونے کے حکم میں دونوں برابر ہیں۔ لیکن جنابت کا تعلق منہ سے بھی ہوتا ہے۔ (مگر حدث کا تعلق منہ سے نہیں ہوتا) اس لیے قراءۃ کا حکم الگ الگ ہوگا۔ (یعنی بے وضو شخص زبانی تلاوت کر سکتا ہے مگر جنبی کو اس کی اجازت نہیں۔

غلاف سے مراد وہ کپڑا ہے جو قرآن کریم سے علیحدہ ہو۔ وہ کپڑا مراد نہیں جو کتاب کے ساتھ متصل ہوتا ہے

جیسے شیرازہ بندی کی ہوئی جلد - یہی صحیح ہے -

صحیح قول کے مطابق (قرآن کریم کو) آستین سے چھونا بھی مکروہ ہے کیونکہ آستین تو چھونے والے کے تابع ہوتی ہے - بخلاف دینی کتابوں کے کہ ان کو استعمال کرنے والوں کے لیے آستین سے چھونے کی رخصت ہے اس لیے کہ اہل علم حضرات کو ان کتابوں کو ہاتھ لگانے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے -

بچوں کے ہاتھ میں قرآن کریم دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں رکاوٹ حفظ قرآن کے ضائع کرنے کا سبب ہوگی اور انہیں طہارت کا پابند بنانے میں حرج ہے یہی صحیح ہے (البتہ اتنی احتیاط ضروری ہے کہ پیشاب وغیرہ کے بعد استنجا کر لیں اور منہ ہاتھ دھو لیں) -

مسئلہ :

اگر دس دن سے کم مدت میں حیض منقطع ہو جائے تو بھی عورت کے ساتھ مباشرت جائز نہ ہوگی تاوقتیکہ غسل نہ کر لے کیونکہ خون کبھی جاری ہو جاتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے - اس لیے غسل ضروری ہے تاکہ خون کے انقطاع کی جانب کو ترجیح حاصل ہو جائے -

مسئلہ :

مذکورہ صورت میں اگر عورت نے غسل نہ کیا لیکن نماز کا ادنی وقت گزر گیا جس میں کہ وہ غسل کرکے

تکبیر تحریمہ کہہ سکتی تھی ۔ تو اس سے مباشرت جائز ہوگی کیونکہ نماز اس کے ذمے فرض بن چکی ہے ۔ اس لیے حکماً اسے پاک تسلیم کیا جائے گا ۔

مسئلہ :

اگر حیض کا خون اس کی عادت سے کم مگر تین دن سے زیادہ مدت میں بند ہو جائے ۔ تو اس سے مباشرت جائز نہیں جب تک کہ معتاد مدت پوری نہ ہو جائے ، چاہے غسل بھی کر لے کیونکہ معتاد مدت کے اندر حیض کے دوبارہ جاری ہونے کا غالب احتمال ہوتا ہے لہذا مباشرت سے احتراز کرنے میں زیادہ احتیاط ہے ۔

مسئلہ :

اگر خون دس دن کے بعد منقطع ہو ۔ تو غسل سے پہلے بھی مباشرت جائز ہے کیونکہ حیض دس دن سے زیادہ نہیں ہوا کرتا البتہ غسل سے پہلے مباشرت کرنا مستحب اور مستحسن امر نہیں ۔ کیونکہ قراءۃ تشدید کے مطابق ممانعت موجود ہے ولا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطَّهَّرْنَ جب تک کہ خوب پاک نہ ہو جائیں ۔ نظافت و پاکیزگی کا کمال غسل ہی ہے ۔

مسئلہ :

مدت حیض میں جو طُہر دو خونوں کے درمیان آ جاتا

ہے وہ حیض ہی شمار ہوگا ۔ (یعنی طہر کا زمانہ بھی مسلسل خون کی طرح شمار ہوگا) ۔

مصنف فرماتے ہیں امام اعظمؒ سے بھی ایک روایت ایسے ہی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت حیض میں خون کا متواتر آنا بالاجماع شرط نہیں ۔ اس لیے اول اور آخر کا اعتبار ہوگا ۔ جیسا کہ نصاب زکاۃ میں ہوتا ہے (اگر سال کے ابتداء اور آخر میں نصاب زکاۃ موجود ہو تو زکاۃ واجب ہوگی خواہ درمیانی عرصے میں سارا سرمایہ جاتا رہے) ۔

امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے اور یہ بات انہوں نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے ۔ بلکہ کہا جاتا ہے ۔ امام اعظمؒ کا اس سلسلے میں یہ آخری قول ہے کہ طہر اگر پندرہ دن سے کم ہو تو فاصل نہیں ہوگا بلکہ متواتر خون ہی شمار ہوگا کیونکہ یہ طہر فاسد ہے اس لئے مسلسل خون کے حکم ہی میں شمار ہوگا ۔ اس قول کو قابل عمل بنانے میں بڑی سہولت ہے ۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل امام محمدؒ کی کتاب المبسوط کے باب الحیض میں ہے ۔

مسئلہ :

طُہر کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے ۔ امام ابراہیم النخعیؒ سے اسی طرح منقول ہے یہ مسائل صرف توقیفی طور پر ہی معلوم ہو سکتے ہیں (قیاس کو ان میں کوئی دخل نہیں) ۔

مسئلہ :

طہر کی اکثر مدت کی کوئی تعیین نہیں ۔ کیونکہ بعض دفعہ سال دو سال تک بھی ممتد ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مدت کی تعیین نہیں کی جا سکتی ، ہاں اگر خون ہمیشہ جاری رہے تو عادت پر اس کا دار و مدار کیا جائے گا ۔ امام محمدؒ کی کتاب الحیض سے ان احکام کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے ۔

مسئلہ :

نکسیر کی طرح استحاضہ کا خون بھی روزے اور نماز اور مباشرت سے مانع نہیں ہوتا ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ بنت جحش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا : ''وضو کرکے نماز پڑھ لیا کرو خواہ خون کے قطرے چٹائی پر ٹپکتے رہیں ۔'' نماز کا حکم تو حدیث سے واضح ہو گیا اور روزے اور مباشرت کے احکام اجماع سے ۔

مسئلہ :

خون اگر دس روز سے بڑھ جائے حالانکہ اس کی مقررہ عادت اس سے کم تھی تو اس کی مقررہ مدت تک حیض شمار ہوگا اور جو زائد ہو وہ استحاضہ ہوگا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مستحاضہ مدت حیض تک نماز چھوڑے رکھے'' ۔ نیز معتاد مدت سے زائد عرصہ ایسا ہی ہوگا جیسے دس دن سے زائد ہوتا ہے اس لیے یہ اسی (دس دن سے زائد) کے ساتھ ملحق ہوگا ۔

مسئلہ :

اگر کوئی لڑکی بالغ ہونے کے ساتھ ہی استحاضہ میں مبتلا ہو جائے تو ہر ماہ میں حیض کے دس دن شمار ہوں گے اور باقی استحاضہ، کیونکہ دس روز تو یقینی طور پر حیض کے ہیں۔ اس لیے شک کی بنا پر ان دونوں کو حیض سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی أَعْلَم۔

فصل

مستحاضہ اور معذور لوگوں کا بیان

مسئلہ :

جو عورت استحاضہ میں مبتلا ہو ۔ یا کسی کو ہر وقت پیشاب جاری رہنے کی شکایت جاری ہو یا دائمی نکسیر کا عارضہ لاحق ہو یا ایسا زخم ہو جو ہر وقت رستا رہتا ہو تو ایسے لوگ ہر نماز کے وقت وضو کر لیا کریں ۔ اس وضو سے جتنے فرائض و نوافل چاہیں ادا کر سکتے ہیں ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مستحاضہ ہر فرض نماز کے لیے وضو کرے کیونکہ ارشاد نبوی ہے کہ "مستحاضہ ہر نماز کے لیے وضو کرے" ۔ نیز اس کی طہارت کا اعتبار مفروضہ نماز کی ادائیگی کی ضرورت کے مدنظر ہوتا ہے ۔ لیکن فرض نماز ادا کرنے کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

ہماری دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا یہ ارشاد ہے کہ "مستحاضہ ہر نماز کے وقت وضو کیا کرے" امام شافعیؒ کی روایت کردہ حدیث کا بھی یہی مطلب ہے ۔ نیز لام وقت کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: أتیکَ لِصَلٰوۃِ الظُّہرِ اَیْ وَقْتَ صَلٰوۃِ الظُّہر ۔ نیز وقت کو

سہولت کے پیش نظر ادا کا قائم مقام بنایا گیا ہے ۔ اس لیے
حکم کا دار و مدار وقت پر ہی ہوگا ۔ (یعنی امام شافعیؒ کا
یہ فرمانا کہ مناف کے ساتھ طہارت کا اعتبار ضرورت کے تحت
ہوتا ہے اور ایک مکتوبہ نماز کے ادا کرنے سے ضرورت رفع
ہو جاتی ہے اس لیے وضو ختم ہو جاتا ہے ۔ تو ان کے اس
اصول میں سہولت کا پہلو مفقود ہے ۔ مثلاً ایک معذور
صاحب ترتیب کی چار نمازیں قضاء ہو گئیں اور وہ ان کی
قضاء کرنا چاہے پھر آپ کے اصول کے مطابق ہر قضاء کے لیے
وہ الگ وضو کرے تو اس میں اسے دقت کا سامنا کرنا ہوگا
سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے وقت کو ادا کا
قائم مقام بنا دیا کہ ایک نماز کا وقت گزر جانے پر وضو
باطل ہوگا تاکہ اس وقت میں جس قدر فرائض و نوافل چاہے
ادا کر سکے ۔ لہذا وضو کے باقی رہنے یا باطل ہونے کے
حکم کا دار و مدار وقت پر ہوگا) ۔

مسئلہ :

اور جب یہ وقت گزر جائے تو ان کا وضو باطل ہو جائے
گا وہ دوسری نماز کے لیے نیا وضو کریں ۔ یہ اصحاب ثلاثہ
کا مسلک ہے ، امام زفر فرماتے ہیں کہ جب دوسری نماز کا
وقت آئے تو نیا وضو کریں ۔

مسئلہ :

اگر یہ معذور لوگ آفتاب طلوع ہونے پر وضو کریں
تو ظہر کا وقت ختم ہونے تک ان کا وضو باقی رہے گا ۔ یہ

طرفین کا مؤقف ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور زفرؒ کے نزدیک ظہر کا وقت آنے تک وضو باقی رہے گا۔ اس اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ طرفینؒ کے نزدیک معذور کا وضو وقت ختم ہوتے ہی حدثِ سابق کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے اور امام زفرؒ کے نزدیک دوسری نماز کا وقت داخل ہوتے ہی وضو ختم ہو جاتا ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں سببوں میں سے کسی ایک سبب سے بھی باطل ہو جاتا ہے۔ (خواہ پہلی نماز کا وقت ختم ہو یا دوسری کا شروع ہو)۔

اختلاف کا فائدہ صرف اس صورت میں ظاہر ہوگا جب زوال سے پہلے وضو کرے یا طلوع آفتاب سے قبل۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ منافی طہارت امر کے باوجود طہارت کا اعتبار کرنا نماز ادا کرنے کی ضرورت کے مدنظر ہوتا ہے لیکن وقت سے پہلے ضرورت نہیں ہوتی لہذا طہارت کا اعتبار نہ ہوگا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ضرورت کا انحصار وقت پر ہوتا ہے۔ (یعنی ضرورت، وقت کے اندر محدود رہتی ہے)۔ لہذا نہ تو قبل از وقت ضرورت کا اعتبار کیا جائے گا نہ بعد از وقت۔

امام اعظمؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقت سے پہلے وضو کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ وقت شروع ہوتے ہی معذور نماز پر قادر ہو سکے۔ لیکن وقت کا نکل جانا تو ضرورت کے زائل ہونے کی دلیل ہے لہذا وقت کے ختم ہونے پر ہی حدث کا اعتبار ہوگا۔

وقت سے مراد وقتِ فرض ہے۔ حتی کہ اگر کسی معذور نے نماز عید کے لیے وضو کیا۔ تو طرفین ؒ کے نزدیک اس وضو سے نماز ظہر ادا کرنا جائز ہوگا۔ یہی صحیح ہے کیونکہ نماز عید نمازِ چاشت کی طرح فرض نہیں۔

اگر نماز ظہر کے لیے ظہر کے وقت میں وضو کیا پھر ظہر کے وقت ہی میں عصر کے لیے وضو کر لیا تو طرفین ؒ کے نزدیک اس وضو سے عصر ادا کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ فرض نماز کا وقت ختم ہونے سے طہارت نہیں رہے گی۔ مستحاضہ وہ عورت ہے جس پر کسی نماز کا وقت ایسا نہ گزرے کہ جس عارضے میں وہ مبتلا ہے اس کو پیش نہ آئے اور یہی ہر اس معذور کا حکم ہے جو مستحاضہ کے ذیل میں داخل ہے جن کا ذکر ہم نے کیا۔ یا وہ جس کو پیچش وغیرہ کا عارضہ لاحق ہو یا ریاحی مرض میں مبتلا ہو یہ سب (معذور ہیں) کیونکہ ان صورتوں میں ضرورت متحقق ہے اور یہ سب صورتوں کو شامل ہے۔

———

فَصلٌ فی النّفَاس

نفاس کا بیان

مسئلہ :

نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو بچے کی پیدائش کے بعد خارج ہوتا ہے کیونکہ یہ لفظ ''تَنَفَّسَ الرَّحْمُ بالدَّم'' سے لیا گیا ہے یَا خُرُوجُ النَّفْس سے ماخوذ ہے۔ نفس کے معنی بچہ یا خون ہے۔

مسئلہ :

حاملہ عورت اگر مدت حمل میں یا بوقت ولادت بچہ برآمد ہونے سے پہلے خون دیکھے تو وہ استحاضہ ہوگا اگر ممتد ہو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نفاس پر قیاس کرتے ہوئے یہ خون حیض کا ہوگا کیونکہ دونوں رحم ہی سے خارج ہوتے ہیں۔ (اس کی تفصیل یہ ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آپ اسے حیض قرار نہیں دیتے کہ حاملہ عورت کو حیض نہیں آتا۔ مگر بتائیے کہ جب ایک عورت کے دو بچے پیدا ہوں تو نفاس آپ پہلے بچے کی پیدائش سے شمار کرتے

ہیں حالانکہ پیٹ میں دوسرا بچہ ابھی تک موجود ہے - پھر
جب بچے کے رحم میں ہونے کے باوجود آپ نفاس کا حکم
دے سکتے ہیں - تو حاملہ ہونے کی صورت میں اگر خون
کو حیض شمار کیا جائے تو کیا حرج ہے - آخر حیض اور
نفاس دونوں کا منبع رحم ہی تو ہے -

ہماری دلیل یہ ہے کہ حمل قرار پانے سے رحم کا
منہ بند ہو جاتا ہے (اور رحم والا خون بچے کی غذائیت میں
تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا زمانۂ حمل میں حیض آنے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا) اور نفاس کا خون بچہ کی پیدائش کے
باعث رحم کا منہ کھلنے کی وجہ سے آتا ہے - اس لیے طرفینؒ
کی رائے کے مطابق بچے کے بعض حصے کے نکلنے کے بعد بھی جو
خون آئے گا وہ نفاس ہوگا (اسی طرح ایک بچے کی پیدائش
سے جب رحم کا منہ کھل گیا تو نفاس شروع ہو جائے گا
خواہ دوسرا بچہ پیٹ ہی میں ہو -

مسئلہ :

وہ بچہ جس کے بعض اعضاء ظاہر ہو چکے ہوں -
ادھورا ہی گر جائے تو اس کا حکم پورے بچے جیسا ہے
حتیٰ کہ عورت اس کی وجہ سے نفاس والی ہوگی اور باندی
اُم ولد بن جائے گی اور اس طرح اس کے ذریعے عدت پوری
ہو جائے گی -

مسئلہ :

کم از کم مدت نفاس کی کوئی حد نہیں کیونکہ

بچے کی پیدائش خون کے رحم سے آنے کی علامت ہے ۔ اس لیے حیض کی طرح امتداد کو خون کے رحم سے آنے کی دلیل بنانے کی ضرورت نہیں ۔ (یعنی حیض اگر تین دن سے کم ہو تو کہیں گے کہ یہ رحم سے نہیں آ رہا بلکہ کسی اور عارضے کی بنا پر ہے اس لیے حیض نہیں ہے ۔ لیکن بچے کی پیدائش رحم کا منہ کھلنے کی علامت ہے کیونکہ پیدائش کے بعد جو خون آئے وہ رحم ہی سے ہوگا ۔ اس لیے تعیینِ مدت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی) ۔

مسئلہ :

نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے ۔ اس سے زائد استحاضہ ہے ۔ اس کی دلیل اُم سلمہؓ کی روایت ہے ۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاس والی عورت کی مدت چالیس یوم مقرر فرمائی ۔ امام شافعیؒ ساٹھ دن تک نفاس شمار کرتے ہیں ۔ یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے ۔

مسئلہ :

ایک عورت جو پہلے بھی بچے جن چکی ہے اور اس کے نفاس کی عادت ایک مدت معین ہے ۔ مگر اس بار اس کا خون چالیس یوم سے بڑھ گیا ۔ تو ان زاید ایام کو اسی عادت کی طرف لوٹایا جائے گا جیسا کہ حیض کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے ۔ لیکن اگر پہلے کوئی عادت نہ ہو تو یہ ابتدائی نفاس چالیس دن کا ہوگا کیونکہ اس کا نفاس بنانا ممکن ہے ۔

مسئلہ :

اگر عورت یک وقت دو بچوں کو جنم دے تو شیخینؒ کے نزدیک نفاس پہلے بچے کی پیدائش سے شروع ہوگا۔ خواہ دونوں بچوں کی پیدائش میں چالیس دن کا وقفہ ہی کیوں نہ ہو ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں اور امام زفرؒ کا بھی یہی قول ہے کہ نفاس دوسرے بچے کی پیدائش سے شمار ہوگا کیونکہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بھی وہ حاملہ ہے تو ایسی صورت میں جس طرح وہ حائضہ نہیں اسی طرح نفاس والی بھی نہیں اسی لیے اجماعی طور پر دوسرے بچے کی پیدائش سے عدت ختم ہوگی ۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ حاملہ عورت کے رحم کا منہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے چونکہ بند ہوتا ہے اس لیے حیض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پہلے بچے کی پیدائش سے رحم کا منہ کھل جاتا ہے اور خون آنے لگتا ہے ۔ تو وہ نفاس ہے اور عدّت کا تعلق چونکہ وضع حمل سے ہوتا ہے اور اسی کی طرف مضاف بھی ہے اس لیے مجموعۂ حمل کو شامل ہوگا (اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''واولات الأحمال أن یضعن حملھنّ'' میں حمل کی اضافت ھُنَّ یعنی عورتوں کی طرف ہے ۔ یہ اضافۃ استغراق کا فائدہ دیتی ہے ۔ یعنی جب مجموعۂ حمل سے خالی ہو جائیں تو مدت مکمل ہو جائے گی) ۔

بَابُ الْأَنْجَاس وَ تَطْهِيرِهَا

نجاستوں اور ان کے پاک کرنے کا بیان

مسئلہ :

نمازی کے بدن ، کپڑے اور اس جگہ کا جہاں نماز پڑھتا ہو پاک کرنا واجب ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "و ثیابك فطهّر" یعنی اپنا لباس پاک رکھیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے : اس کو کھرچ پھر رگڑ پھر پانی سے دھو ڈال پھر اس ناپاکی کا نشان تجھے کوئی نقصان نہ دے گا ۔ جب کپڑے کی تطہیر کا وجوب ثابت ہو گیا تو بدن اور جگہ کی طہارت کا وجوب بھی ثابت ہو گیا کیونکہ حالت نماز میں یہ استعمال سب کو شامل ہے ۔

۱

مسئلہ :

نجاستوں کی تطہیر پانی سے ہو سکتی ہے اور ہر اس پاک مائع چیز سے بھی تطہیر ہو سکتی ہے جس سے نجاست کا ازالہ ممکن ہو ۔ جیسے سرکہ اور عرق گلاب وغیرہ بشرطیکہ یہ چیزیں نچوڑنے کا اثر قبول کرتی ہوں ۔ یہ شیخینؒ کی رائے ہے ۔ امام محمدؒ ، امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا

کہنا ہے کہ صرف پانی ہی سے تطہیر ہو سکتی ہے کیونکہ پانی ناپاک کپڑے وغیرہ سے لگتے ہی ناپاک ہو جاتا ہے اور نجس چیز طہارت کا ذریعہ نہیں ہوتی - مگر یہ قیاس پانی کے بارے میں تو مجبوری اور ضرورت کی بنا پر ترک کرنا پڑا (ورنہ تو کوئی شے پاک ہی نہ ہو سکے) - (لہذا غیر قیاسی چیز پر کسی دوسری چیز کو قیاس کرنا درست نہ ہوگا) -

شیخین رح کی دلیل یہ ہے کہ مائع چیز نجاست کو زائل کر دینے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی ہے اور پاک کرنے کا مدار نجاست کے قلع قمع کرنے اور اس کے زائل کرنے پر ہی ہوتا ہے - رہا نجاست مجاورہ کی وجہ سے پاک کرنے والی چیز کا ناپاک ہونا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اجزاء نجاست ہی ختم ہو جائیں تو پاک کرنے والی چیز پاک رہتی ہے - (نجس کپڑے کو کم از کم تین بار دھویا جاتا ہے - ہر دفعہ دھونے کے بعد نچوڑا جاتا ہے اس طرح ایک یا دو بار دھونے اور نچوڑنے سے اجزاء نجاست کپڑے سے زائل ہو جاتے ہیں اور تیسری بار استعمال ہونے والا پانی یقیناً پاک رہتا ہے

قدوری کی عبارت کپڑے اور بدن کے درمیان میں کوئی فرق نہیں کرتی (یعنی جس طرح کپڑا پانی اور دوسری پاک مائع چیزوں سے پاک ہو سکتا ہے اسی طرح بدن بھی ان سے پاک ہو سکتا ہے - یہ امام اعظم رح کا قول ہے اور امام ابو یوسف رح کی دو روایتوں میں سے ایک روایت ہے اور ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ کپڑے اور بدن

فرق ہے۔ اس لیے بدن کی طہارت پانی کے سوا جائز نہ ہوگی۔

مسئلہ :

اگر موزے کو گوبر، پاخانہ، خون یا منی جیسی کوئی جِرم والی (یعنی مجسم) نجاست لگ جائے اور خشک ہونے پر اس کو زمین سے رگڑ دیا جائے تو جائز ہے اور یہ استحسان ہے (کیونکہ قیاس جلی کے مقابلے میں قیاس خفی ہے)۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں جائز نہیں قیاس کا تقاضا یہی ہے (کہ صرف خشک ہونے اور رگڑنے سے پاک نہ ہو)۔ بجز منی کے کہ وہ خصوصاً اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ جو نجاست موزے کے مسامات میں داخل ہو جاتی ہے وہ خشک ہونے اور رگڑنے سے دور نہیں ہو سکتی بخلاف منی کے جس کے مستثنیٰ ہونے کی دلیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

شیخینؒ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''اگر موزوں کے ساتھ نجاست لگی ہو تو انہیں زمین پر رگڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ زمین ان کے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ چمڑے کی سختی کی بنا پر اجزاءِ نجاست کم ہی مسامات میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر جرم نجاست خشک ہونے پر ان کو جذب کر لیتا ہے۔ جب

کھرچنے یا رگڑنے سے وہ (جرم نجاست) چمڑے سے زائل ہو جائے تو نجاست کے رہے سہے اثرات بھی ساتھ ہی زائل ہو جائیں گے۔

مسئلہ :

تر نجاست میں جائز نہیں جب تک کہ دھویا نہ جائے کیونکہ گیلی نجاست کا زمین سے پونچھنا اس کو بڑھا دے گا پاک نہیں کرے گا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں اگر وہ اس کو زمین پر اس طرح سے رگڑے کہ نجاست کا کوئی نشان نہ رہے تو پاک ہو جائے گا کیونکہ اس میں ابتلاءِعام ہے اور مذکورہ حدیث بھی مطلق ہے (جس میں خشک یا گیلی نجاست کی کوئی قید نہیں یہی رائے ہمارے مشائخ کی بھی ہے۔

مسئلہ :

اگر موزے پر پیشاب لگ کر خشک ہو جائے تو دھوئے بغیر پاک نہ ہوگا۔ یہی حکم ہر اس نجاست کا ہے جس کا جرم نہ ہو۔ جیسے شراب۔ کیونکہ اجزاءِ نجاست مسامات میں جذب ہو جاتے ہیں اور (چمڑے کے اوپر) کوئی ایسا جاذب نہیں جو انہیں دوبارہ جذب کرے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جس راکھ یا ریت پر رگڑا جائے وہی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ (کیونکہ جس طرح جرم والی نجاست خشک ہونے پر اجزاءِ نجاست کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے اسی طرح ریت یا راکھ وغیرہ بھی غیر جرم دار نجاست کے اجزاء کو اپنی طرف جذب کر لے گی)۔

مسئلہ :

نجاست زدہ کپڑا خواہ خشک بھی ہو جائے دھوئے بغیر پاک نہ ہوگا کیونکہ کپڑے کے کھوکھلا ہونے کی وجہ سے بے شمار اجزاء نجاست اس میں گھس جاتے ہیں ۔ جو دھوئے بغیر زائل نہیں ہوتے ۔

مسئلہ :

منی ناپاک ہے ۔ اگر تر ہو تو اس کا دھونا واجب ہے لیکن جب کپڑے پر خشک ہو جائے تو کھرچنا ہی کافی ہوگا اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے ۔ جو آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''منی اگر تر ہو تو پانی سے دھو دیا کرو اور اگر خشک ہو تو کھرچ دیا کرو ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ منی پاک ہے ۔ ہماری روایت کردہ حدیث امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے ۔ نیز حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ کپڑا پانچ چیزوں کی وجہ سے دھویا جائے منجملہ ان کے ایک منی بھی ہے ۔

مسئلہ :

مشائخ ماوراء النہر کا قول ہے کہ اگر منی بدن سے لگ جائے تو بدن کھرچنے سے پاک ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں ابتلاء بہت عام ہے ۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بدن غسل کے بغیر پاک نہ ہوگا کیونکہ بدن کی

حرارت جاذب ہوتی ہے (اور حرارت کی وجہ سے اجزاء منی مسامات میں جذب ہو جاتے ہیں)۔ اس لیے نجاست کے اجزاء جرم کی طرف واپس نہیں ہوتے اور بدن کا کھرچنا ممکن بھی نہیں۔

مسئلہ:

اگر شیشے یا تلوار پر نجاست لگ جائے تو انہیں رگڑ دینا ہی کافی ہے کیونکہ نجاست ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتی اور جو کچھ اوپر لگی ہوتی ہے وہ رگڑنے سے زائل ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:

اگر زمین پر نجاست پڑ کر دھوپ سے اس قدر خشک ہو جائے کہ اس کا اثر جاتا رہے تو اس پر نماز ادا کرنا جائز ہے۔

امام زفرؒ اور اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں جائز نہیں کیونکہ نجاست کو زائل کرنے والی کوئی چیز موجود نہیں اس لیے اس پر تیمم بھی جائز نہیں۔

ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''زمین کی پاکیزگی اس کا خشک ہو جانا ہے'' البتہ تیمم اس لیے جائز نہیں کہ مٹی کی طہارت کی شرط تو نص کتاب سے ثابت ہے۔ اس لیے تیمم کی ادائیگی حدیث سے ثابت شدہ چیز سے نہ ہوگی (کیونکہ خبر واحد نص کے مقابلے میں قابل عمل نہیں ہوتی)۔

مسئلہ : .

خون ، بول ، شراب ، مرغی کی بیٹ اور گدھے کے پیشاب ایسی نجاست غلیظہ اگر درہم یا اس سے کم مقدار میں بدن یا کپڑے سے لگ جائے تو نماز جائز ہوگی اگر اس مقدار سے زائد ہو تو جائز نہ ہوگی ۔

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قلیل اور کثیر نجاست برابر ہے (یعنی دونوں مانع نماز ہیں) کیونکہ جس نص میں تطہیر کا حکم ہے ۔ اس میں قلیل اور کثیر میں کوئی امتیاز مذکور نہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ قلیل نجاست سے عموماً احتراز ممکن نہیں ہوتا اس لیے قلیل نجاست کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے ۔ ہم نے استنجا کی جگہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کا اندازہ ایک درہم مقدار سے کیا ہے ۔ بعض حضرات نے درہم کا اعتبار مساحت کے لحاظ سے کیا ہے اور وہ صحیح روایت کے مطابق ہتھیلی بھر چوڑائی ہے ۔ بعض کے نزدیک وزن کا اعتبار ہے اور وہ زیادہ وزن والا درہم ہے جس کا وزن ایک مثقال کے برابر ہوتا ہے دونوں باتوں کو تطبیق دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پہلا قول (یعنی مسافت کا اعتبار) رقیق یعنی مائع نجاست کے متعلق ہے اور دوسرا قول کثیف نجاست سے تعلق رکھتا ہے ۔

ان مذکورہ اشیاء کی نجاست کو اسی لیے مغلّظہ قرار دیا گیا کہ ان کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے ۔

مسئلہ :

ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب جیسی نجاست خفیفہ اگر کپڑے کو لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز جائز ہوگی حتی کہ چوتھائی کپڑے تک نہ پہنچ جائے۔ امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح روایت کیا گیا ہے کیونکہ اس میں اندازہ فاحش (یعنی بہت زیادہ نجاست) کا ہے اور بعض احکام میں چوتھائی حصہ کل کے حکم میں شامل کیا گیا ہے (اس لیے نجاست خفیفہ اگر چوتھائی حصے تک پہنچ جائے تو سارے کپڑے ہی کو ناپاک سمجھا جائے گا چوتھائی حصے کے کل کے حکم میں شامل ہونے کی مثال یہ ہے کہ وضو میں سر کا مسح فرض ہے لیکن اگر کوئی شخص صرف سر کے چوتھائی حصہ پر مسح کرے تو پورے سر پر مسح شمار ہوگا) امام اعظمؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس چھوٹے سے چھوٹے کپڑے میں نماز جائز ہے اس کا چوتھائی حصہ مراد ہے۔ جیسے تہ بند اور بعض کے نزدیک اس کپڑے کا چوتھائی حصہ مراد ہے جس میں نجاست لگی ہو۔ جیسا کہ قمیص کا دامن اور اس کی کلی۔

امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے رُبع سے مراد ایک مربع بالشت کی مقدار ہے۔ مأکول اللحم جانوروں کا پیشاب امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک (اپنے اپنے اصول کے مطابق نجاست خفیفہ ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس لیے کہ اس کی نجاست میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (ابو یوسفؒ کا اصول یہ ہے کہ جہاں نجاست میں علماء کا

اختلاف ہو وہاں نجاست خفیفہ مراد ہوگی) امام اعظمؒ کی رائے میں اس لیے نجاست خفیفہ ہے کہ دو نصوں میں تعارض پایا جاتا ہے۔ (اَسْتَنْزِھُوا مِنَ الْبَوْلِ الحدیث سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور اہل عُرینہ کے واقعہ سے حلت کا پتا چلتا ہے۔ امام اعظمؒ کا اصول یہ ہے کہ جب کسی چیز کی طہارت اور نجاست میں تعارض ہو تو وہاں نجاست خفیفہ مراد ہوتی ہے)۔

مسئلہ :

اگر لید یا گائے بھینس کا گوبر درہم کی مقدار کپڑے کو لگ جائے تو امام اعظمؒ کے نزدیک ایسے کپڑے سے نماز جائز نہیں کیونکہ اس کے ناپاک ہونے کے متعلق جو نص وارد ہو چکی ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے کہ آپ نے لید کو پھینکتے ہوئے فرمایا کہ نجاست ہے دوسری نص اس کے متعارض نہیں اور اس روایت سے امام اعظمؒ کی رائے میں اس کا نجاست غلیظہ ہونا بھی ثابت ہے کیونکہ تخفیف تعارض کی بنا پر ہوتی ہے (مگر یہاں کوئی تعارض نہیں)۔

صاحبینؒ کا ارشاد ہے کہ جب تک نجاست فاحش نہ ہو نماز جائز ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے صاحبینؒ کے نزدیک نجاست میں تخفیف ثابت ہو جاتی ہے اور راستوں کے لید وغیرہ سے بھرے رہنے کی وجہ سے اس میں ضرورت بھی ہے اور اس قسم کی ضرورت نجاست کے خفیف ہونے میں مؤثر ہوتی ہے۔ بخلاف گدھے کے پیشاب کے کیونکہ زمین اسے جذب کر لیتی ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس ضرورت کا تعلّق صرف جوتوں سے ہے (کہ چلتے وقت جوتے ہی زمین پر لگتے ہیں جن کے نجس ہونے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے) اور ان میں ایک بار تخفیف مؤثر ہو چکی ہے - حتی کہ جوتے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں لہذا حدیث کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس حد تک رعایت کافی ہے -

مأکول اللحم اور غیر مأکول اللحم جانوروں میں کوئی فرق نہیں - امام زفرؒ دونوں میں فرق کرتے ہیں - جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا ان میں وہ امام اعظمؒ سے اتفاق رکھتے ہیں اور جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان میں وہ صاحبینؒ سے متفق ہیں -

امام محمدؒ سے مروی ہے کہ جب وہ ری (شہر) میں داخل ہوئے اور انہوں نے ابتلاء عام دیکھا تو فتوی دیا کہ نجاست کثیرہ بھی نماز سے نہیں روکتی - فقہاء کرام نے اسی پر بخارا کے کیچڑ کو قیاس کیا ہے اور اسی موقع پر امام محمدؒ کا موزے کے بارے میں رجوع مروی ہے (یعنی محمدؒ کا پہلا فتوی یہ تھا کہ موزہ دھوئے بغیر پاک نہیں ہوتا مگر ری شہر میں ابتلاء عام کو دیکھ کر پہلے فتوی سے رجوع کر لیا کہ موزہ رگڑنے سے بھی پاک ہو جاتا ہے -

مسئلہ :

اگر کپڑے کو گھوڑے کا پیشاب لگ جائے تو شیخینؒ کے نزدیک مانع نماز نہیں بشرطیکہ بہت زیادہ نہ ہو

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر فاحش بھی ہو تو بھی مانع نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا بول پاک ہوتا ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نجاست خفیفہ ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حلال ہوتا ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک روایات کے تعارض کی بنا پر نجاست خفیفہ ہے۔

مسئلہ :

اگر کپڑے کے ساتھ غیر ماکول اللحم پرندوں کی بیٹ درہم کی مقدار سے زیادہ لگ جائے تو شیخینؒ کے نزدیک اس کپڑے میں نماز جائز ہوگی اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہوگی۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ اختلاف نجاست کے بارے میں ہے اور بعض کی رائے میں یہ مقدار نجاست کے متعلق ہے اور یہی قول صحیح ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ نجاست میں تخفیف ضرورت کی بنا پر ہوتی ہے مگر مذکورہ پرندوں کے عدم اختلاط کی وجہ سے کوئی ایسی ضرورت درپیش نہیں۔ لہذا نجاست کی تخفیف کی بھی حاجت نہیں ہے۔

شیخینؒ کہتے ہیں کہ یہ پرندے فضاء میں اڑتے ہوئے بیٹیں کر دیتے ہیں اور ان سے بچنا مشکل ہے اس لیے تخفیف نجاست کی ضرورت موجود ہے۔ ان پرندوں کی بیٹ اگر برتن میں پڑ جائے تو ابوبکر الاعمش وغیرہ کے نزدیک وہ اس کو خراب کر دے گی۔ امام کرخیؒ وغیرہ بعض

حضرات کی رائے میں برتن خراب نہیں ہوگا کیونکہ برتنوں کو بیٹ سے بچائے رکھنا دشوار ہے۔

مسئلہ:

کپڑے کو اگر مچھلی کا خون یا خچر یا گدھے کا لعاب دہن درہم کی مقدار سے زیادہ لگ جائے تو اس میں نماز جائز ہوگی مچھلی کے خون میں اس لیے کہ وہ حقیقت میں خون ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ نجس بھی نہیں ہوگا۔

امام ابو یوسفؒ اس میں کثیر فاحش کا اعتبار کرتے ہیں اور خون کو نجس شمار کرتے ہیں۔ لیکن گدھے اور خچر کا لعاب مشکوک ہونے کی وجہ سے کسی پاک چیز کو نجس نہیں کرتا۔

مسئلہ:

اگر سوئی کے ناکے کے برابر پیشاب کی چھینٹیں کپڑے پر پڑ جائیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ ان سے بچنا طاقت سے باہر ہے۔

مسئلہ:

نجاست کی دو قسمیں ہیں۔ نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی۔ نظر آنے والی کے پاک کرنے کا طریق یہ ہے کہ خود نجاست کو دور کیا جائے کیونکہ ناپاکی کسی جگہ میں گندگی کے حلول کرنے کی وجہ سے آئی ہے لہذا اس گندگی کے دور کرنے ہی سے دور ہوگی البتہ اگر اس نجاست

کا اتنا نشان رہ جائے جس کا دور کرنا مشکل ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ حرج شرعی طور پر مدفوع ہے۔ اس کلام سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ گندگی کے دور ہو جانے کے بعد مزید دھونا شرط نہیں اگرچہ گندگی ایک ہی دفعہ میں دھل جائے۔ اس میں مشائخ کو کلام ہے۔

مسئلہ :

جو نجاست نظر نہیں آتی اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کپڑے کو اس قدر دھویا جائے کہ دھونے والے کا غالب گمان ہو کہ اب یہ پاک ہو گیا ہے کیونکہ بار بار دھونا اجزاء نجاست نکالنے کے لیے ضروری ہے البتہ اس کے زوال کا قطعی اور یقینی علم حاصل کرنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ اس لیے غالب گمان کا اعتبار ہوگا۔ جیسا کہ قبلہ کے بارے میں ہے (کہ گمان غالب کے مطابق جانب قبلہ متعین کر لی جائے تو نماز درست ہوگی) فقہاء کرام نے تین بار دھونا اس لیے رکھا ہے کہ اتنی بار دھونے سے عموماً غالب گمان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے سہولت کے مدنظر سبب ظاہر (یعنی تین بار دھونے) کو طہارت کے قائم مقام کر دیا اور اس کی تائید نیند سے بیدار ہونے والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ظاہر الروایات کے مطابق ہر بار دھونے کے ساتھ نچوڑنا بھی ضروری ہے کیونکہ نجاست نچوڑنے ہی سے خارج ہوتی ہے۔

فصل فی الاستنجاء

استنجاء کا بیان

مسئلہ :

استنجاء سنت نبوی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مداومت فرمائی ہے ۔ اس میں پتھر یا اس کے قائم مقام چیز کو کام میں لانا جائز ہے ۔ اس سے مل کر نجاست کو صاف کر دیا جائے کیونکہ مقصد تو صاف کرنا ہے ۔ اس لیے مقصد ہی کا اعتبار ہوگا ۔

مسئلہ :

استنجے میں کوئی خاص تعداد مسنون نہیں ۔ امام شافعیؒ تین پتھر وغیرہ ضروری قرار دیتے ہیں اور یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تین پتھروں سے استنجاء کیا کرو ۔“

ہماری دلیل آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ہے کہ ”استنجاء میں طاق عدد کا لحاظ رکھا جائے ۔ جس نے اس تعداد کو ملحوظ رکھا اس نے بہت اچھا کیا ۔ ورنہ کوئی حرج نہیں“ امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت کے ظاہری معنی متروک ہیں چنانچہ

اگر کوئی ایک تکونے پتھر ہی سے استنجاء کرے تو بالاجماع جائز ہوگا ۔

پتھروں کے بعد پانی کا استعمال افضل ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فِیهِ رِجَالٌ یُحِبُّونَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوا" یعنی مسجد قباء میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خوب طہارت کو پسند کرتے ہیں ۔ یہ آیت ان صحابہ کرامؓ کے متعلق نازل ہوئی جو پتھروں کے بعد پانی کا استعمال فرمایا کرتے تھے ۔ پھر وہ اچھی روش بھی ہے امام حسن بصریؒ اسے ہمارے زمانے کے لیے سنت قرار دیتے ہیں اور پانی اتنا استعمال کرے کہ اس کو طہارت و نظافت کا غالب گمان ہو جائے تعداد کا شمار نہ ہو ۔ ہاں اگر وہ وسوسہ کرنے والا ہو تو اس حق میں تین یا بعض کے نزدیک سات بار کی تعیین مناسب ہے ۔

مسئلہ :

اگر نجاست اپنے مقام سے آگے پھیل جائے تو پانی کے بغیر طہارت جائز نہ ہوگی ۔ بعض نسخوں میں اِلَّا الْمَاءُ کی بجائے اِلَّا الْمَائِعُ ہے ۔ اس سے ان روایات کا اختلاف ثابت ہوتا ہے جو پانی کے علاوہ دوسرے مائعات سے اعضاء پاک کرنے کے سلسلے میں ہم بیان کر چکے ہیں کیونکہ مسح یعنی پتھروں وغیرہ سے ملنا مزیل نجاست نہیں ہوتا البتہ مقام استنجاء تک تو اس پر اکتفاء کر لیا گیا ہے (کیونکہ اس کا ثبوت نص سے ہے) ۔ مگر اس سے آگے اس کو نہیں بڑھائیں

گے (یعنی دوسری چیز کو قیاس نہیں کریں گے) الغرض صرف پتھر کافی نہیں ہوں گے بلکہ دھونا بھی ضروری ہے۔

امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مقام استنجاء کے علاوہ جگہ کے لیے مانع مقدار کا اعتبار کیا جائے گا۔ کیونکہ مقام استنجاء میں تو یہ مقدار ساقط الاعتبار ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں دوسرے حصوں پر قیاس کرتے ہوئے مقام استنجاء سمیت اس مقدار کا اعتبار ہوگا۔ (یعنی جس طرح دوسرے حصوں میں درہم کی مقدار معاف ہے۔ لیکن مقام نجاست بھی اس میں شامل ہوتا ہے یہاں بھی اسی مقدار کا اعتبار ہوگا اور مقام استنجاء بھی اس میں شامل ہوگا)۔

مسئلہ:

ہڈی اور لید سے استنجاء نہ کیا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اگر کسی نے ایسا کر لیا تو مقصود حاصل ہونے کی بنا پر کافی ہوگا۔

لید سے بوجہ نجاست منع کیا گیا ہے اور ہڈی سے اس لیے کہ یہ جنات کی غذاء ہوتی ہے)۔

مسئلہ:

کھانے والی چیز سے بھی استنجاء کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ اضاعت اور اسراف ہے۔ داہنے ہاتھ سے بھی استنجاء نہ کیا جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے ہاتھ سے استنجاء کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

كِتَابُ الصَّلَاةِ

نماز کا بیان

بَابُ الْمَوَاقِيت

اوقات کا بیان

مسئلہ :

فجر کا اول وقت فجر ثانی یعنی صبح صادق کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے ۔ صبح صادق سے مراد وہ سفیدی ہے جو افق کے متوازی چوڑائی میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے ۔ فجر کا آخری وقت طلوع آفتاب تک رہتا ہے ۔ اس کی دلیل امامتِ جبرائیل علیہ السلام والی حدیث ہے کہ انھوں نے پہلے دن طلوع فجر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت فرمائی اور دوسرے دن اس وقت نماز شروع کرائی جب کہ روشنی خوب پھیل چکی تھی اور سورج طلوع ہونے کے قریب تھا ۔

اس حدیث کے آخر میں ہے کہ جبرائیلؑ نے (دوسرے دن) آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان دو وقتوں کے درمیان آپ کے اور آپ کی امت کے لیے نماز کا وقت ہے ۔

صبح کاذب کا کوئی اعتبار نہیں ۔ صبح کاذب وہ سفیدی ہے جو افق پر عمودی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔ اس کے بعد پھر تاریکی چھا جاتی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔ اے لوگو ! تمھیں حضرت بلال رض کی اذان اور عموداً ظاہر ہونے والی فجر دھوکے میں نہ ڈالے ۔ (بلکہ نماز تہجد وغیرہ ادا کرتے رہا کرو کیونکہ حضرت بلال رض لوگوں کی آگاہی کے لیے صبح صادق سے پہلے اذان دیا کرتے تھے ۔ صبح صادق کے بعد حضرت عبداللہ بن مکتوم رض اذان کہا کرتے تھے) فجر کی سفیدی تو افق میں پھیلنے والی ہوتی ہے ۔

مسئلہ :

سورج کے زوال کے ساتھ ہی ظہر کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے ۔ حدیثِ امامت جبرئیل ؑ سے واضح ہے کہ آپ ؑ نے پہلے دن سورج کے زوال کے ساتھ ہی نماز پڑھائی تھی ۔

امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک ظہر کے آخری وقت کی حد یہ ہے جب ہر چیز کا سایہ فَیْءُ الزّوال کے علاوہ دو چند ہو جائے ۔ صاحبین ؒ کے نزدیک (فیٔ الزوال کے علاوہ) جب سایہ اس کی مثل ہو جائے تو ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے ۔

فیٔ الزوال سے مراد وہ سایہ ہے جو زوال کے وقت چیزوں کا ہوتا ہے ۔ (یعنی ان کا اصلی سایہ) ۔

صاحبینؒ کی دلیل امامت جبرئیلؑ والی حدیث ہے کہ جبرئیل نے پہلے دن اس وقت (ظہر کی نماز) پڑھائی تھی۔
امام ابو حنیفہؒ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔ کہ "ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرکے پڑھا کرو۔ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی شدت حرارت سے ہے" اور اس وقت (جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو) ان کے علاقوں میں گرمی اپنے عروج پر ہوتی تھی۔ جب احادیث میں تعارض پایا جائے تو شک کی بنا پر وقت ختم نہیں ہو جاتا۔ (بلکہ ظہر کا وقت دو چند سائے تک ممتد ہوگا)۔

مسئلہ :

عصر کے وقت کی ابتداء مذکورہ دونوں نظریوں کے اختلاف کی بنا پر اس وقت ہوگی جب کہ ظہر کا وقت ختم ہو جائے اور اس کا آخر وقت سورج کے غروب ہونے تک ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اگر کسی شخص کو غروب آفتاب سے قبل عصر کی نماز کی ایک رکعت کا وقت بھی مل گیا تو اس کو عصر مل گئی۔

مسئلہ :

سورج کے غروب ہوتے ہی مغرب کا اول وقت شروع ہو جاتا ہے اور شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔
امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مغرب کے وقت کی وسعت صرف اسی قدر ہے کہ جس میں تین رکعت ادا کی جا سکیں۔

کیونکہ حضرت جبرئیل[ع] نے دونوں دن اسی ایک وقت ہی میں امامت کرائی تھی۔

ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ''مغرب کا اول وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور غروب شفق تک باقی رہتا ہے'' امام شافعی[رح] کی پیش کردہ حدیث کراہت سے بچنے پر محمول ہے۔

امام اعظم[رح] کی رائے میں شفق سے مراد وہ سفیدی ہے جو سرخی کے بعد نمودار ہوتی ہے اور صاحبین[رح] کے نزدیک شفق سے مراد سرخی ہے۔ امام اعظم[رح] سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ امام شافعی[رح] کا بھی یہی کہنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''شفق سرخی ہی کا نام ہے''۔

امام اعظم[رح] اپنے مسلک کی تائید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں کہ ''جب آفق پر سیاہی نمودار ہو جائے تو مغرب کا وقت نکل جاتا ہے'' آپ کی پیش کردہ حدیث ابن عمر[رض] پر موقوف ہے۔ موطأ میں امام مالک نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز اس میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے (اس لیے اگر حدیث کو موقوف نہ مانیں تو بھی اختلاف صحابہ[رض] کی وجہ سے آپ کا استدلال درست نہیں)۔

مسئلہ :

شفق کے غروب ہونے کے بعد عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور صبح صادق کے طلوع ہونے تک باقی رہتا ہے۔ کہ ''جب تک طلوع فجر نہ ہو عشاء کا وقت باقی رہتا ہے''۔

یہ حدیث امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے کیونکہ ان کے نزدیک عشاء کا آخری وقت رات کے تہائی حصہ گزر جانے تک ہوتا ہے۔

مسئلہ:

وتر کی نماز کا اول وقت عشاء کی نماز کے بعد سے طلوعِ فجر تک ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا نماز وتر کے بارے ارشاد ہے کہ ''انھیں عشاء کی نماز اور طلوع فجر کے درمیان ادا کیا کرو۔''

مصنف فرماتے ہیں کہ یہ طرفین کی رائے ہے۔ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ نماز وتر کا وقت نماز عشاء ہی کا وقت ہے۔ ہاں یاد ہونے کی ضرورت میں ترتیب کے مدنظر وتروں کو نماز عشاء پر مقدم نہ کرے۔

فصل

مستحبات نماز کا بیان

مسئلہ :

نماز فجر ادا کرنے میں اسفار مستحب ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”نماز فجر صبح کی روشنی میں ادا کیا کرو کیونکہ اس طرح اجر میں اضافہ ہوگا“ (نیز دیر سے بیدار ہونے والے بھی شرکت جماعت سے مستفیض ہو سکتے ہیں) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر نماز کی ادائیگی میں جلدی کرنا مستحب ہے ۔ مگر ہماری پیش کردہ حدیث اور جو حدیث ہم روایت کریں گے وہ امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہیں ۔

مسئلہ :

موسم گرما میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں اور سردیوں میں جلدی پڑھنا مستحب ہے ۔ جیسا کہ ہم نے روایت کیا اور حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موسم سرما میں ظہر کی نماز جلد ہی ادا فرمایا کرتے تھے ۔ مگر موسم گرما میں ذرا ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرتے تھے ۔

مسئلہ :

موسم گرما اور سرما میں عصر کو اس وقت تک مؤخر کرنا مستحب ہے جب تک سورج کی روشنی میں تغیر نہ پیدا ہو - (یعنی سورج زردی مائل نہ ہو) تأخیر کا فائدہ یہ ہے کہ انسان عصر سے پہلے جتنے نفل بھی چاہے ادا کر سکتا ہے اور عصر کی نماز کے بعد نفلوں کا ادا کرنا مکروہ ہے - (لہذا عصر میں تأخیر تکثیر نوافل کا سبب ہے) آفتاب کی ٹکیا میں تغیر کا اعتبار اس طرح ہوگا کہ سورج میں اس حد تک تغیر نہ آئے کہ اس میں چکا چوند باقی نہ رہے یہی صحیح ہے - اس تغیر آفتاب تک تأخیر مکروہ ہے - (کیونکہ جب سورج پر نگاہ جم سکے تو اس میں تغیر آ جاتا ہے اور ایسے وقت میں عصر ادا کرنے میں کراہت ہے) -

مسئلہ :

مغرب کی نماز میں تعجیل مستحب ہے - اس میں تأخیر مکروہ ہے کیونکہ اس میں یہود کے ساتھ تشبّہ لازم آتا ہے - (یہودی مغرب کی عبادت میں تأخیر سے کام لیتے ہیں - نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تک میری امت مغرب کی نماز میں تعجیل اور عشاء کی نماز میں تأخیر سے کام لے گی خیریت سے رہے گی -''

مسئلہ :

رات کے تہائی حصے سے پہلے تک عشاء کا مؤخر کرنا مستحب ہے - آنحضرت[ع] کا ارشاد ہے - اگر میری امت کے لوگوں کے لیے مشقت و تکلیف کا باعث نہ ہوتا تو نماز عشاء

کو رات کے تہائی حصے تک مؤخر کر دیتا ۔"

تأخیر کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شریعت نے عشاء کی نماز کے بعد گپیں ہانکنے سے منع فرمایا ہے ۔ اگر تہائی رات تک تأخیر کی جائے تو باتیں کرنے کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے ۔

بعض فقہاء کا قول ہے کہ موسم گرما کی عشاء میں تعجیل مناسب ہے (کیونکہ گرما کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں ۔ لوگ جلد سو جاتے ہیں ۔ اس لیے تأخیر میں) تقلیل جماعت کا اندیشہ ہے ۔

آدھی رات تک تأخیر مباح ہے کیونکہ دلیل کراہت یعنی تقلیل جماعت اور دلیل استحباب ۔ یعنی باتیں کرنے کے امکان کو کم کر دینے میں تعارض ہے ۔ (یعنی دلیل کراہت سے تأخیر مکروہ ثابت ہوتی ہے اور دلیل استحباب سے مستحب ۔ اصول فقہ کا یہ قانون ہے کہ جب کراہت اور استحباب میں تعارض ہو تو درمیانے امر یعنی اباحت کا حکم دیا جائے گا ۔ لہذا آدھی رات تک تأخیر مباح اور نصف آخر تک مکروہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں تقلیل جماعت کا اندیشہ ہے ۔ رہی قصہ گوئی وغیرہ تو وہ پہلے ہی منقطع ہو چکی ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص شب بیداری اور نماز تہجد کا عادی ہو اس کے لیے مستحب ہے کہ وتر کو رات کے آخری حصہ میں ادا کرے ۔ پھر اگر آنکھ کھلنے پر اعتماد نہ ہو تو سونے سے

پہلے ہی وتر کی نماز ادا کر لے ۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جسے ڈر ہو کہ وہ رات کے آخری حصہ میں اٹھ نہیں سکے گا تو وہ نیند سے پہلے ہی وتر پڑھ لے اور جسے رات کے آخر میں اٹھنے کی خواہش ہو تو وہ آخری حصۂ رات میں وتر ادا کرے ۔"

مسئلہ :

جس دن بادل چھائے ہوئے ہوں اس دن فجر ، ظہر اور مغرب کی نمازوں میں تأخیر اور عصر اور عشاء میں تعجیل مستحب ہے کیونکہ ایسے دن میں اگر بارش ہو جائے تو عشاء کی نماز میں تقلیل جماعت کا اندیشہ ہے ۔ (لہذا ذرا سویرے ہی ادا کی جائے تا کہ لوگ جماعت کے ساتھ شامل ہو سکیں) اور عصر کی تأخیر میں یہ قباحت ہے کہ کہیں مکروہ وقت ہی شروع نہ ہو جائے ۔ لیکن فجر میں یہ اندیشہ نہیں کیونکہ فجر کا وقت کافی لمبا ہوتا ہے ۔

امام اعظمؒ کا یہ ارشاد ہے کہ جس دن مطلع صاف نہ ہو ساری نمازوں میں تأخیر سے کام لینا احتیاط کے زیادہ قریب ہے کیونکہ وقت کے بعد تو ادا ممکن ہے (جیسا کہ قضاء نمازوں میں ہے) مگر وقت سے پہلے کسی صورت میں جائز نہیں ۔ (یاد رہے یہ اس دور کی بات ہے جب گھڑیاں ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں آج کل تو ان کی کوئی کمی نہیں اور کوئی مسجد بھی گھڑی سے خالی نہیں اس لیے قبل از وقت نماز ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ البتہ ایسے دن میں چند منٹ کی تقدیم و تأخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا) ۔

فَصْلٌ فی الْأَوْقَاتِ الَّتِی تُکْرَہُ فِیهَا الصَّلٰوۃُ

ان اوقات کا بیان جن میں نماز کا ادا کرنا مکروہ ہے

مسئلہ :

سورج کے طلوع ہونے ، نصف نہار پر ہونے اور غروب ہونے کے وقت نماز ادا کرنا جائز نہیں ۔ اس کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رض کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور مردے دفن کرنے (یعنی نماز جنازہ پڑھنے) سے منع فرمایا ۔
(۱) طلوع آفتاب کے وقت جب تک کہ اونچا نہ ہو جائے
(۲) زوال آفتاب کے وقت جب تک کہ زوال نہ ہو جائے
(۳) اور مائل بغروب ہونے کے وقت جب تک کہ ڈوب نہ جائے ''أَنْ نَقْبُرَ'' سے مراد نماز جنازہ ہے کیونکہ ان اوقات میں دفن کرنا مکروہ نہیں ۔

حدیث اپنے اطلاق کی بناء پر امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے کیونکہ فرائض کی تخصیص مکہ معظمہ کے ساتھ کرتے ہیں ۔ یہی حدیث امام ابو یوسفؒ کے خلاف بھی حجت ہے ۔ کیونکہ وہ جمعہ کے دن زوال کے وقت نفل مباح قرار دیتے ہیں ۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ اوقات میں نماز جنازہ بھی مکروہ ہے ۔ جیسا کہ ہم نے روایت کیا ۔

مسئلہ :

ان اوقات میں سجدۂ تلاوت بھی مکروہ ہے کیونکہ سجدۂ تلاوت بھی حکماً نماز ہی ہے ۔

مسئلہ :

البتہ غروب آفتاب کے وقت اسی دن کی عصر ادا کی جا سکتی ہے کیونکہ نماز کے واجب ہونے کا سبب تو وقت کا وہی جز ہے جو مشروع وقت سے متّصل ہے ۔ اگر پورے وقت کے ساتھ وجوب کا تعلق ہو تو نماز بعد از وقت ادا کرنی چاہیے ۔ اگر وجوب کا تعلق کسی گزری ہوئی چیز سے ہو تو آخر وقت میں ادا کرنے والا قضاء کرنے والا کہلائے گا ۔ لیکن جب پہلی صورت (یعنی وہ جزء وجوب کا سبب ہے جو وقت مشروع سے متصل ہے) متعین ہوگئی ۔ تو غروب آفتاب کے وقت جیسی نماز واجب ہوئی تھی ویسی ہی ادا کر دی گئی ۔ بخلاف دوسری نمازوں کے کہ وہ کامل طور پر واجب ہوتی ہیں اور ناقص طور پر ادا نہ ہوں گی ۔ [اس مقام کی تفصیل یہ ہے کہ وقت وجوبِ نماز کا سبب ہوتا ہے ۔ یعنی جب وقت ہوگیا تو نماز واجب ہوگئی ۔ وقت کے بغیر واجب نہیں ہوگی کیونکہ سبب کے بغیر مسبب کیسے پایا جا سکتا ہے ۔ نماز ادا کرنے کے لیے وقت شرط ہے ۔ یعنی اگر

صحیح وقت میں نماز نہ پڑھی تو ادا نہ ہوگی کیونکہ اگر شرط نہ ہو تو مشروط بھی نہیں ہوتا ۔

وقت مؤدّی (یعنی ادا کی ہوئی نماز) کے لیے ظرف ہوتا ہے ۔ یعنی ادائے نماز کا وقوع اسی طرح وقت میں ہو جس طرح مظروف اپنے ظرف میں ہوتا ہے ۔

اب یہ معلوم کرنا ہے کہ وقت کا کونسا جزء وجوب کا سبب ہے ۔ اگر پورے وقت کو سبب بنایا جائے تو یہ مطلب ہؤا کہ سارا وقت گزرنے کے بعد نماز ادا کی جائے کیونکہ مسبب ہمیشہ سبب کے بعد وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ حالانکہ وقت کے ظرف ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ادا کا وقوع وقت میں ہو لہذا پورا وقت تو سبب نہیں بن سکتا ۔

اگر وقت کے سب سے پہلے جزء کو سبب بنایا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ ایک شخص وقت سے پہلے وضو کرکے تیار بیٹھا ہو ۔ جونہی وقت کا پہلا جزء آئے وہ نماز شروع کر دے ۔ ورنہ اگر کچھ دیر بعد شروع کرے گا تو ادا کرنے والا نہیں بلکہ قضاء کرنے والا ہوگا ۔ حالانکہ ایسے شخص کو قضاء کرنے والا نہیں کہتے ۔

باقی اجزاء میں سے بھی کسی ایک جزء کا تعین نہیں کر سکتے کیونکہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے ۔

تو وقت کا وہ جزء وجوب کا سبب ہوگا جو تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے ساتھ مقارن و متصل ہو ۔ یعنی وقت کا

جو حصہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ متصل ہو وہی سبب ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو جزء تکبیر تحریمہ کے ساتھ متصل ہے اسے گزشتہ اجزاء کے ساتھ ملا کر سبب بنایا جائے تو کیا حرج ہے تو فقہاء کرام نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس صورت میں تَخَطّی مِنَ الْقلیل الی الکثیر بلا دلیل لازم آتی ہے جو اصول فقہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز نہیں۔

اب ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ مسلمہ اصول یہ ہے کہ جب سبب کامل ہو تو مسبب بھی کامل ہوتا ہے اور اگر سبب ناقص ہو تو مسبب بھی ناقص ہی ہوگا۔ تو جو شخص وقت کے کامل جزء میں تکبیر تحریمہ شروع کرے اس کی ادا بھی کامل ہوگی اور جو شخص وقت کے ناقص جزء (یعنی غروب آفتاب کے وقت) میں تکبیر تحریمہ کہے گا اس پر ناقص ہی واجب ہوئی اور ناقص ہی ادا ہوگی۔ بخلاف اس شخص کے جو وقت کے تمام اجزاء گزار دے تو اس کے ذمہ کامل واجب ہوگی۔ اس لیے ناقص وقت میں ادا نہ کر سکے گا۔ لہذا اس وقت کی ادا نماز تو غروب آفتاب کے وقت شروع ہو سکتی ہے۔ مگر قضاء کا ادا کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ قضاء نماز کامل طور پر اس کے ذمہ واجب تھی۔ اس لیے ناقص ادا کرنا جائز نہیں]۔

مصنف فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوۃ کے بارے میں نفی مذکور یعنی ولا صلاۃ جنازۃ الخ سے مراد کراہت ہے حتی کہ اگر کوئی شخص ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھ لے یا آیۃ سجدہ پڑھ کر سجدۂ تلاوۃ کر لے تو

جائز ہوگا کیونکہ یہ ناقص طور پر ہی واجب ہوئے تھے اور ناقص طور پر ہی ادا ہوگئے کیونکہ جنازہ آنے اور تلاوت کرنے پر ہی ان کا وجوب ہوتا ہے۔

مسئلہ :

نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک نفل وغیرہ کا ادا کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور سے منع فرمایا ہے۔

البتہ ان اوقات میں فوت شدہ نمازیں ادا کرنے سجدۂ تلاوت کرنے اور نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ کراہت فرض کی رعایت کے مدنظر تھی۔ تاکہ پورا وقت فرائض ہی میں مصروف سمجھا جا سکے۔ فی نفسہ وقت میں کوئی کراہت نہیں۔ لہذا فرائض کے حق میں یا واجب بعینہ میں۔ جیسے سجدۂ تلاوت ہے کراہت کا اثر ظاہر نہ ہوگا۔ البتہ نظر کے حق میں ظاہر ہوگا (واجب لغیرہ وہ ہے جو کسی چیز کا تتمہ ہو جیسے طواف کے بعد دو رکعتیں طواف کا تتمہ ہیں۔ واجب لِعَینِہٖ وہ ہے جو دوسری چیز کا تتمہ نہ ہو جیسے سجدۂ تلاوۃ) کیونکہ اس کے واجب ہونے کا سبب اس کی اپنی طرف سے ہے۔ (مثلاً دو رکعتیں بطور نذر ماننے سے واجب ہو جاتی ہیں حالانکہ نذر سے پہلے واجب نہ تھیں تو یہ واجب لغیرہ ہے۔ یعنی جو چیز کسی عارضہ کی وجہ سے واجب ہو)۔

اسی طرح طواف کی دو رکعتوں کے حق میں بھی اثر

کراہت ظاہر ہوگا اور اس کام میں بھی جس کو شروع کرکے فاسد کر دیا گیا ہو کیونکہ ان صورتوں میں وجوب لغیرہ ہے اور وہ طواف کو ختم کرنا اور ادا کی ہوئی چیز کو بطلان سے بچانا ہے۔ (مثلاً اگر کسی نے دو رکعت نفل نماز شروع کی پھر ایک رکعت کے بعد توڑ دی تو اس پر واجب ہے کہ ان دو رکعتوں کو ازسرنو پورا کرے۔ تاکہ ادا کی ہوئی رکعت ضائع نہ ہو) [الحاصل جو امور فرض یا واجب لعینہ ہیں ان کا ادا کرنا مکروہ نہیں اور جو امور واجب لغیرہ ہیں ان کا ادا کرنا مکروہ ہوگا۔

مسئلہ :

طلوع فجر کے بعد فجر کی دو رکعت (سنتوں) کے علاوہ نفل مکروہ ہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبادت الٰہی کے شیدا ہونے کے باوجود دو رکعتوں سے زیادہ ادا نہیں فرمایا کرتے تھے۔

مسئلہ :

غروب آفتاب کے بعد فرائض ادا کرنے سے پہلے بھی نفل مکروہ ہیں کیونکہ اس سے نماز مغرب میں تأخیر ہوتی ہے۔

مسئلہ :

اسی طرح جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے لیے نکلنے سے لےکر خطبہ سے فارغ ہونے تک نفل مکروہ ہیں کیونکہ اس صورت میں خطبہ سنا نہیں جا سکتا۔ (حالانکہ اس کا سننا واجب ہے)۔

بَابُ الْأَذَان

اذان کا بیان

مسئلہ :

پانچوں نمازوں اور جمعہ کے لیے اذان سنت ہے ان کے سوا کسی نماز کے لیے مسنون نہیں کیونکہ عہد نبوی سے متواتر اسی طرح منقول ہے۔ اذان کی کیفیت معروف و مشہور ہے اور وہ اسی طرح ہے جیسے آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے نے کہی تھی۔

مسئلہ :

اذان میں ترجیع نہیں ہے کہ ایک بار تو شہادتین کو آہستہ آواز سے ادا کرے اور دوسری مرتبہ خوب بلند آواز سے۔

امام شافعیؒ اذان میں ترجیع کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل حضرت ابو محذورہؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ترجیع کا حکم دیا تھا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مشہور روایات میں ترجیع کا کہیں ذکر نہیں اور نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام ابو محذورۃؓ کو اذان سکھا رہے تھے۔ آپ نے شاید شہادتین

کو دوبارہ بلند آواز سے ادا کرنے کو کہا ہوگا اور ابو محذورہؓ نے اسے ترجیع تصور کر لیا ہو (یعنی ممکن ہے انہوں نے پہلی بار شہادتین کو مناسب طریق پر ادا نہ کیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ کہنے کی تاکید کی ہو۔ جسے انہوں نے ترجیع خیال کر لیا ہو)۔

مسئلہ :

فجر کی اذان میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے بعد دو مرتبہ "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوم" کہا جائے کیونکہ جب حضرت بلالؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سوتے دیکھا تو اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْم بلند آواز سے کہا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا بلالؓ! تم نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے۔ اسے اپنی اذان میں شامل کر لو۔ ان الفاظ کو فجر میں خصوصاً اس لیے شامل کیا گیا کہ وہ وقت عموماً نیند اور غفلت کا ہوتا ہے۔

مسئلہ :

اقامت بھی اذان جیسی ہے۔ البتہ اقامت میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے بعد "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کا دو مرتبہ اضافہ کیا جاتا ہے۔ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے نے اسی طرح کیا تھا اور یہ مشہور روایت میں ہے پھر یہ روایت امام شافعیؒ کے خلاف بھی حجت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کے علاوہ باقی کلمات ایک ایک بار ادا کیے جائیں۔

مسئلہ :

اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے جائیں اور اقامت کے کلمات جلد جلد کیونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جب اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر اور اقامت کہو تو تیز تیز ۔ یہ طریقہ استحباب کا بیان ہے ۔

مسئلہ :

اذان اور اقامت کے وقت قبلہ رو ہونا چاہیے کیونکہ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے نے قبلہ رو ہو کر اذان کہی تھی ۔ اگر استقبال قبلہ نہ ہو تو اذان کافی ہوگی کیونکہ اس سے بھی مقصد (یعنی اعلان نماز) حاصل ہو جاتا ہے البتہ سنت کی مخالفت کی بنا پر مکروہ ضرور ہے ۔

مسئلہ :

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کہتے ہوئے اپنا منہ دائیں طرف پھیر لے اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے وقت بائیں طرف کیونکہ لوگوں کو سنانا مقصود ہے ۔ اس لئے ان کی طرف منہ بھی پھیرے (تاکہ آواز دائیں بائیں دور تک پہنچ سکے) ۔

مسئلہ :

اگر اذان میں گھوم جائے تو بھی بہتر ہے یعنی اگر اپنی جگہ کھڑے دائیں بائیں مڑنا ممکن نہ ہو جس طرح کہ سنت ہے ۔ بایں طور کہ مینار وسیع ہے تو گھوم

سکتا ہے ورنہ ضرورت نہیں (یعنی وسیع اور کھلے مینار میں دائیں طرف جا کر حَیَّ عَلَی الصَّلَاہ کہنا اور بائیں طرف جا کر حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کہنا بشرط ضرورت جائز ہے) ۔

مسئلہ :

افضل یہ ہے کہ مؤذن اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں ڈالے آنحضرتؐ نے بلالؓ کو اسی طرح کرنے کو فرمایا تھا ۔ نیز اس طرح اعلان بھی زور دار طریقہ سے ہو سکتا ہے ۔ اگر اس طرح نہ بھی کرے تو بھی اچھا ہے کیونکہ یہ سنت اصلیہ نہیں ہے ۔

مسئلہ :

فجر کی نماز کے وقت اذان اور اقامت کے درمیان تثویب یعنی دو مرتبہ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کہنا مستحسن ہے کیونکہ وہ نیند اور اور غفلت کا وقت ہوتا ہے ۔ باقی نمازوں کے اوقات میں تثویب مکروہ ہے ۔ تثویب کے معنی اعلان کا تکرار ہے ۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو لوگوں میں متعارف ہے ۔ اس تثویب کو دور صحابہؓ کے بعد علماء کوفہ نے لوگوں کے احوال بدلنے کی وجہ سے ایجاد کیا تھا (کیونکہ لوگوں میں امور نماز کے سلسلے میں تہاون اور تکاثل پیدا ہو گیا تھا) اور انہوں نے صرف فجر کے وقت تثویب کی اجازت دی ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے ۔ (کہ یہ خواب اور غفلت کا وقت ہوتا ہے) ۔

اور متأخرین فقہاء نے تمام نمازوں کے اوقات میں تثویب کو مستحسن قرار دیا کیونکہ امور دینیہ میں لوگوں کی لاپرواہی اور سستی انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ اگر مؤذن تمام نمازوں کے وقت حاکم کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا الْاَمِیْرُ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَ بَرَکَاتُہٗ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ حَیَّ علی الْفَلَاحِ اَلصَّلَاۃَ یَرْحَمُکَ اللہ" میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں مگر امام محمدؒ اسے مناسب خیال نہیں کرتے کیونکہ جماعت کے معاملے میں تمام لوگ برابر ہوتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ نے حکام کے لیے اس کو اس لیے مخصوص کہا کہ مسلمانوں کے معاملات میں ہمہ تن مصروف رہنے کی وجہ سے ان سے جماعت کھو نہ جائے اور یہ الفاظ صرف ان کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ہیں)۔ قاضی اور مفتی کا بھی یہی مقام ہے۔

مسئلہ :

مؤذن کو چاہیے کہ مغرب کی نماز کے علاوہ اذان اور اقامت کے درمیان بیٹھ جائے۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے۔ صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ مغرب کے وقت اذان واقامت کے درمیان بھی تھوڑی سی دیر بیٹھ جائے کیونکہ اذان و اقامت کے درمیان تھوڑا فصل ضروری ہے دونوں میں اتصال مکروہ ہے۔ تھوڑے سے سکتے سے فصل واقع نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو اذان کے کلمات میں بھی ہوتا ہے۔ اس

لیے فصل اتنی مدت بیٹھنے ہی سے ہو گا جیسا کہ دو خطبوں کے درمیان ہوتا ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مغرب کی نماز میں تاخیر مکروہ ہے لہذا کراہت سے بچنے کے لیے کمتر فصل ہی کافی ہوگا۔ نیز اذان اور اقامت کی جگہ بھی چونکہ الگ الگ ہوتی ہے اور (دونوں میں) لب و لہجہ بھی مختلف ہوتا ہے اس لیے سکتہ ہی سے فصل شمار ہوگا۔ مگر خطبہ کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

امام شافعیؒ ساری نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے مغرب کے وقت بھی دو رکعتوں کی مقدار فصل کے قائل ہیں۔ ہم عدم فصل کی وجہ سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ (کہ نماز مغرب میں تأخیر مکروہ ہے)۔

یعقوبؒ کہتے ہیں میں نے امام ابو حنیفہؒ کو دیکھا وہ مغرب کی اذان کہہ کر کھڑے رہتے اور اذان و اقامت کے درمیان بیٹھا نہیں کرتے تھے اس سے بھی ہماری بات کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مؤذن کا عالم بالسنۃ ہونا مستحب ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے (علم و عمل کے لحاظ سے) بہترین آدمی اذان کہا کرے۔

مسئلہ :

قضاء نمازوں کے لیے بھی اذان و اقامت کہی جائے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ التعریس کی صبح کو اذان و اقامت کے ساتھ فجر کی نماز قضاء کی تھی

یہ حدیث امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صرف اقامت ہی کافی ہے ۔

مسئلہ :

اگر بہت سی نمازیں قضاء ہوں تو روایت مذکورہ کی بنا پر پہلی کے لیے اذان و اقامت کہے دوسری نمازوں میں اسے اختیار ہے چاہے تو اذان و اقامت کہہ لے ۔ تاکہ قضاء بطرز ادا ہو جائے اور چاہے تو صرف اقامت ہی پر اکتفاء کرے ۔ کیونکہ اذان تو غیر موجود لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے ہوتی ہے اور یہاں وہ سب حاضر ہیں ۔

مصنفؒ کہتے ہیں امام محمدؒ سے روایت ہے کہ پہلی نماز کے علاوہ دوسری نمازوں کے لیے وہ اقامت کہے ۔ فقہاء نے کہا ہے ممکن ہے تمام ائمۂ احناف کا یہی قول ہو ۔

مسئلہ :

اذان و اقامت طہارہ و پاکیزگی کی صورت میں کہنا مناسب ہے اگر بلا وضو اذان کہے تو کافی ہوگی کیونکہ وہ ذکر ہے ، نماز نہیں ہے ۔ تو اس میں اسی طرح استحبابی امر ہے جیسا کہ (زبانی) قرآن کریم کی قراءۃ میں ۔

مسئلہ :

بلا وضو اقامت کہنا مکروہ ہے کیونکہ اس طرح اقامت اور نماز میں کافی فاصلہ آ جاتا ہے ۔

ایک روایت کے مطابق تو بلا وضو اقامت بھی مکروہ نہیں کیونکہ اقامت بھی تو ایک اذان ہی ہے ۔

دوسری روایت کے مطابق بلا وضو اذان بھی مکروہ ہے کیونکہ وہ دوسروں کو ایسے کام کی طرف دعوت دے رہا ہے جس کے لیے وہ خود تیار نہیں۔

مسئلہ :

ایک روایت کے مطابق جنابت کی حالت میں اذان کہنا مکروہ ہے۔ وضو کے بغیر اذان کے غیر مکروہ ہونے کی روایت میں اور بحالت جنابت اذان کہنے میں یہ فرق ہے کہ اذان کی نماز کے ساتھ مشابہت ہے۔ اس لیے حدث اکبر یعنی جنابت سے طہارت شرط قرار دی گئی اور حدث اصغر (یعنی بے وضو ہونے) سے طہارت شرط نہیں ٹھہرائی گئی۔ (یعنی اگر بے وضو اور جنبی دونوں کی اذان مکروہ ہو تو کوئی فرق نہیں مگر بے وضو کی اذان دوسری روایت کے مطابق غیر مکروہ ہے اور فرق کی وجہ یہ ہے کہ اذان ذکر ہے، جس کے لیے طہارۃ کا ہونا شرط نہیں لیکن ایک وجہ سے یہ نماز سے مشابہت بھی رکھتی ہے کہ اس میں منہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور وقت سے پہلے ہوتی نہیں وغیرہ اس وجہ سے حدث اکبر سے طہارت شرط قرار دی گئی اور حدث اصغر سے نہیں۔

جامع الصغیر میں مذکور ہے کہ اگر بلا وضو اذان و اقامت کہی جائے تو ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ جنابت کی حالت میں کہی ہوئی اذان و اقامت کا لوٹانا بہتر ہے۔ اگر اعادہ نہ کرے تو کافی ہے بہر حال پہلی روایت خفیف یعنی بلا وضو کی اذان کا اعادہ نہ کرنا حدث اصغر کے

ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسری صورت یعنی جُنبی کی اذان
کے بارے میں دو روایتیں ہیں معقول روایت یہ ہے کہ
اذان کا اعادہ کیا جائے۔ اقامت کا نہ کیا جائے کیونکہ
اذان میں فی الجملہ تکرار مشروع ہے۔ مگر اقامت کا تکرار
مشروع نہیں۔

امام محمدؒ کا یہ کہنا کہ اگر اعادہ نہ کرے تو بھی
جائز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جنبی کی کہی ہوئی
اذان و اقامت کا اعادہ نہ ہو تو لوگوں کی نماز جائز ہوگی۔
کیونکہ وہ تو اذان و اقامت کے بغیر بھی جائز ہے۔

مسئلہ :

اسی طرح اگر عورت اذان کہے اس کا مطلب ہے کہ
اس کا اعادہ کر لینا بہتر ہے تاکہ اذان مسنون طریق پر
ہو جائے۔

مسئلہ :

اذان نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے نہ کہی جائے
ورنہ وقت آنے پر اس کا اعادہ ضروری ہوگا کیونکہ اذان اطلاع
دینے کے لیے ہے۔ (کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے) لیکن وقت
سے پہلے تو تجہیل ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں اور یہی
قول امام شافعیؒ کا بھی ہے کہ رات کے نصف آخر میں
فجر کی اذان جائز ہے تاکہ اہل حرمین کا ورثہ پائیں اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت بلالؓ سے اپنے دونوں
بازوؤں کو چوڑائی میں پھیلا کر یہ فرمانا ان سب کے

خلاف حجت ہے کہ : جب تک فجر اس طرح ظاہر نہ ہو جایا کرے اذان نہ کہا کرو ۔

مسئلہ :

مسافر اپنی نماز کے لیے اذان و اقامت کہا کرے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ملیکہ کے دونوں بیٹوں سے فرمایا کہ ''جب تم سفر میں ہو تو اذان و اقامت کہا کرو ۔

دونوں کا ترک کرنا مکروہ ہے ۔ اگر صرف اقامت پر اکتفاء کر لیا جائے تو جائز ہے کیونکہ اذان کا مقصد غیر حاضر لوگوں کو مطلع کرنا ہے ۔ مگر یہاں رفقاء سفر موجود ہیں اور اقامت کا مقصد نماز کے شروع ہونے کی اطلاع کرنا ہوتا ہے اور وہ اس کے ضرورت مند ہوتے ہیں ۔

مسئلہ :

اگر شہر میں اپنے گھر نماز ادا کرے تو بھی اذان و اقامت کہے تاکہ جماعت کی طرز پر ادا ہو اگر دونوں کو چھوڑ دے تو بھی جائز ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودرض کا ارشاد ہے ''محلے کی اذان ہمارے لیے کافی ہے ۔''

بابُ شُرُوط الصَّلَاة الَّتِي تَتَقَدَّمُهَا

نماز کی ان شرائط کا بیان جو نماز سے مقدم ہوتی ہیں

مسئلہ :

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ہر قسم کے حدث اور نجاست سے اپنے آپ کو پاک کرے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ ''وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ'' اور اپنے لباس کو پاک کیجیے ۔ نیز ''وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا'' اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو خوب طہارت کیا کرو ۔

مسئلہ :

اور اپنے عورۃ کو ڈھانپے (عورۃ سے مراد بدن کا وہ حصہ ہے جس کا ظاہر کرنا قبیح اور بے حیائی شمار ہوتا ہے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ ''خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ'' ہر مسجد کے قریب زینت کو لازماً اختیار کرو یعنی وہ لباس اختیار کرو جو ہر نماز کے وقت تمہارے بدن کو ڈھانپ لے ۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حائضہ کی نماز اوڑھنی کے بغیر جائز نہیں ۔ حائضہ سے مراد بالغہ لڑکی ہے ۔

مسئلہ :

مرد کے لیے ناف کے نیچے سے گھٹنوں تک بدن کا حصہ عورت کا حکم رکھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کا ارشاد ہے کہ ناف اور گھٹنوں کا درمیانی حصہ مرد کے لیے عورۃ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ جو کچھ اس کے ناف کے نیچے ہے حتٰی کہ دونوں گھٹنوں سے تجاوز کر جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ناف عورۃ میں داخل نہیں۔ بخلاف امام شافعیؒ کے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ناف عورت میں شامل ہے اور دونوں گھٹنے بھی عورت میں داخل ہیں۔ امام شافعیؒ کو اس میں بھی اختلاف ہے۔

حدیث (عَوْرَةُ الرَّجُلِ مَا بَيْنَ سُرَّتِهِ إِلَى رُكْبَتِهِ میں إلَی کو مع کے معنوں پر محمول کریں گے تاکہ کلمۂ حتی پر جو دوسری حدیث میں ہے۔ (یعنی مادون سُرَّتِهِ حَتّٰى تَجَاوَزَ رُكْبَتَه) پر بھی عمل ہو جائے۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''الرکبة من العورة'' بھی معمول بہ ہو جائے گا۔ (لہذا گھٹنے بھی عورت میں داخل ہوں گے)۔

مسئلہ :

آزاد عورت کا سارا جسم چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ عورت کا حکم رکھتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ زن عورۃ مستورہ ہے (یعنی اس کا چھپا رہنا ضروری ہے) چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کو اس

لیے مستثنی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے ظاہر کرنے میں ابتلاء عام اور مجبوری ہے -

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ قدوری کی مذکورہ عبارت (وبدن الحرة کلها عورة إلا وجهها وکفیها) یہ مقرر اور معین کرتا ہے کہ عورت کا قدم بھی عورۃ میں داخل ہے - یہ بھی روایت ہے کہ قدم عورۃ میں شامل نہیں اور یہی صحیح ہے -

مسئلہ :

اگر عورت ایسی حالت میں نماز ادا کرے کہ اس کی پنڈلی کا چوتھا یا تیسرا حصہ ننگا ہو تو طرفینؒ کے نزدیک نماز کا اعادہ کرے - اگر چوتھائی سے کم ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں -

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں - اگر نصف سے کم حصہ ننگا ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک چیز اس وقت کثرت سے موصوف ہوتی ہے جب اس کا مقابل اس سے کمتر ہو - اس لیے کہ یہ دونوں اسماء مقابلہ ہیں اور نصف کی صورت میں امام ابو یوسفؒ سے دو روایتیں ہیں - انھوں نے قلت کی حد سے نکلنے کا اعتبار کیا یا اپنی ضد میں عدم دخول کا (یعنی ایک روایت تو یہ ہے کہ نصف کھلا ہو تو اعادہ واجب ہے کہ حد قلت سے نکل گئی ہے کیونکہ جس قدر نہیں کھلا وہ بھی نصف ہے اور جتنا کھلا ہے وہ بھی اس سے کم نہیں پور جب کمی کا نام نہ رہا تو اس قدر ننگا ہونے سے اعادہ واجب ہوا دوسری روایت کے مطابق

نصف ننگا ہونے پر اعادہ واجب نہیں کیونکہ وہ ضد کے تحت داخل نہیں ہوئی یعنی وہ مستور حصے کے برابر ہے نہ کہ زیادہ تو نصف تک ہونے سے وہ کثرت سے موصوف نہ ہوئی تو اعادہ واجب نہ رہا۔

طرفین کی دلیل یہ ہے کہ چوتھائی بھی گاہے کُل کے قائم مقام ہوتی ہے جیسا کہ سر کے مسح میں اور بحالت احرام چوتھائی سر منڈانے میں۔ اسی طرح جب کوئی کسی دوسرے شخص کا چہرہ دیکھے تو کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو دیکھا اگرچہ اس نے اس کی چاروں اطراف میں سے صرف ایک طرف ہی دیکھی ہو تو اس صورت میں وہ چوتھائی سے کل کی حکایت کرتا ہے۔

مسئلہ :

عورت کے بالوں پیٹ اور رانوں کے بارے میں بھی اسی طرح اختلاف ہے۔ ان میں سے ہر ایک الگ الگ عضو کی حیثیت رکھتا ہے اور بالوں سے مراد وہ ہیں جو سر سے نیچے لٹکے ہوئے ہوں۔ یہی صحیح ہے اور غسل جنابت میں ان کا دھونا حرج کی بنا پر ساقط ہے۔

عورۃ غلیظہ میں بھی اسی طرح اختلاف ہے (عورت غلیظہ سے مراد جائے پیشاب اور مقام پاخانہ ہیں) ذکر الگ عضو کی حیثیت رکھتا ہے اور خصیتین الگ عضو کی۔ یہی صحیح ہے۔ یہ نہیں کہ دونوں کو ملا کر ایک عضو اعتبار کیا جائے۔

مسئلہ :

جس قدر بدن مرد میں عورۃ شمار ہوتا ہے اسی قدر باندی کا بدن بھی عورت ہے ۔ البتہ اس کا پیٹ اور پیٹھ بھی عورۃ میں شامل ہے اس کے علاوہ اس کے بدن کا کوئی حصہ عورۃ میں داخل نہیں ۔ حضرت عمرؓ نے ایک باندی سے فرمایا تھا ۔ اے چھوکری ! اوڑھنی اتار دے کیا تو آزاد عورتوں کے ساتھ مشابہت کرتی ہے ۔ نیز باندی کو مالک کے کام کاج کے سلسلے میں عموماً محنت و خدمت کے لباس ہی میں باہر جانا پڑتا ہے ۔ تو تمام مردوں کے حق میں باندی کا قیاس ذوات المحارم پر ہوگا تاکہ حرج سے بچایا جا سکے ۔ (یعنی جس قدر محرم عورت کا پردہ اپنے محرم مرد سے ہوتا ہے اسی طرح باندی کا پردہ تمام مردوں کے حق میں ہوگا ۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں ۔ اگر نمازی کو نجاست زائل کرنے والی کوئی چیز دستیاب نہ ہو تو اسی کپڑے میں نماز پڑھ لے اور اعادے کی ضرورت نہیں ۔ اس کی دو صورتیں ہیں ۔ اول یہ ہے کہ کپڑے کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ پاک ہو تو اسی میں نماز ادا کرے ۔ اگر ننگے بدن سے نماز پڑھے تو جائز نہ ہوگا کیونکہ چیز کا چوتھائی حصہ اس کے کل کے قائم مقام ہوتا ہے ۔ دوم یہ کہ چوتھائی حصہ سے کم کپڑا پاک ہے امام محمدؒ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے کیونکہ

اس صورت میں نماز میں صرف ایک فرض کا ترک لازم آتا ہے (کہ اس نے ناپاک کپڑے میں نماز ادا کی ہے) لیکن ننگے بدن نماز ادا کرنے میں کئی فرضوں کا ترک کرنا ہے۔ (مثلاً قیام، رکوع، سجود اور عدم ستر عورۃ وغیرہ)۔

شیخینؒ کے نزدیک اسے اختیار ہے چاہے اسی کپڑے میں نماز پڑھے یا ننگے بدن پڑھے لیکن کپڑے میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ اختیار کی حالت میں دونوں (یعنی نجس کپڑے اور ننگا بدن) میں سے ہر ایک نماز کے جائز ہونے سے مانع ہے اور حقِّ مقدار میں دونوں برابر ہیں۔ (یعنی جب ہر ایک کا قلیل قابل معافی ہے) تو نماز کے حکم میں بھی دونوں برابر ہوں گے (اگر آپ کہیں کہ دونوں برابر کس طرح ہیں حالانکہ نجس کپڑے والی صورت میں صرف ایک فرض کا ترک لازم آتا ہے اور ننگے بدن سے کئی فرائض ترک ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے) اگر کسی چیز کو ترک کیا جائے مگر اس کا نائب اور خلیفہ موجود ہو تو وہ کایۃً ترک نہیں کہلاتا۔ ستر کی صورت اس بنا پر افضل ہے کہ ستر صرف نماز ہی سے خاص نہیں (بلکہ یوں بھی بدن کو ڈھانپنا ضروری ہے) لیکن طہارت کا تعلق صرف نماز ہی سے ہوتا ہے۔

مسئلہ :

جس شخص کے پاس کپڑا نہ ہو وہ بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع و سجود اشارے سے ادا کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرامؓ نے اسی طرح کیا تھا۔

مسئلہ :

اگر کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو جائز ہوگی کیونکہ بیٹھ کر پڑھنے میں عورۃ غلیظہ کی پردہ پوشی ہے۔ مگر کھڑے ہو کر پڑھنے میں نماز کے ارکان کا ادا کرنا ہے۔ لہذا جونسی صورت چاہے اختیار کرے۔ البتہ پہلی صورت افضل ہے کیونکہ پردہ پوشی نماز کے حق میں بھی واجب ہے اور لوگوں کے حق میں بھی، نیز پردہ پوشی کا کوئی خلیفہ بھی نہیں۔ لیکن اشارہ ارکان کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔

مسئلہ :

انسان جو نماز ادا کرنا چاہتا ہے اس کی نیت بھی کرے بایں طور کہ نیت اور تکبیر تحریمہ کے درمیان کسی دوسرے عمل کی وجہ سے وقفہ نہ ہو اور اس میں اصل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیاتِ'' اعمال کا دار و مدار نیات پر ہے۔ چونکہ نماز کی ابتداء قیام سے ہوتی ہے اور قیام عادت اور عبادت میں مشترک ہوتا ہے (یعنی عبادت میں بھی قیام ہوتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی) تو دونوں قسم کے قیاموں میں نیت ہی سے تمیز ہو سکتی ہے (کہ قیام عادت ہے یا قیام عبادت) اگر تکبیر تحریمہ سے پہلے ہی نیت کر لے (مثلاً وضو سے فارغ ہوتے ہی) تو یہ بھی تمیز کا فائدہ دے گی اور وہ نیت ایسی ہی ہے جیسے تکبیر کے وقت قائم کی ہو بشرطیکہ ایسا کوئی فعل

(نیت اور تکبیر تحریمہ کے) درمیان میں نہ آئے جو اسے قطع کر دے اور یہ ایسا عمل ہے جو نماز کے شایان شان نہیں اور جو نیت تکبیر تحریمہ سے متأخر ہو وہ بھی قابل اعتبار نہیں کیونکہ نماز کا جو حصہ نیت سے پہلے گزر چکا ہے وہ عدم نیت کی وجہ سے بطور عبادت واقع نہ ہوگا۔ روزے میں متأخر نیت ضرورت کی بنا پر جائز قرار دی گئی ہے۔ نیت ارادے کا نام ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا دل جانتا ہو کہ وہ کونسی نماز ادا کر رہا ہے۔ رہا زبان سے کہنا تو اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہاں اگر زبان سے ذکر کرنے سے مراد یہ ہو کہ اس کی دلی عزیمت اور مضبوط ہو جائے تو مستحسن ہے۔ پھر اگر نماز نفلی ہو تو اس کے لیے مطلق نیت ہی کافی ہے۔ اسی طرح اگر نماز سنت ہو تو بھی یہی صحیح ہے۔ اگر فرض نماز ہو تو فرض کی تعیین بھی ضروری ہے۔ مثلاً ظہر کیونکہ فرائض مختلف ہوتے ہیں۔

مسئلہ :

اگر کسی کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو تو نماز کے علاوہ اقتداء کی نیت بھی کرے۔ کیونکہ مقتدی کو امام کی جانب سے فساد نماز لازم آتا ہے اس لیے متابعت کا التزام ضروری ہے (مقتدی کی نماز کی صحت اور عدم صحت کا دار و مدار چونکہ امام کی نماز پر ہے۔ اس لیے اقتداء کا التزام ضروری ہے)۔

مسئلہ :

نماز میں استقبال قبلہ بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے۔ "تولّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ" یعنی اپنے رخ خانہ کعبہ کی طرف کرو۔ جو شخص مکہ مکرمہ میں ہو اس پر عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے اور جو شخص مکہ سے باہر ہو اس پر اس جہت کی طرف رخ کرنا ضروری ہے۔ (جیسا کہ ہمارے ملک میں مغرب کی جہت میں رخ ضروری ہے)۔ یہی صحیح ہے کیونکہ تکلیف وسعت کے مطابق ہوتی ہے۔ (اہل مکہ تو عین کعبہ کی طرف رخ کر سکتے ہیں۔ مگر دوسرے ممالک کے لوگ زیادہ سے زیادہ جہت کی طرف، کر سکتے ہیں عین کعبہ کی طرف رخ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ :

جس شخص کو دشمن یا کسی اور چیز کا خوف ہو۔ وہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز ادا کر سکتا ہے کیونکہ عذر متحقق ہے۔ اس شخص کی حالت اس آدمی جیسی ہے جس پر قبلہ مشتبہ ہو جائے۔

مسئلہ :

جس شخص پر جہت قبلہ مشتبہ ہو جائے اور کوئی پاس نہ ہو۔ جس سے دریافت کر سکے تو خود کوشش کرے (اور اپنی غالب رائے کے مطابق رخ کر لے) کیونکہ صحابہ کرامؓ نے اپنے اجتہاد کے مطابق نماز ادا کی تھی اور رسول اکرم ﷺ نے انکار نہیں فرمایا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دلیل ظاہر پر جب کہ اس سے زیادہ کوئی یقینی دلیل

موجود نہ ہو ، عمل واجب ہوتا ہے اور کسی سے دریافت کرنا اپنی کوشش سے بڑھ کر شمار ہوتا ہے ۔ اگر نماز ادا کرنے کے بعد معلوم ہو کہ میرا رخ غلط جہت کو تھا تو نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز ادا کی ہو تو اعادہ کرے کیونکہ اس صورت میں خطا بالکل یقینی ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ انسانی وسعت میں تو صرف اسی قدر ہے کہ تحرّی اور کوشش سے جہت قبلہ متعین کر کے رخ اس جانب کرے (تو یہ اس نے کر لیا ۔ اس لیے نماز جائز ہوگی) کیونکہ تکلیف بقدر وسعت ہوتی ہے ۔

مسئلہ :

اگر نماز کے دوران جہت قبلہ کا علم ہو جائے تو قبلہ کی طرف گھوم جائے کیونکہ اہل قباء نے جب نماز کی حالت میں تحویل قبلہ کا حکم سنا تھا تو اسی حالت میں کعبہ کے رخ گھوم گئے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بہت پسند فرمایا تھا ۔

اسی طرح اگر نماز کے دوران اس کی رائے کسی اور جہت کی طرف بدل جائے تو وہ اجتہاد پر عمل کے واجب ہو جانے کی وجہ سے اس حصہ نماز کو توڑے بغیر جسے وہ پہلے ادا کر چکا ہے اپنا رخ اسی طرف کر لے ۔ مثلاً وہ ظہر کی نماز پڑھ رہا ہے اور دوسری رکعت پڑھنے کے بعد قبلہ کے متعلق اس کی غالب رائے بدل گئی تو وہ نماز کو توڑے

بغیر گھوم جائے اور اپنی تیسری اور چوتھی رکعت پوری کرے۔

مسئلہ :

جس شخص نے تاریک رات میں لوگوں کی امامت کے فرائض سر انجام دیے اپنے اجتہاد کے مطابق قبلہ رخ ہوا اور اس نے مشرق کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی اور مقتدی حضرات نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق رخ کیا۔ وہ سب کے سب امام کے پیچھے تھے اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ امام کس طرف رخ کئے ہوئے ہے تو سب کی نماز جائز ہوگی کیونکہ ہر شخص نے اپنی انفرادی کوشش کے مطابق رخ کیا۔ رہی امام کی سمت کی مخالفت تو یہ جواز نماز سے مانع نہیں۔ جیسا کہ جوف کعبہ میں (امام کے رخ سے بعض مقتدیوں کے رخ دیدہ و دانستہ مختلف ہوتے ہیں اور نماز ان کی درست ہوتی ہے)۔

جس شخص کو امام کی حالت کا علم ہو (اور اس کا رخ امام سے مختلف ہو تو) اس کی نماز فاسد ہوگی کیونکہ اس نے اپنے امام کو غلطی پر خیال کیا ہے۔

اسی طرح اگر وہ امام سے آگے بڑھ کر کھڑا ہو تو بھی نماز فاسد ہوگی کیونکہ وہ فرض مقام کا تارک ہے اس لیے کہ مقتدی کے لیے امام کے پیچھے کھڑا ہونا ضروری ہے)۔

بَابُ صِفَةِ الصَّلٰوۃ

نماز کی صفت کے بیان میں

فرائض نماز: نماز کے فرائض چھ ہیں۔

(۱) التحریمۃ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''رَبَّكَ فَكَبِّرْ'' اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ تکبیر تحریمہ سے مراد نماز شروع کرنے کی تکبیر ہے۔

(۲) قیام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''قُوْمُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی سے قیام کیا کرو۔

(۳) قراءۃ: ارشاد باری ہے۔ فَاقْرَءُوا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔

(۴) رکوع: (۵) سجود: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''وَارْكَعُوا وَاسْجُدُوا'' یعنی رکوع کرو اور سجدہ کرو۔

(۶) نماز کے آخر میں تشہد کی مقدار قعدہ نہ کرنا (یعنی بیٹھنا) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعودؓ کو تشہد سکھاتے ہوئے فرمایا کہ جب تو نے یہ کہہ لیا یا کر لیا تو تیری نماز مکمل ہوگئی۔ آپ نے تکمیل نماز کو اس فعل سے معلق فرمایا۔ خواہ کچھ پڑھا ہو یا نہ۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ ان چھ امور کے علاوہ سنت ہے۔ امام قدوریؒ نے لفظ سنت استعمال کیا ہے حالانکہ نماز میں کئی امور وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ جیسے قراءۃ فاتحہ۔ اس کے ساتھ سورۃ کا ملانا۔ مکرر افعال میں ترتیب کی رعایت ملحوظ رکھنا۔ قعدۂ اولیٰ۔ قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنا۔ وتروں میں قنوت پڑھنا۔ عیدین کی تکبیرات جہری نمازوں میں بلند آواز سے قراءۃ کرنا اور سرّی نمازوں میں آہستہ پڑھنا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی امر ترک کرنے کی صورت میں سجدۂ سہو لازم آتا ہے یہی صحیح ہے۔

سُنّة کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا وجوب سنة نبویہ سے ثابت ہے۔

مسئلہ :

جب نماز شروع کرے تو تکبیر کہے اس کی دلیل میں ہم آیة پیش کر چکے ہیں۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''نماز کی تحریم تکبیر ہے''۔

تکبیر تحریمہ احناف کے نزدیک شرط ہے (اور نماز سے خارج ہوتی ہے) امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے فرض کے لیے تکبیر کہی تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس سے نفل ادا کرے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تکبیر کے لیے وہ تمام امور شرط ہیں جو نماز

کے دیگر ارکان کے لیے شرط کی حیثیت رکھتے ہیں (جیسے استقبال قبلہ ، طہارت اور نیت وغیرہ) اس سے ثابت ہوا کہ تکبیر بھی رکنیت کی علامت ہے۔

احناف کا کہنا ہے قرآن کریم کی اس آیۃ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى میں نماز کو تکبیر پر عطف کیا گیا ہے عطف کا تقاضا یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہو ۔ اسی لیے تکبیر میں دوسرے ارکان کی طرح تکرار نہیں ہوتا اور شرائط کا لحاظ اس رکن کے مدنظر ہے۔ جو اس سے متصل ہوتا ہے ، یعنی قیام۔

مسئلہ :

تکبیر کہتے وقت ہاتھ بھی اٹھائے ، یہ سنت ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے اور "مع التکبیر" کے لفظ سے اشارۃً یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تکبیر کہنے اور ہاتھ اٹھانے میں مقارنت ہو ۔ امام ابو یوسفؒ سے اسی طرح سے مروی ہے اور امام طحاویؒ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ پہلے ہاتھ اٹھائے پھر تکبیر کہے ۔ کیونکہ اس کے ہاتھ اٹھانے کا یہ فعل گویا غیر اللہ کی کبریائی کی نفی کرتا ہے اور نفی اثبات پر مقدم ہوتی ہے (جیسے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں) ۔

مسئلہ :

اپنے ہاتھ اس قدر اوپر اٹھائے کہ اس کے ہاتھوں کے

انگوٹھے دونوں کانوں کی لو کے متوازی ہو جائیں۔ امام شافعیؒ کی رائے میں کندھوں تک اٹھائے۔ قنوت، عید اور نماز جنازہ کی تکبیرات میں بھی یہی اختلاف ہے وہ اپنی تائید میں حضرت حمید الساعدیؓ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ جب تکبیر کہتے تو ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے۔

احناف دلیل میں حضرت وائل بن حجر، براء اور انس رضی اللہ عنہم کی روایت پیش کرتے ہیں کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہا کرتے تو ہاتھ کانوں کے برابر تک اٹھایا کرتے" نیز ہاتھ اٹھانے کا مقصد ایک بہرے آدمی کو اطلاع دینا بھی ہے اور یہ اطلاع ہمارے موقف کے مطابق ہی ممکن ہے۔ امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت کو حالت عذر پر محمول کیا جائے گا۔

مسئلہ :

عورت اپنے ہاتھ کندھوں کی محاذات تک اٹھائے۔ یہی صحیح ہے اور یہ پردہ پوشی کے مناسب بھی ہے۔

مسئلہ :

اگر اللہ اکبر کی بجائے اَللّٰہُ اَجَلّ یا اَعْظَمُ یا اَلرَّحْمٰنُ اَکْبَرُ۔ یا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا یا اللہ تعالیٰ کا کوئی اور نام استعمال کیا تو طرفینؒ کے نزدیک جائز ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر تکبیر اچھی طرح ادا کر سکتا ہو تو بجز اَللّٰہُ اَکْبَرْ یا اَللّٰہُ الْاَکْبَرُ یا اَللّٰہُ الْکَبِیْر کے جائز نہ ہوگا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف پہلے دو کے ساتھ جواز ہے اور امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ صرف اَللّٰہُ اَکْبَرُ سے جائز ہے کیونکہ یہی منقول ہے اور اصل اس میں توقیف ہے (یعنی جس طرح شرع نے بتایا ہے اپنے قیاس کو اس میں دخل نہ ہوگا) ۔

امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ اکبر پر الف لام داخل کرنا ثناء میں بلیغ تر ہے تو وہ اس کا قائم مقام ہوگا ۔

امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ صفات الٰہیہ میں اَفْعَلُ اور فعیل کے صیغے یکساں حیثیت رکھتے ہیں ۔ (اس لیے اکبر اور کبیر میں کوئی فرق نہیں) بخلاف اس صورت کے جب وہ ان الفاظ کو اچھی طرح سے ادا نہ کر سکتا ہو تو دوسرے الفاظ کا استعمال بھی جائز ہے) کیونکہ وہ معنی پر تو قادر ہے مگر الفاظ پر نہیں ۔ (اس لیے اس کے ہم معنی الفاظ استعمال کر سکتا ہے) ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ تکبیر لغۃ میں اظہار تعظیم کے لیے ہے اور یہ مقصد مذکورہ تمام الفاظ سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

مسئلہ :

اگر فارسی زبان میں نماز کا افتتاح کیا ۔ یا فارسی زبان میں قراءۃ کی ، یا کسی جانور کو ذبح کرتے وقت فارسی میں تکبیر کہی ، حالانکہ وہ عربی اچھی طرح جانتا ہے تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہوگا ۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ

ذبیحہ کے علاوہ جائز نہ ہوگا۔ البتہ وہ عربی سے ناواقف ہو تو مذکورہ امور بزبان فارسی جائز ہوں گے۔ رہا تفصیلی کلام افتتاح یعنی تکبیر تحریمہ کے بارے میں تو امام محمدؒ عربی میں ادا کرنے میں امام اعظمؒ کے ساتھ ہیں (یعنی ہر عربی کلمۂ تعظیم سے افتتاح درست ہے) اور بزبان فارسی ادا کرنے میں امام ابو یوسفؒ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ (یعنی عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں تکبیر تحریمہ کو ادا کرنا جائز نہیں) کیونکہ عربی زبان کو وہ فضیلت حاصل ہے جس سے دوسری زبانیں محروم ہیں۔

جہاں تک قراءۃ کا تعلق ہے صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ قرآن منظوم عربی کلام کا نام ہے۔ جیسا کہ نص سے ظاہر ہے (قُرْاٰناً عَرَبِیّاً الآیۃ) البتہ عجز کے وقت معنی پر اکتفا کرنا جائز ہے۔ جیسے اشارے پر اکتفاء کرنا۔ بخلاف تکبیر ذبح کے کیونکہ ذکر تو ہر زبان میں ممکن ہوتا ہے۔

امام اعظمؒ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ ''وَاِنَّہٗ لَفِی زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ'' یعنی قرآن کریم پہلی کتابوں میں بھی موجود تھا اور یہ ظاہر ہے کہ عربی زبان میں نہ تھا اس بنا پر عجز کے وقت غیر عربی زبان میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ لیکن سنت متوارثہ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے وہ خطاکار ہوگا۔ فارسی کے علاوہ کسی زبان میں بھی ہو جائز ہے۔ (یعنی فارسی کی قید خصوصیت کی بنا پر نہیں۔ بلکہ بطور مثال ہے) یہی صحیح ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ آیۃ ہے۔ زبانوں کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی نہیں آتی۔

خلاف اعتداد میں ہے ۔ (یعنی غیر عربی ہی میں پڑھنے کو عادت نہ بنا لے) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز میں فساد نہیں ہوگا ۔

نوحؒ ابن ابی مریم اور شیخ ابوبکرؒ رازیؒ وغیرہ حضرات نے روایت کیا ہے کہ امام اعظمؒ نے اس مسئلہ میں صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اور یہ روایت قابل اعتماد ہے ۔

خطبے اور تشہدّ کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے اور اذان میں تعارف کا اعتبار ہوگا ۔

مسئلہ :

اگر اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ کہہ کر نماز کا افتتاح کیا تو جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ اس کی حاجت سے مخلوط ہے ۔ لہذا وہ خالص تعظیم نہ رہی ۔ اگر اَللّٰھُمَّ کے لفظ سے افتتاح کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے کیونکہ اس کا معنی یا اللہ ہے ۔ لیکن بعض کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اے اللہ ہمارے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرما ۔ تو یہ سوال ہوگا (تعظیم نہ ہوگی) ۔

مسئلہ :

(تکبیر کہنے کے بعد) اپنا دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر ناف کے نیچے رکھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔ ”دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر ناف کے نیچے رکھنا مسنون ہے“ ۔ یہ حدیث امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے کیونکہ وہ

ہاتھ چھوڑنے کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ پر بھی حجت ہے کہ وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھنے کو مسنون کہتے ہیں ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہاتھوں کا زیر ناف باندھنا تعظیم کے زیادہ قریب ہے اور مقصد بھی یہی ہے ۔ شیخینؒ کے نزدیک ہاتھ باندھنا قیام کی سنۃ ہے ۔ حتی کہ ثناء پڑھتے وقت بھی چھوڑے نہیں جاتے ۔ اصل یہ ہے کہ جس قیام میں بھی مسنون ذکر ہو اس میں ہاتھ باندھے جائیں اگر ذکر مسنون نہیں تو ہاتھ نہ باندھے جائیں اور یہی صحیح ہے اس لیے بحالت دعا قنوت اور نماز جنازہ ہاتھ باندھے جاتے ہیں ۔ قومہ اور عیدین کی تکبیرات میں چھوڑے جاتے ہیں ۔

پھر سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ آخر تک پڑھے امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ ثناء کے بعد یہ دعا بھی پڑھے إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ الآية کیونکہ حضرت علیؓ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کہا کرتے تھے ۔

طرفینؒ کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کا افتتاح کرتے تو تکبیر کہتے اور سبحانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ آخر تک پڑھتے اور اس پر اضافہ نہ فرماتے ۔ امام ابو یوسفؒ کی پیش کردہ حدیث تہجد پر محمول ہے اور جَلَّ ثَنَاؤُكَ کے الفاظ مشہور روایة میں مذکور نہیں ۔ لہذا انہیں فرائض میں نہ پڑھے ۔ بہتر یہی ہے کہ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ الآية تکبیر سے پہلے بھی نہ پڑھے ۔ تاکہ نیت تکبیر کے ساتھ متصل ہو اور یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

ثناء کے بعد اَعُوذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''جب قرآن مجید پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگا کرو'' اِذْ قَرَأْتَ الْقُرْآنَ کا مطلب اذَا أَرَدْتَ قِرَاءَةَ الْقُرْآن ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اَسْتَعِیذُ باللہ کہے تاکہ الفاظ قرآن کریم کے موافق ہوں اور اعوذ باللہ بھی اس کے قریب ہی ہے۔

مذکورہ بالا پیش کردہ آیۃ کو ملحوظ رکھتے ہوئے طرفین کی رائے میں تعوُّذ قراءۃ کے تابع ہے ثناء کے نہیں حتی کہ مسبوق اسے پڑھے مقتدی نہ پڑھے۔ تعوُّذ تکبیراتِ عید کے بعد پڑھا جائے۔ ابو یوسفؒ کو اس میں اختلاف ہے۔

مسئلہ :

تعوُّذ کے بعد بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم پڑھے اسی طرح مشہور روایت میں منقول ہے۔

مسئلہ :

تعوذ اور تسمیہ دونوں کو آہستہ پڑھے کیونکہ ابن مسعودرضؓ نے ان چار امور کا تذکرہ کیا جو امام آہستگی سے ادا کرتا ہے ان میں انہوں نے تعوذ، تسمیہ اور آمین کا ذکر بھی فرمایا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں قراءۃ

سے پہلے بسم اللہ بھی بلند آواز سے پڑھے کیونکہ روایۃ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز میں تسمیہ کو اونچی آواز سے پڑھا ۔

احناف کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایۃ تعلیم دینے پر محمول ہے کیونکہ حضرت انسؓ کا ارشاد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اونچی آواز میں تسمیہ نہیں کہتے تھے ۔

امام حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کیا ہے کہ نماز کے شروع میں صرف ایک مرتبہ تسمیہ پڑھے ۔ تعوذ کی طرح ہر رکعت میں نہ پڑھے لیکن امام ابو یوسفؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے کہ ہر رکعت میں احتیاطاً پڑھ لیا کرے اور یہی صاحبینؒ کا قول ہے (اور اسی پر عمل ہو رہا ہے ۔

سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان بسم اللہ نہ پڑھی جائے لیکن امام محمدؒ کے نزدیک سرّی نمازوں میں پڑھی جائے ۔

مسئلہ :

پھر فاتحۃ الکتاب اور ایک سورۃ یا جس سورۃ سے چاہے تین آیات پڑھے ۔ قراءۃ فاتحہ ہمارے نزدیک رکن نہیں ۔ اس طرح اس کے ساتھ سورۃ کا ملانا بھی رکن نہیں ۔

امام شافعیؒ کو فاتحہ کے بارے میں اختلاف ہے اور امام مالکؒ کو فاتحہ اور سورۃ دونوں کے بارے میں ۔ امام مالکؒ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”سورۃ فاتحہ

اور اس کے ساتھ ایک سورۃ کے بغیر نماز نہیں ہوتی ۔
امام شافعی کی دلیل آنحضرت کا یہ ارشاد ہے کہ فاتحۃ الکتاب کے سوا نماز نہیں ہوتی" ۔

ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "فَاقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآن" یعنی قرآن کریم سے جو آسان ہو پڑھو ۔ کتاب اللہ پر خبر واحد سے اضافہ جائز نہیں ۔ البتہ خبر سے وجوب کا پتا چلتا ہے اور ہم بھی وجوب کے قائل ہیں ۔

مسئلہ :

امام وَلاَ الضَّآلِّين کہنے کے بعد آمین کہے اور مقتدی بھی آمین کہیں ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو ۔

امام مالکؒ کی اس حدیث إِذْ قَالَ الْاِمَامُ وَلَاالضَّآلِّين فقولوا آمین اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ تقسیم ہے (کہ امام وَلَا الضَّآلِّين کہے اور مقتدی آمین کہیں) کیونکہ آخر میں آنحضرتؐ کا فرمان ہے "فَاِنَّ الْاِمَامَ يَقُولُهَا" یعنی امام بھی آمین کہتا ہے ۔

مسئلہ :

آمین آہستہ کہی جائے ۔ اس کی تائید میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت پیش کی جا چکی ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ آمین دعا کی حیثیت رکھتی ہے اور دعا کا مبنی

اخفاء پر ہوتا ہے آمین میں مدّ اور قصر دونوں جائز ہیں۔ لیکن میم پر تشدید پڑھنا فحش غلطی ہے۔

مسئلہ :

پھر تکبیر کہے اور رکوع میں چلا جائے۔ امام محمدؒ نے جامع صغیر میں نقل کیا ہے کہ جھکنے کے ساتھ ساتھ تکبیر کہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جھکنے اور اٹھنے کے وقت تکبیر کہا کرتے تھے۔

مسئلہ :

تکبیر کو خوب حذف کر کے کہے کیونکہ اس کے اول کو مد سے پڑھنا شرعی طور پر ممنوع ہے۔ اس لیے کہ مد کرنے سے استفہام بن جاتا ہے۔ (کہ کیا اللہ تعالیٰ بڑا ہے) اور آخر میں مد سے پڑھنا لغۃ کے لحاظ سے لحن (یعنی غلط) ہے۔

مسئلہ :

رکوع کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو اس طرح تھام لے کہ ہاتھوں کی انگلیاں کھلی ہوں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے انسؓ سے فرمایا ”جب رکوع کرو تو اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھا کرو اور انگلیوں کو کھول دیا کرو“۔

حالت رکوع کے علاوہ اور کسی حالت میں انگلیاں کھولنے کی ترغیب نہیں دی گئی۔ تاکہ گھٹنوں کو پکڑنے

میں زیادہ قابو حاصل ہو ۔ انگلیاں کھول کر پکڑنے سے گرفت مضبوط ہو جاتی ہے) اور صرف سجدہ کی حالت میں انگلیاں ملا کر رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ان کے علاوہ انگلیوں کو اپنی عادت پر چھوڑ دے ۔

رکوع کی حالت میں اپنی پیٹھ کو ہموار رکھے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع فرماتے تو پشت مبارک کو ہموار رکھتے ۔ سر کو نہ تو اونچا رکھے اور نہ بہت جھکائے (بلکہ پیٹھ کے متوازی رکھے (کیونکہ آنحضرت ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک نہ تو جھکائے رکھتے اور نہ اٹھائے رکھتے) بلکہ پشت مبارک کے متوازی رکھتے) ۔

رکوع میں تین بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہے یہ تین بار کہنا ادنیٰ مقدار ہے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب تم رکوع کرو تو رکوع میں تین بار ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہا کرو اور یہ ادنیٰ درجہ ہے“ کیونکہ تین جمع کے کمال کا ادنیٰ درجہ ہیں ۔

مسئلہ :

پھر اپنا سر اٹھائے اور ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه“ کہے اور مقتدی ”رَبَّنَا لَكَ الْحَمْد“ کہیں ۔ امام اعظمؒ کے نزدیک امام تحمید نہ کہے ۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ امام بھی آہستہ سے کہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ (تسمیع اور تحمید دونوں) ذکر جمع فرمایا کرتے تھے دوسری بات یہ ہے کہ جب امام دوسروں کو حمد کی ترغیب دے رہا ہے تو خود کو نہ بھول جائے۔

امام اعظمؒ کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه" کہے تو تم رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" کہا کرو۔ یہ (امام اور مقتدیوں کے درمیان) تقسیم ہے اور شرکت کے منافی ہے اسی باعث مقتدی تسمیع نہیں کہتا۔

امام شافعیؒ کا اختلاف مروی ہے۔ امام اعظمؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر امام بھی تحمید کہے تو اسکی تحمید مقتدی کی تحمید کے بعد ہوگی اور یہ موضوع امامت کے خلاف ہے (کہ امام مقتدی کی متابعت کرنے لگے)۔

صاحبینؒ کی پیش کردہ روایت اکیلے نماز پڑھنے کی حالت میں ہے۔ صحیح روایت کے مطابق منفرد (تسمیع و تحمید) دونوں کو جمع کرے۔

امام اعظمؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ منفرد فقط تسمیع پر اکتفاء کرے اور ایک روایت میں ہے کہ تحمید پر اکتفاء کرے اور امام بوجہ ترغیب دینے کے معنوی طور پر خود بھی ادا کرنے والا ہوتا ہے۔

مسئلہ :

جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو تکبیر کہہ کر سجدے میں چلا جائے تکبیر اور سجدے کی دلیل ہم بیان کر چکے

ہیں ۔ سیدھا کھڑا ہونا یعنی قومہ فرض نہیں ہے ۔ اسی طرح دو سجدوں کے درمیان جلسہ اور رکوع و سجود میں طمانیت بھی فرض نہیں ۔ یہ طرفینؒ کا مسلک ہے ۔ امام ابو یوسفؒ ان تمام امور کی فرضیت کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے ۔ ان کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے اس اعرابی کو جس نے جلد جلد نماز پڑھ لی تھی مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اٹھ ! اور پھر نماز پڑھ کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی'' ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ لُغَۃ میں رکوع جھک جانے اور سجدہ پست ہو جانے کو کہتے ہیں ۔ پس رکنیت کا تعلق ان دونوں میں کم از کم سے ہوگا (یعنی اگر تھوڑی دیر جھکا اور تھوڑی دیر ہی پست رہا تو رکن رکوع اور سجدہ پایا گیا) یہی صورت انتقال ہیئت کی ہے کیونکہ وہ مقصود نہیں اور آپ کی روایت کردہ حدیث کے آخر میں اسے نماز کا نام دیا گیا ہے ۔ چنانچہ فرمایا کہ ''اگر تو نے اس سے کچھ کمی کی تو تُو اپنی نماز میں کمی کرے گا'' ۔

قومہ اور جلسہ طرفین کے نزدیک سُنَّۃ ہیں اور جُرجانی کی تخریج کے مطابق طمانیت کی بھی یہی حالت ہے ۔ لیکن تخریج کرخی کے مطابق طمانیت واجب ہے حتی کہ کرخی کے نزدیک ترک طمانیت سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے ۔

مسئلہ :

سجدے میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے کیونکہ وائل بن حجرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز

پڑھ کر دکھائی جب سجدہ کیا تو دونوں ہتھیلیوں سے زمین پر ٹیک لگائی اور سرین کو اونچا رکھا۔

سجدے کی حالت میں چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان ہو اور دونوں ہاتھ کانوں کے مقابل ہوں۔ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا ہی کیا۔

اپنے ماتھے اور ناک پر سجدہ کرے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اسی پر مداومت فرمائی۔

مسئلہ :

اگر صرف ایک پر اکتفاء کرے تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ کسی عذر کے بغیر صرف ناک پر اکتفاء کرنا جائز نہیں۔ امام اعظمؒ سے بھی یہی روایت ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "مجھے سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم ملا ہے"۔ اور آپ نے پیشانی کو بھی ان سات میں شمار فرمایا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چہرے کے بعض حصے کے رکھنے سے بھی سجدے کا تحقّق ہو جاتا ہے اور کتاب اللہ میں یہی مامور بہ ہے۔ البتہ رخسار اور ٹھوڑی اجماعی طور پر خارج ہیں اور مشہور روایت میں وجہ یعنی چہرہ مذکور ہے۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کا رکھنا ہمارے نزدیک سنّۃ ہے کیونکہ سجدہ کا تحقق ان دونوں کے رکھے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔

امام قدوریؒ نے ذکر کیا ہے کہ دونوں قدموں کا

زمین پر رکھنا سجود میں فرض ہے۔

مسئلہ :

اگر پگڑی کے پیچ پر یا فاضل کپڑے پر سجدہ کرے تو جائز ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ پگڑی کے پیچ پر سجدہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی روایة ہے کہ آپ نے ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کی اور اس کے زائد حصے سے زمین کی حرارت و برودت سے بچاؤ کیا۔

سجدے میں اپنے دونوں بازو ظاہر کرے (یعنی انھیں پیٹ اور رانوں کے ساتھ نہ ملائے) کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ وَأَبْدَ ضَبْعَيْكَ یعنی اپنے بازو ظاہر کیا کرو اور دوسری روایت میں اَبِدّ کا لفظ مذکور ہے جو ابداد یعنی کھینچنے سے ماخوذ ہے (کہ ہاتھوں کو پیٹ وغیرہ سے کھینچ کر رکھے) اور پہلا لفظ ابداء بمعنی اظہار سے ماخوذ ہے۔

مسئلہ :

سجدے کی حالت میں پیٹ کو رانوں سے ہٹا کر رکھے کیونکہ آنحضرت ﷺ جب سجدہ کرتے تو (پیٹ اور رانوں میں) فاصلہ رکھتے حتی کہ اگر بھیڑ کا بچہ آپ کے ہاتھوں کے بیچ سے گزرنا چاہتا تو گزر سکتا۔ کہا گیا ہے کہ جب صف کے اندر کھڑا ہو تو بازو زیادہ نہ پھیلائے تاکہ ساتھ والے کو تکلیف نہ ہو۔

مسئلہ :

بحالت سجدہ پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب ہو۔

کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب مؤمن سجدہ کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء سجدہ کرتے ہیں۔ لہذا اپنے اعضاء کو اپنی وسعت کے مطابق قبلہ کی طرف متوجہ کرے۔

مسئلہ:

اپنے سجود میں تین بار ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی“ کہے اور یہ ادنٰی مرتبہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو سجدہ میں تین بار ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیَ“ کہے اور یہ ادنٰی درجہ ہے۔ یعنی کمال جمع کا ادنٰی درجہ ہے۔ مستحب یہ ہے کہ رکوع اور سجود میں تین بار سے زیادہ تسبیحات کہے لیکن طاق عدد پر ختم کرے (یعنی پانچ۔ سات یا نو بار) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طاق عدد پر ختم کرتے تھے۔

اگر امام ہو تو تسبیحات اس قدر زیادہ نہ کہے کہ مقتدی تنگ آ جائیں اور یہ فعل نفرت دلانے کی حد تک نہ پہنچے (ورنہ لوگ جماعت سے انحراف کر جائیں گے)۔

رکوع و سجود کی تسبیحات سُنّۃ ہیں کیونکہ نص رکوع و سجود کو شامل ہے، تسبیحات کو نہیں۔ لہذا نص پر اضافہ نہ کیا جائے گا۔

مسئلہ:

عورت سجدے میں پست ہو جایا کرے اور پیٹ کو

رانوں سے ملایا کرے کیونکہ ایسا کرنے میں اس کے لیے زیادہ پردہ ہے۔

مسئلہ :

پھر اپنا سر اٹھائے اور تکبیر کہے۔ جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں جب اچھی طرح اطمینان سے بیٹھ جائے تو تکبیر کہے اور دوسرا سجدہ کرے حدیث اعرابی میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ''پھر اپنا سر اٹھا یہاں تک کہ تو سیدھا بیٹھ جائے''اگر سیدھا نہ بیٹھا اور تکبیر کہہ کر دوسرا سجدہ کر دیا تو طرفینؒ کے نزدیک جائز ہوگا۔ ہم پہلے اس کا تذکرہ کر چکے ہیں۔

مشائخ نے سر اٹھانے کی مقدار میں کلام کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگر وہ سجدے کے زیادہ قریب ہو تو جائز نہ ہوگا کیونکہ وہ سجدہ ہی میں شمار ہوگا اگر سیدھا بیٹھنے کے قریب ہو تو جائز ہے کیونکہ اس صورت میں وہ بیٹھا ہوا ہی شمار کیا جائے گا اور دوسرا سجدہ بھی متحقق ہو جائے گا۔

مسئلہ :

جب دوسرے سجدہ کو اطمینان سے پورا کر لے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، تو تکبیر کہے اور پنجوں کے بل سیدھا کھڑا ہو جائے اور بیٹھے نہیں نہ ہاتھوں سے زمین پر ٹیک ہی لگائے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خفیف سا جلسہ کرے پھر زمین پر ٹیک لگاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو آنحضرت ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔
ہماری دلیل حضرت ابو ھریرہؓ کی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے اور امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایۃ بڑھاپے کی حالت پر محمول ہے۔ نیز دوسری بات یہ ہے کہ قعدہ استراحت کے لیے ہوتا ہے اور نماز کا مقصد استراحت نہیں۔

مسئلہ :

دوسری رکعت میں بھی پہلی رکعت کی طرح (افعال کی ادائیگی) کرے کیونکہ اس میں تکرار ارکان ہوتا ہے۔ البتہ دوسری رکعۃ میں ثناء اور تعوذ نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں صرف ایک ہی بار مشروع ہیں۔

مسئلہ :

پہلی تکبیر کے علاوہ اور کہیں بھی ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت بھی رَفْع یَدَیْن کیا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سات مواقع پر رَفْع یَدَیْن کیا جائے۔ (۱) تکبیر تحریمہ (۲) تکبیر قنوت (۳) تکبیرات عیدین اور باقی چار حج میں مذکور ہیں۔ رَفْع یَدَیْن کے بارے میں جس روایت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

وہ ابتداء میں ہونے پر محمول ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ سے اسی طرح منقول ہے۔

مسئلہ :

دوسری رکعة میں جب دوسرے سجدے سے سر اٹھائے تو دائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جائے اور بایاں پاؤں کھڑا کر دے، پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلے کی جانب رکھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اسی طرح آنحضرت ﷺ کا نماز میں بیٹھنا بیان فرمایا۔ اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی کر دے اور تشہد پڑھے۔ حضرت وائلؓ کی حدیث میں اسی طرح مروی ہے نیز انگلیاں پھیلانے سے ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو جاتا ہے۔

مسئلہ :

عورت (قعدہ میں) بائیں سرین پر بیٹھے اور دونوں قدم دائیں جانب نکال لے کیونکہ اس صورت میں پردہ زیادہ رہتا ہے۔

مسئلہ :

تشہد اس طرح ہے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ والطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِلَی آخرہ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کا تشہد ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس طرح تشہد سکھایا جس طرح قرآن کریم کی کوئی سورة سکھاتے تھے اور فرمایا یوں

کہا کرو ۔ اَلتَّحِیَّاتُ للہ اس تشہد کو معمول بنانا ابن عباس والے تشہد کو اختیار کرنے سے اولیٰ ہے اور وہ اس طرح ہے ۔ اَلتَّحِیَّاتُ اَلْمبَارَکَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ سَلَامٌ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہ سَلَامٌ عَلَیْنَا الخ کیونکہ ابن مسعودؓ والی روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے اور امر کا کم از کم درجہ استحباب ہے اور اس میں الف اور لام استغراق کے لیے ہیں اور (وَالصَّلَوَاتُ سے پہلے) واو کا اضافہ تجدید کلام کے لیے ہے جیسا کہ قسم میں ۔ نیز اس تشہد میں تعلیم کی تاکید موجود ہے ۔

مسئلہ :

قعدۂ اولیٰ میں تشہد سے زیادہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وسط نماز اور آخر نماز میں تشہد کی تعلیم دی وسط نماز میں تشہد سے فارغ ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے اور جب نماز کے آخر میں ہوتے تو اپنے لیے حسب خواہش دعا کرتے ۔

مسئلہ :

آخر کی دو رکعتوں میں صرف فاتحۃ الکتاب پڑھے۔ حضرت ابو قتادہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت نے دو آخری رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کی قراءۃ فرمائی اور یہ افضل سورۃ کا بیان ہے ۔ یہی صحیح ہے کیونکہ قراءۃ صرف پہلی دو

رکعتوں میں فرض ہے جیسا کہ ہم إن شاء اللہ تعالیٰ بیان کریں گے۔

مسئلہ :

آخری قعدہ میں پہلے قعدہ کی طرح بیٹھے۔ اس کی دلیل میں ہم حضرت وائلؓ اور حضرت عائشہؓ کی احادیث پیش کر چکے ہیں کیونکہ اس طرح قعدہ کرنے میں بدن کو مشقت ہوتی ہے (اور جس امر سے مشقت ہو وہ افضل ہوتا ہے) تو قعدہ کی یہ صورت اس تورّک والی صورت سے اولیٰ ہوگی جس کی طرف امام مالکؒ کا میلان ہے اور انھوں نے جو روایۃ پیش کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متورّک حالت میں (یعنی پاؤں بچھا کر) بیٹھے۔ اسے امام طحاویؒ نے ضعیف قرار دیا ہے یا بڑھاپے کی حالت پر محمول کیا ہے۔

مسئلہ :

دوسرے قعدہ میں بیٹھ کر تشہد پڑھے۔ یہ ہمارے نزدیک واجب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے یہ ہمارے نزدیک فرض نہیں۔ امام شافعیؒ کا (تشہد اور درود) دونوں میں اختلاف ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تو نے یہ کہا یا کیا تو تیری نماز پوری ہو گئی۔ اگر تو کھڑا ہونا چاہے تو کھڑا ہو جا اور بیٹھنا چاہے تو بیٹھا رہ"۔

نماز کے علاوہ آنحضرت پر درود پڑھنا واجب ہے یا تو ایک بار جیسا کہ امام کرخیؒ نے کہا۔ یا جب بھی آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جائے ۔ جیسا کہ امام طحاویؒ نے اختیار کیا ہے ۔ پس حکم کا بار عظیم ہم پر سے کفایت کیا گیا (یعنی نماز کے علاوہ اگر کوئی شخص حضورؐ کا نام نامی سنے تو ہر مرتبہ درود شریف پڑھے یا کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور پڑھے ۔ بعض نے کہا ہے کہ مجلس میں یہ فرض کفایا کی حیثیت رکھتا ہے) (سوال ۔ ابن مسعودؓ کی روایت کے ابتداء میں یہ الفاظ ہیں ۔ کُنَّا نَقُولُ قَبْلَ اَنْ یُفْرَضَ عَلَیْنَا التشہد الحدیث یفرض سے تشہد کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ مگر آپ نے فرضیت کی نفی کی ہے صاحب ھدایہ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں) اور تشہد میں فرض کا جو لفظ مروی ہے وہ اندازے اور تقدیر کے معنی میں ہے (یعنی ہم وہ تشہد اپنے اندازے سے پڑھتے تھے) ۔

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تشہد کے آخر میں ایسے الفاظ سے دعا کرے جو قرآن کریم اور ادعیۂ مأثورہ سے ملتے جلتے ہوں ۔ اس کی دلیل عبداللہ ابن مسعودؓ کی وہ حدیث ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں آپؓ کو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا : ”پھر دعا میں سے وہ اختیار کر جو بہت پاکیزہ ہو اور تجھے بہت ہی پسند ہو“ ۔

دعا سے قبل آنحضرت ﷺ پر درود پڑھے (تب دعا کرے) تاکہ دعا اجابت کے قریب ہو جائے ۔

مسئلہ :

فساد سے بچنے کے لیے ایسے الفاظ سے دعا نہ کرے جو لوگوں کے کلام کے مشابہ ہوں ۔ اس لیے نمازی وہ مأثورہ دعا پڑھے جو محفوظ ہو اور جس کا بندوں سے مانگنا محال نہ ہو ۔ جیسے اس کا یہ کہنا اے اللہ ! فلاں عورت میرے نکاح میں دے دے ۔ بندوں کے کلام کے مشابہ ہے اور جس کا بندوں سے مانگنا محال ہو جیسے اس کا یہ کہنا یا اللہ ! مجھے بخش دے ان کے کلام میں سے نہیں ہے اور یہ کہنا اے اللہ ! مجھے رزق دے پہلی قسم میں سے ہے کیونکہ یہ کلام لوگوں میں باہم مستعمل ہے ۔ کہا جاتا ہے ۔ رَزَقَ الْأَمِيرُ الْجَيْشَ یعنی امیر نے لشکر کو رزق دیا ۔

مسئلہ :

پھر اپنی دائیں طرف سلام پھیرے اور اَلسَّلامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ کہے اسی طرح اپنی بائیں طرف بھی سلام پھیرے ۔

حضرت ابن مسعودرض نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائیں جانب سلام پھیرتے حتی کہ آپ کے دائیں رخسار کی سفیدی نظر آنے لگتی اور اسی طرح بائیں جانب سلام پھیرتے حتی کہ آپ کے بائیں رخسار کی سفیدی دکھائی دیتی ۔

مسئلہ :

پہلے سلام کے وقت اپنی دائیں جانب کے مردوں عورتوں اور محافظ فرشتوں کی نیت کرے ۔ اسی طرح دوسرے سلام کے وقت (بائیں جانب کے مردوں ، عورتوں اور محافظ فرشتوں کی نیت کرے) کیونکہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہوتا ہے ۔ آج کل کے دور میں عورتوں کی نیت نہ کرے (بلکہ آج کل تو عورتیں مسجد میں نماز نہیں پڑھتیں) اور جو شخص نماز میں شریک ہی نہ ہو اس کی نیت بھی نہ کی جائے یہی صحیح ہے کیونکہ علیکم کا خطاب تو صرف حاضرین کا حصہ ہے ۔

مسئلہ :

مقتدی سلام کے وقت امام کی نیت بھی کرے ۔ اگر امام دائیں جانب ہو تو پہلے سلام میں اسکی نیت کرے اور اگر بائیں جانب ہو تو دوسرے میں ۔ اگر امام اس کے بالکل سامنے ہو تو ابو یوسفؒ کے نزدیک پہلے سلام میں نیت کرے کیونکہ دائیں جانب کو ترجیح حاصل ہوتی ہے ۔ امام محمدؒ کے نزدیک اور وہ امام اعظمؒ کا قول بھی ہے کہ دونوں جانب امام کی نیت کرے کیونکہ امام دونوں جانب سے حصہ دار ہے ۔

مسئلہ :

منفرد شخص محافظ فرشتوں کے علاوہ کسی اور کی نیت نہ کرے کیونکہ فرشتوں کے سوا اور کوئی بھی اس

کے ساتھ نہیں ہوتا اور امام دونوں سلاموں میں نیت کرے یہی صحیح ہے ۔

فرشتوں کی کسی معین تعداد کی نیت نہ کرے کیونکہ ان کی تعداد کے بارے میں روایات مختلف ہیں ۔ لہذا یہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان کے مشابہ ہے ۔ یعنی انبیاء کی تعداد کا ہمیں قطعی علم نہیں مگر ہم تعداد معین کیے بغیر سب پر ایمان رکھتے ہیں ۔

لفظ سلام کا ادا کرنا ہمارے نزدیک واجب ہے ، فرض نہیں ۔ امام شافعیؒ کا اختلاف مروی ہے ۔ وہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے تمسّک کرتے ہیں کہ نماز کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے ۔

ہماری دلیل ابن مسعودؓ کی روایت کردہ حدیث ہے (اس حدیث کے آخر میں اختیار دیا گیا : چاہے تو اٹھ کھڑا ہو یا چاہے تو بیٹھا رہ) تخییر فرضیت کے منافی امر ہے ۔ مگر ہم نے امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت کے پیش نظر احتیاطاً وجوب باقی رکھا ۔ اس جیسی خبر واحد سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی ۔ واللہ اعلم !

فَصْلٌ فِی الْقِرَاءَةِ

نماز میں قراءۃ کا بیان

مسئلہ :

اگر امام ہو تو فجر میں اور مغرب و عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں قراءۃ بلند آواز سے کرے اور آخری رکعتوں میں اخفاء سے کام لے - یہی متوارث ہے -

مسئلہ :

اکیلے نماز پڑھ رہا ہو تو اسے اختیار ہے چاہے تو جہر کر کے اپنے آپ کو سنائے کیونکہ وہ اپنے نفس کے حق میں امام ہے اور چاہے تو اخفاء کرے کیونکہ اس کی اقتداء میں ایسا کوئی شخص نہیں جسے سنانا مقصود ہو افضل جہر ہی ہے تاکہ منفرد کی ادا بھی جماعت کی ہیئت پر ہو -

مسئلہ :

ظہر اور عصر کی نمازوں میں امام اخفاء سے کام لے خواہ عرفہ ہی میں کیوں نہ ہو - آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے"- دن کی نمازیں عجماء ہیں یعنی دن کی نمازوں میں ایسی

قراءۃ نہیں ہوتی جو سنی جا سکے۔ عرفہ میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے، ہماری پیش کردہ حدیث امام مالکؒ پر حجت ہے۔

مسئلہ :

جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بھی جہر کرے کیونکہ جہر کے متعلق مشہور روایۃ موجود ہے۔ دن کے نفلوں میں اخفاء سے کام لے اور رات کے نفلوں میں منفرد کی فرض نمازوں کی طرح اسے اختیار ہے کیونکہ نفل فرضوں کا تتمہ ہوتے ہیں لہذا حکم میں بھی ان کے تابع ہوں گے۔

مسئلہ :

جس کی نماز عشاء فوت ہو جائے اور وہ طلوع آفتاب کے بعد اسے پڑھنا چاہے وہ اگر امامت کرے تو جہر کرے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ جبکہ لیلۃ التعریس کی صبح کو آپ نے فجر کی نماز جماعت سے قضاء کی تھی۔

اگر منفرد ہو تو یقیناً اخفاء کرے اور اسے جہر و اخفاء میں اختیار نہ ہوگا یہی صحیح ہے کیونکہ جہر یا تو حتماً جماعت کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے یا نماز وقت پر ادا ہو تو (پھر) منفرد کو اختیار ہوتا ہے اور یہاں دونوں میں سے کوئی صورت بھی موجود نہیں۔

مسئلہ :

جس شخص نے عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں صرف سورۃ

پڑھی اور فاتحۃ الکتاب نہ پڑھی تو پچھلی رکعتوں میں فاتحہ کا اعادہ نہ کرے اگر پہلی میں صرف فاتحہ پڑھے اور کچھ زیادہ نہ پڑھے (یعنی اسکے ساتھ کوئی سورۃ نہ پڑھے) تو آخری دونوں میں فتحہ اور سورۃ دونوں پڑھے اور جہر کرے ۔ یہ طرفینؒ کی رائے ہے ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک کی بھی قضاء نہ کرے کیونکہ جب کوئی واجب امر اپنے وقت اور مقام سے رہ جائے تو کسی دلیل کے بغیر اس کی قضاء نہیں کی جا سکتی ۔

طرفینؒ کی دلیل جو دونوں صورتوں میں وجہ فرق بھی ہے یہ ہے کہ قراءۃ فاتحہ اس طور پر مشروع ہے کہ اس پر سورۃ مترتب ہو پس اگر پچھلی رکعتوں میں فاتحہ مترتب ہوگی تو یہ مشروعیۃ کے خلاف ہے بخلاف اس صورت کے جبکہ سورۃ چھوڑ دے کیونکہ اس کی قضاء مشروع طریق پر ممکن ہے ۔

جامع صغیر میں اس مقام پر ایسا لفظ مذکور ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے ۔ مگر مبسوط میں استحباب کا لفظ مذکور ہے کیونکہ سورۃ اگر مؤخر ہو تو پہلی فاتحہ کے ساتھ متصل نہیں رہتی اور اس کی مشروعیۃ کا کماحقہ لحاظ رکھنا ممکن نہیں ۔

فاتحہ اور سورۃ دونوں میں جہر کرے ، یہی صحیح ہے ، کیونکہ جہر اور مخافتۃ کو ایک ہی رکعت میں جمع کرنا قبیح امر ہے اور نفل (یعنی غیر واجب امر) کا بدل

دینا اور وہ فاتحہ اخیرین ہے ، بہتر ہے ۔ اخفاء یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے اور جہر یہ ہے کہ دوسرے کو سنائے یہ فقیہ ابو جعفر الہندوانیؒ کی رائے ہے ، کیونکہ آواز کے بغیر صرف زبان کی حرکت کو قراءة نہیں کہا جا سکتا ۔

امام کرخیؒ فرماتے ہیں کمتر جہر یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے اور کمتر مخافتة حروف کا صحیح ادا کرنا ہے کیونکہ قراءة زبان کا فعل ہے کان کا نہیں اور لفظ کتاب میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور اسی اصل پر ہر وہ امر مبنی ہے جس کا تعلق نطق سے ہے جیسے طلاق ۔ عتاق اور استثناء وغیرہ ۔

مسئلہ :

امام اعظمؒ کے نزدیک قراءة کی کم از کم مقدار جو نماز میں کفایت کرتی ہے ایک آیة ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک تین چھوٹی یا ایک لمبی آیة ہے کیونکہ اس مقدار کے بغیر اسے قاری نہیں کہا جاتا ۔ پس اس سے کم پڑھنا ایک آیة سے بھی کم پڑھنے کے مشابہ ہوگا ۔

امام اعظمؒ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ''فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ'' اس میں ایک آیة یا اس سے زیادہ کی کوئی تفصیل نہیں ۔ البتہ ایک آیة سے کم تو اجماعی طور پر قراءة سے خارج ہے اور پوری آیة (خواہ چھوٹی ہو) تھوڑی آیة کے معنی اور حکم میں نہیں ہوتی ۔

مسئلہ :

سفر میں فاتحہ کے ساتھ جو سورۃ چاہے پڑھے ۔ آنحضرت ؑ سے مروی ہے آپ نے حالت سفر میں صبح کی نماز میں معوذتین پڑھیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ سفر نصف نماز ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے تو تخفیف قراءۃ میں بدرجہ اولیٰ مؤثر ہوگا ۔

یہ اس صورت میں ہے جب اسے چلنے اور سفر کرنے کی جلدی ہو اور اگر حالت امن و قرار میں ہو تو فجر کی نماز میں البروج اور انشقت جیسی سورتیں پڑھے تاکہ تخفیف کے ساتھ ساتھ رعایت سنۃ بھی ملحوظ رہے ۔

مسئلہ :

مقیم ہونے کی صورت میں فجر کی نماز میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ چالیس یا پچاس آیات پڑھے اور چالیس سے ساٹھ اور ساٹھ سے سو تک بھی مروی ہیں ۔ ہر ایک کے متعلق حدیث وارد ہے اور ان روایات میں توفیق کی صورت یہ ہے کہ رغبت کرنے والے لوگوں کے ساتھ سو آیات تک پڑھ سکتا ہے ، کاہل اور بے رغبت لوگوں کے ساتھ چالیس اور درمیانہ درجہ کے لوگوں کے ساتھ پچاس اور ساٹھ کے درمیان ۔ بعض نے اس طرح کہا ہے کہ راتوں کی درازی اور کمی کو مدنظر رکھے اور لوگوں کی مصروفیت اور فراغت کا لحاظ کرے ۔

مسئلہ :

نماز ظہر میں فجر کی طرح قراءۃ کرے (یعنی آیۃ کی

تعداد کے لحاظ سے) کیونکہ فجر اور ظہر وسعت وقت کے لحاظ سے برابر ہیں ۔ امام محمدؒ نے مبسوط میں فرمایا ہے أَوْ دُونَهُ کہ یا فجر سے کم پڑھے ۔ کیونکہ وہ مصروفیت کا وقت ہوتا ہے ۔ اس لیے لوگوں کو ملال (اور دقّت) سے محفوظ رکھتے ہوئے اس سے کچھ کم کردے ۔

مسئلہ :

عصر اور عشاء وسعت وقت کے لحاظ سے یکساں ہیں ۔ ان دونوں میں اوساط مفصل پڑھے [سورۃ الحجرات سے سورۃ والسَّماءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ تک طوال المفصل ہیں اور سورۃ لم یکن تک اوساط المفصل اور آخر تک قصار المفصل] اور مغرب میں اس سے کم یعنی قصار المفصل پڑھے اس مسئلے میں حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی ، جو انھوں نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا ، اصل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل ، عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھا کرو ۔ نیز مغرب چونکہ عجلت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے تخفیف زیادہ مناسب ہے ۔ عصر اور عشاء دونوں میں تأخیر مستحب ہے لیکن بعض اوقات طویل قراءۃ کی وجہ سے غیر مستحب وقت میں پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے ان میں اوساط مفصل کو مقرر کیا گیا ۔

مسئلہ :

فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو دوسری کی نسبت

طویل کرے کیونکہ اس طرح لوگوں کو جماعت میں شریک ہونے کا موقع مل جائے گا۔

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ظہر کی رکعتیں برابر ہیں۔ یہ شیخینؒ کی رائے ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہر نماز میں پہلی رکعت کو دوسری سے طویل کرنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ امر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ تمام نمازوں میں پہلی رکعت کو دوسری سے طویل فرمایا کرتے۔ شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ دونوں رکعتیں استحقاق قراءۃ میں مساوی درجہ رکھتی ہیں ، لہذا مقدار قراءۃ میں بھی یکساں ہوں گی۔ بخلاف فجر کے کہ وہ غفلت اور نیند کا وقت ہوتا ہے۔ آپ کی پیش کردہ روایت میں طوالت سے مراد یہ ہے کہ پہلی رکعت ثناء تعوذ اور تسمیہ کی بنا پر طویل ہو جاتی تھی۔ (پہلی یا دوسری رکعت میں) تین آیات سے کم مقدار کی کمی یا بیشی ہو جائے تو کوئی بات نہیں کیونکہ کسی حرج کے بغیر اس مقدار سے بچنے کا کوئی امکان نہیں (اور اتنا باریک حساب کرنا نماز میں مشکل ہے آنحضرت ﷺ نے بھی مغرب اور فجر میں معوّذتین کی قراءۃ فرمائی حالانکہ دوسری سورت پہلی سے لمبی ہے)۔

مسئلہ :

نماز میں کسی سورۃ کا معین کر لینا کہ اس کے علاوہ نماز ہی نہیں ہوتی درست نہیں ، کیونکہ ارشاد باری ''فَاقْرَءُوا

مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرآن" مطلق ہے ۔
اسی طرح قرآن کریم کے کسی خاص حصے کو خاص خاص نمازوں کے لیے معین کرنا بھی مکروہ ہے کیونکہ اس سے باقی حصوں کا ترک لازم آتا ہے (اور یہ ممنوع ہے نیز تفصیل کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ خاص حصے جو نماز کے لیے متعین کئے گئے ہیں ؛ دوسرے حصوں سے افضل ہیں) ۔

مسئلہ :

مقتدی امام کے پیچھے قراءة نہ کرے ۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ قراءة دوسرے ارکان نماز کی طرح ایک رکن ہے ، لہذا امام اور مقتدی دونوں اس میں شریک ہوں گے (جیسا کہ دوسرے ارکان میں شریک ہیں) ۔
ہماری دلیل آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی شخص کا امام ہو تو اس امام کی قراءة اس کی قراءة ہوگی ۔ اسی پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے ۔ یہ درست ہے کہ رکن قراءة امام اور مقتدی میں مشترک ہے ۔ لیکن مقتدی کا حصہ خاموش رہنا اور غور سے سننا ہے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جب امام قراءة کرے تو چپ رہا کرو" ۔
امامؒ محمد سے مروی ہے احتیاط کے پیش نظر مقتدی کا قراءة کرنا مستحسن ہے ۔ لیکن شیخینؒ کی رائے میں مکروہ ہے ، کیونکہ خلف الامام قراءة کرنے میں وعید موجود ہے

(قَالَ عَلَیْهِ السَّلَام مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الْاِمَام فَفِی فِیه جَمْرَۃٌ) جس نے خلف الامام قراءۃ کی اس کے منہ میں آگ کا انگارہ ہے۔

مسئلہ :

اگر امام آیۃ ترغیب یا ترهیب بھی پڑھے تو بھی مقتدی خاموشی سے سنتا رہے کیونکہ سماع اور سکوت نص سے ثابت ہیں۔ قراءۃ کرنا یا جنت کا طلب کرنا یا آگ سے پناہ مانگنا وغیرہ تمام امور نماز میں خلل پیدا کرتے ہیں اسی طرح خطبے میں بھی خاموش رہے۔

اسی طرح امام اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے تو سامعین خاموش رہیں کیونکہ خطبہ سننا فرض ہے۔ البتہ خطیب اگر یہ آیۃ پڑھے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیماً الآیۃ تو سامعین اپنے دل میں درود شریف پڑھیں جو شخص منبر سے (بہت) دور ہو اس کے بارے میں اختلاف ہے، مگر محتاط یہی ہے کہ انصات کے فرض کو بجا لانے کے لیے خاموش رہے (یعنی جس شخص تک خطیب کی آواز نہ پہنچ رہی ہو وہ بھی خاموش رہے تاکہ فرض انصات سے عہدہ برآ ہو سکے)۔

بَابُ الْاِمَامَة

امامت کا بیان

مسئلہ :

جماعت سنۃِ مؤکدہ ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جماعت منجملہ سنن ھُدی سے ہے - منافق کے سوا اس سے کوئی پہلو تہی نہیں کرتا -

مسئلہ :

لوگوں میں سے امامت کے لیے اولی وہ شخص ہے جو ان میں سے سنۃ کا زیادہ عالم ہو - امام ابو یوسف کا قول ہے ، جو ان میں سب سے اچھا قاری ہو اس کو امام بنایا جائے کیونکہ نماز میں قراءۃ ضروری ہے اور علم کی ضرورت اس صورت میں پیش آتی ہے جب کہ نماز میں کوئی حادثہ پیش آ جائے - مگر حادثے کا پیش آنا قلیل الوقوع ہے -

ہماری دلیل یہ ہے کہ قراءۃ کی احتیاج صرف ایک رکن کے پیش نظر ہے - لیکن علم کی ضرورت تمام ارکان نماز کے لیے ہے - (لہذا عالم کو قاری پر فوقیت حاصل ہوگی) -

اگر سب علم میں برابر رتبہ رکھتے ہوں تو سب سے بہتر قاری کو امام بنایا جائے گا - آنحضرت ؐ کا ارشاد گرامی ہے :

"قوم کی امامت وہ شخص کرے جو کتاب اللہ کو سب سے صحیح طور پر پڑھنا جانتا ہو ۔ اگر سب برابر ہوں تو سنۃ کو سب سے زیادہ جاننے والا حقدار ہوگا"۔ (سوال ۔ آپ نے قاری پر عالم کو فوقیت دی ہے مگر حدیث میں قاری کو عالم پر مقدم کیا گیا ہے؟ صاحب ھدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) اس زمانے میں جو شخص عمدہ قاری ہوتا تھا ، وہ عمدہ عالم بھی ہوتا تھا ، کیونکہ وہ حضرات قرآن کریم پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے احکام و مطالب سے بھی فیض یاب ہوتے تھے ۔ اس لیے حدیث میں قاری کو مقدم کیا گیا ۔ مگر ہمارے زمانے میں اس طرح نہیں ہوتا (بلکہ اکثر قاری احکام قرآن اور تشریحات آیات سے بے خبر ہوتے ہیں) اس لیے ہم نے عالم کو فوقیت دی ۔

اگر تمام علماء قراءۃ میں بھی یکساں درجہ رکھتے ہوں ، تو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار شخص امامت کا مستحق ہوگا ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جس نے متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی کی امامت میں نماز ادا کی" ۔

اگر زہد و اتقاء میں بھی سب مساوی ہوں تو ان میں سے عمر رسیدہ شخص امامت کے فرائض سر انجام دے ، آنحضرتؐ نے ابو ملیکہ کے دو بیٹوں سے فرمایا کہ "تم میں سے عمر میں بڑا امامت کے فرائض ادا کرے" دوسری بات یہ ہے کہ ایسے عمر رسیدہ عابد و زاہد عالم کے امام بنانے سے لوگ جماعت میں کثرت سے شریک ہوتے ہیں ۔

مسئلہ :

غلام کو امامت کے فرائض سونپنا مکروہ ہے کیونکہ اسے (آقا کے کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے) تعلیم کے لیے فراغت میسر نہیں ہوتی۔

بدّو کو بھی امام بنانا مکروہ ہے ، کیونکہ ان میں جہالت غالب ہوتی ہے ساری زندگی دیہات میں گزار دیتے ہیں ، جہاں تعلیم کے مواقع ہی نادر ہوتے ہیں۔

مسئلہ :

فاسق کی امامت بھی کراہت سے خالی نہیں کیونکہ وہ امور دین کا اہتمام نہیں کرتا (جیسا کہ متقی لوگ کرتے ہیں)۔

مسئلہ :

اندھے آدمی کی امامت بھی مکروہ ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو نجاست سے نہیں بچا سکتا۔

مسئلہ :

وَلَدُ الزِّنَاء کی امامت بھی مکروہ ہے ، کیونکہ اس کا باپ نہیں ہوتا۔ جو اس پر دست شفقت رکھے اس لیے اس پر جہالت غالب آ جاتی ہے۔ نیز ایسے لوگوں کی امامت میں جماعت کی تنفیر ہے ، کیونکہ لوگ حرامی شخص کی امامت کو پسند نہیں کرتے۔ لہذا اس کی امامت مکروہ ہے۔

مسئلہ :

ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص کہیں نماز پڑھا دے تو نماز جائز ہوگی ، کیونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے : "ہر نیک و بد کی اقتداء میں نماز پڑھ لیا کرو"۔ (ہاں انہیں مستقل طور پر امام بنانا مکروہ ہے) ۔

مسئلہ :

مقتدیوں کے ساتھ نماز میں امام زیادہ دیر نہ لگائے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "جو شخص لوگوں کی امامت کرے تو ان کے سب سے ضعیف و ناتواں جیسی نماز پڑھائے"۔ (یعنی نماز میں اتنی دیر لگائے جتنی ایک ضعیف آدمی برداشت کر سکتا ہے) کیونکہ ان میں مریض ، بوڑھے اور کام کاج والے لوگ ہوتے ہیں ۔

مسئلہ :

عورتوں کو (مردوں سے الگ) تنہا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ ان کی جماعت ارتکاب حرام سے خالی نہیں ۔ اور ان کی امام ننگوں کی جماعت کے امام کی طرح صف کے وسط میں کھڑی ہوتی ہے ، لہذا ننگے لوگوں کی جماعت کی طرح عورتوں کی جماعت بھی مکروہ ہے ۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کی امام وسط صف میں کھڑی ہو حضرت عائشہؓ نے اسی طرح کیا تھا ۔ (سوال ۔ جب عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے تو حضرت عائشہؓ نے ایسا کیوں کیا ؟ مصنف جواب میں فرماتے ہیں کہ)

حضرت عائشہؓ کے جماعت کرانے کا یہ فعل ابتداء اسلام پر محمول ہے۔ (لہذا یہ منسوخ قرار دیا جائے گا)۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت کا امامت کے لیے آگے بڑھنا پردہ دری کا موجب بھی ہے۔

مسئلہ :

جو شخص کسی ایک آدمی کے ساتھ باجماعت نماز پڑھے تو وہ مقتدی کو اپنی دائیں جانب کھڑا کرے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نماز پڑھی اور انہیں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا۔

مسئلہ :

مقتدی امام سے پیچھے نہ رہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی کے پاؤں کی انگلیاں امام کی ایڑیوں کے متوازی ہوں۔ پہلی صورت زیادہ ظاہر ہے۔ اگر کسی مقتدی نے امام کے پیچھے یا اس کے بائیں جانب نماز پڑھی تو جائز ہوگی مگر سنت کی مخالفت کی بنا پر گناہگار ہوگا۔

اگر دو آدمیوں کی امامت کرے۔ تو امام مقتدیوں سے آگے کھڑا ہو (جیسا کہ عموماً جماعت کی صورت میں ہوتا ہے) امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ان کے وسط میں کھڑا ہو کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اسی طرح منقول ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت انس رض اور ایک یتیم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ان کے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ افضلیت کی صورت ہے اور آپ کی پیش کردہ روایت اباحت کی دلیل ہے (کہ نماز اس طرح بھی جائز ہے۔ مگر افضل صورت ہماری اختیار کردہ ہے)۔

مسئلہ :

مردوں کے لیے عورت یا بچے کی اقتداء میں نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ عورت کے بارے آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے۔ کہ "عورتوں کو مؤخر کرو جہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں (شہادت، وراثت اور ولایت وغیرہ میں) مؤخر کیا ہے"۔ اس لیے نماز میں عورت کا مقدم کرنا جائز نہیں۔

بچے کی اقتداء اس لیے جائز نہیں کہ احکام شریعۃ اس پر فرض نہ ہونے کی وجہ سے وہ نفل ادا کر رہا ہے اس لیے اس کے ساتھ فرض ادا کرنے والے کی اقتداء جائز نہیں۔

البتہ مشائخ بلخ نے تراویح اور سنن مطلقہ میں بچے کی اقتداء جائز قرار دی ہے، لیکن ہمارے مشائخ نے اسے بھی جائز تسلیم نہیں کیا۔

بعض حضرات نے نفل مطلق کے متعلق اسی طرح کا اختلاف امام ابو یوسف رح اور امام محمد رح کے درمیان بھی نقل کیا ہے۔ مگر مختار مذہب یہی ہے کہ ہر قسم کی نماز میں بچے کی اقتداء جائز نہیں کیونکہ بچے کے نفل بھی بالغ کے نفل سے درجہ میں کم ہوتے ہیں کیونکہ بچہ اگر نفل شروع

کرکے فاسد کر دے تو بالاجماع اس پر قضاء لازم نہیں مگر ایسی صورت میں بالغ آدمی پر قضاء ضروری ہے ۔ اس لیے ضعیف نماز پر قوی نماز کی بناء نہیں رکھی جا سکتی [اس اصول پر اعتراض کیا گیا آپ کا یہ کہنا کہ قوی کی بناء ضعیف پر نہیں ہو سکتی ، یہ اصول ہر جگہ درست نہیں ۔ مثلاً کسی شخص کو ظہر کی چار رکعت ادا کرنے کے بعد یہ شک ہو جائے کہ شاید اس نے دو ادا کی ہیں پھر وہ قعدہ کے بعد دو اور رکعت پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے ۔ ان دو رکعتوں میں کوئی اور شخص اگر فرض نماز کے لیے اس کی اقتداء کرے ، تو آپ کے نزدیک جائز ہے ، حالانکہ امام کی دو رکعتیں نفل کے درجہ میں ہیں اور مقتدی کے فرض ہیں ، تو کیا یہ قوی کی بناء ضعیف پر نہیں ؟ مصنف جواب میں فرماتے ہیں] نماز مظنونہ کا اس پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں اجتہاد کو دخل ہے ۔ (امام زفرؒ فرماتے ہیں اگر پہلی نماز کا مکمل ہونا اسے یاد آ جائے تب بھی یہ دو رکعتیں مکمل کرے ۔ اگر انہیں نامکمل چھوڑ دے تو اس پر قضاء واجب ہوگی ۔ بعض کے نزدیک قضاء واجب نہیں ہوتی ۔ چونکہ امام زفرؒ کے نزدیک ان کی تکمیل ضروری ہے ۔ اس لیے اگر کوئی شخص ان میں اقتداء کرے ، تو بناء القَوِیّ علی الضعیف والی صورت نہ ہوگی) ۔ پس مقتدی کے حق میں یہ (ظن والا) عارضہ معدوم متصور ہوگا (یعنی مقتدی نے تو یہی خیال کیا تھا کہ وہ فرض ادا کر رہا ہے ۔ لہذا اس کے حق میں عارضۂ ظن معدوم

ہے) ۔ بخلاف بچے کا بچے کے ساتھ اقتداء کرنا کیونکہ دونوں کی نماز یکساں اور متحد ہے ۔

مسئلہ :

(نماز باجماعت کے لیے) پہلے مرد صف بندی کریں ، پھر بچے اور اس کے بعد عورتیں صف بنائیں ، کیونکہ آنحضرت کا ارشاد ہے : "تم میں سے صاحب احلام اور صاحب عقل مجھ سے قریب رہیں ۔ نیز عورتوں کا مرد کے محاذی ہونا چونکہ مفسد نماز ہے اس لیے ان کو سب سے مؤخر (کھڑا) کیا جائے گا ۔

مسئلہ :

اگر مرد و عورت ایک ہی نماز میں شریک ہو رہے ہوں اور عورت مرد کے محاذی ہو جائے ۔ اگر امام نے عورت کی امامت کی نیت کی ہو تو مرد کی نماز (عورت کے محاذی ہونے کی بناء پر) فاسد ہو جائے گی ۔ قیاس تو یہ تھا کہ مرد کی نماز فاسد نہ ہو اور امام شافعی کی رائے بھی یہی ہے کیونکہ جس طرح عورت کی نماز (محاذات سے) فاسد نہیں ہوتی اسی طرح مرد کی نماز بھی فاسد نہیں ہونی چاہیے ، لیکن قیاس کو ترک کرتے ہوئے استحسان پر عمل کرنے کی وجہ مذکورہ بالا پیش کردہ حدیث ہے (یعنی أَخِّرُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَخَّرَهُنَّ اللهُ) اور یہ مشہور احادیث میں سے ہے اور (عورتوں کو) مؤخر کرنے کے مخاطب مرد ہیں نہ کہ

عورتیں ۔ اس لیے مرد کو فرض مقام کا تارک شمار کیا جائے گا لہذا اسی کی نماز فاسد ہوگی نہ کہ عورت کی ۔ جیسا کہ ایک مقتدی نماز میں امام سے آگے بڑھ جائے (تو اس مقتدی کی نماز فاسد ہوگی کیونکہ اس نے فرض مقام ترک کر دیا) ۔

اگر امام نے عورت کی امامت کی نیت ہی نہیں کی تو مرد کی نماز میں کوئی نقص پیدا نہ ہوگا لیکن عورت کی نماز جائز نہیں ہوگی کیونکہ نیت کے بغیر نماز میں شریک ہونا ہمارے نزدیک ثابت نہیں ۔ امام زفرؒ کو اس میں اختلاف ہے ۔ (اس امر کی دلیل کہ نیت کے بغیر اشتراک ثابت نہیں یہ ہے کہ ہر شخص کے کھڑے ہونے کی جگہ کی ترتیب امام پر لازم ہے لہذا اشتراک بھی امام کے التزام پر موقوف ہوگا ۔ (مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مقتدیوں کے مقام میں لحاظ رکھنا امام پر لازم ہے یعنی نماز پڑھنے والوں میں مردوں کے علاوہ اگر عورتیں بھی ہوں تو امام انہیں نص کے مطابق کھڑا کرے ۔ اسی طرح اشتراک بھی امام کے (نیت کرنے کے) التزام پر موقوف ہوگا اگر وہ عورت کی امامت کی نیت کا التزام کرے تو اشتراک ثابت ہوگا ورنہ نہیں) جیسا کہ اقتداء میں ہے (کہ اگر کوئی شخص امام کی اقتداء کی نیت کرے تو اس کے امام سے آگے بڑھنے سے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ۔ لیکن اگر اقتداء کی نیت نہ کرے تو جہاں بھی کھڑا ہو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی اسی طرح اگر عورت کی امامت کی نیت کی جائے تو محاذات سے مرد کی نماز باطل

ہو جائے گی اور اگر امام امامت کی نیت نہ کرے تو عورت خواہ کہیں کھڑی ہو مرد کی نماز باطل نہ ہوگی) ۔

نِیَّۃِ امامت کی شرط اس صورت میں ہے جب کہ عورت مرد کے محاذی ہو کر مقتدی بنے (صورت ا) لیکن اگر عورت کے پہلو میں کوئی شخص نہ ہو تو اس بارے میں دو روایتیں ہیں ۔ روایت ب اور ج اول (یعنی روایت ب) یہ کہ اگر عورت اکیلی امام کے پیچھے کھڑی ہو تو اس صورت میں نیت امامت ضروری ہے ۔ دوم (یعنی روایت ج) یہ کہ اس صورت میں نیت امامت ضروری نہیں ۔

دوسری روایت (یعنی روایت ج) کے مطابق وجہ فرق یہ ہے (یعنی صورت ا) اور روایت ''ب'' میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں نیت امامت ضروری ہے ۔ لیکن صورت ''ا'' اور روایت ''ج'' میں فرق ہے کہ ''ا'' میں نیت شرط ہے (اور ''ج'' میں نہیں کیونکہ) صورت اول (یعنی ''ا'') میں فساد لازم ہے اور روایت دوم (یعنی ''ج'') میں فساد احتمالی ہے ۔ (یعنی فساد یقینی طور پر نہیں) ۔

مسئلہ :

محاذات کی بعض شرائط یہ ہیں ۔ (۱) نماز مشترک ہو (یعنی مرد اور عورت ایک ہی قسم کی نماز پڑھ رہے ہوں ۔ ایک ہی امام کے مقتدی ہوں) (۲) نماز مطلق ہو (یعنی رکوع و سجود والی نماز ہو ۔ نماز جنازہ میں محاذات مفسد نہیں) (۳) عورت اہل شہوت سے ہو ۔ (اگر چھوٹی بچی ہو

تو محاذات باعث فساد نہیں) (۴) اور ان دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو کیونکہ محاذات کا مفسد ہونا خلاف قیاس ہے لیکن چونکہ اس کا فساد نص سے معلوم ہوا ہے اس لیے نص میں مذکور تمام شرائط کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ (اگر مذکورہ شرائط سے کوئی شرط بھی معدوم ہو تو محاذات مفسد نہ ہوگی)۔

مسئلہ :

عورتوں کے لیے مسجد میں آ کر جماعت میں شریک ہونا مکروہ ہے۔ یعنی نوجوان عورتوں کے لیے مسجد میں آنا مکروہ ہے کیونکہ ان کے پانچ وقت مسجد میں آنے سے کئی فتنے جنم لیں گے۔

مسئلہ :

فجر ، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں بوڑھی عورتوں کے آنے میں کوئی حرج نہیں ۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ بوڑھی عورتیں تمام نمازوں میں شرک ہو سکتی ہیں کیونکہ ان میں رغبت کی کمی کی وجہ سے کسی فتنے کا اندیشہ نہیں۔ بناء بریں ان کا نکلنا مکروہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ عید میں ہے (عید کی نماز میں بوڑھی عورتیں بالاتفاق شامل ہو سکتی ہیں)۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے۔ کہ شدت شہوت کی صورت میں فتنے کا امکان رہتا ہے اس لیے وقوع فتنہ کا اندیشہ موجود ہے۔ نیز ظہر ، عصر اور جمعہ کی نماز کے

وقت بد کردار اور فاسق لوگ ادھر آدھر منتشر ہوتے ہیں مگر فجر اور عشاء کے وقت وہ سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور مغرب کے وقت کھانے پینے میں مصروف ہوتے ہیں ۔ اس لیے ان اوقات میں فتنہ کا احتمال بہت کم ہوتا ہے) رہا بوڑھی عورتوں کا عید کی نماز میں شامل ہونا تو یہ اس بناء پر ہے کہ عید گاہ کھلی اور وسیع جگہ پر ہوتی ہے جہاں کہ مردوں سے کنارہ کشی اور یکسوئی ممکن ہوتی ہے ۔ اس لیے عید کی نماز میں شمولیت مکروہ نہ ہوگی ۔

مسئلہ :

پاک و طاہر شخص اس آدمی کے پیچھے نماز نہ پڑھے جو مستحاضہ کے حکم میں ہو (مثلاً جیسے سلس البول یا خروج ریح کی دائمی شکایت ہو) اور نہ طاہرہ عورت مستحاضہ عورت کی اقتداء کرے کیونکہ صحیح اور تندرست آدمی کی حالت معذور آدمی سے زیادہ مضبوط ہے اور ضعیف چیز قوی چیز کو متضمن نہیں ہوتی ۔ (یعنی کمزور چیز قوی چیز کی ضمانت نہیں بن سکتی ۔ اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ کا یہ مطلب ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن یعنی شامل ہوتی ہے (یعنی مقتدی کی نماز کی صحت اور عدم صحت کا مدار امام کی نماز کی صحت یا عدم صحت پر ہوتا ہے لیکن جب مقتدی کی نماز امام کی نماز سے قوی حالت والی ہو تو امام کی نماز مقتدی کی نماز کو کیسے متضمن ہو سکتی ہے اور مقتدی کی نماز کو امام کی نماز اپنے اندر کس طرح

شامل کر سکتی ہے) ۔

مسئلہ :

نہ تو قاری ان پڑھ کی اقتداء میں نماز پڑھے نہ لباس پہننے والا شخص ننگے آدمی کی اقتداء میں کیونکہ دونوں صورتوں میں مقتدی قوی حالت میں ہیں ۔

مسئلہ :

تیّمم کرنے والا وضو کرنے والوں کی امامت کر سکتا ہے ، یہ امام اعظمؒ اور ابو یوسفؒ کی رائے ہے ، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں کیونکہ تیمم طہارۃ ضروریہ ہے (جو صرف ضرورت کے تحت طہارۃ بنتا ہے) اور پانی سے طہارۃ کرنا طہارۃ اصلیہ ہے (لہٰذا مقتدی امام سے اقوی حالت والے ہوں گے)۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ تیمم طہارۃ مطلقہ ہے (یعنی کسی خاص وقت کے ساتھ مقیّد نہیں) اسی لیے مقدار حاجت تک محدود نہیں (بلکہ ایک ہی تیمم سے کئی نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں)۔

مسئلہ :

موزوں پر مسح کرنے والا پاؤں دھونے والوں کا امام بن سکتا ہے کیونکہ موزہ حدث کے قدم تک سرایت کرنے سے مانع ہے اور موزے میں جو کچھ داخل ہو جائے اسے مسح زائل کر دیتا ہے ۔ بخلاف مستحاضہ کے ، کیونکہ

حدث حقیقۃً موجود ہے تو شرعاً بھی اس کا زوال معتبر نہ ہوگا (بلکہ شرعی طور پر حدث موجود ہے اس لیے مجبوری کی بناء پر وہ اپنی نماز تو ادا کر سکتی ہے مگر امامت کی اہلیت سے محروم ہے)۔

مسئلہ :

کھڑا ہو کر نماز پڑھنے والا بیٹھ کر پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قاعد کی اقتداء قائم کے لیے جائز نہیں اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ قائم شخص قاعد کی بہ نسبت قوی الحال ہوتا ہے۔ مگر ہم نے نص کے پیش نظر قیاس کو ترک کر دیا۔ مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز بیٹھ کر پڑھی حالانکہ لوگ آپ کی اقتداء میں کھڑے تھے۔

مسئلہ :

اشارے سے نماز ادا کرنے والا اپنے جیسے آدمی کی اقتداء کر سکتا ہے کیونکہ حالت کے لحاظ سے دونوں یکساں ہیں، ہاں اگر مقتدی بیٹھ کر اشارہ کرنے پر قادر ہو اور امام لیٹ کر اشارہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں اقتداء جائز نہ ہوگی، کیونکہ بیٹھنا قابل اعتبار امر ہے (جو شخص بیٹھ کر اشاروں سے نفلی نماز پڑھ سکتا ہو اس کے لیے لیٹ کر پڑھنا درست نہیں) کیونکہ اس سے قوت ثابت ہوتی ہے۔

مسئلہ :

اسی طرح جو شخص رکوع و سجود پر قادر ہو،

وہ اشاروں سے پڑھنے والے کی اقتداء نہ کرے کیونکہ مقتد
امام سے قوی تر حالت میں ہے اس میں امام زفرؒ کا اختلاف
منقول ہے۔

مسئلہ :

فرض ادا کرنے والا نفل ادا کرنے والے کی اقتدا
نہ کرے کیونکہ اقتداء بناء ہے۔ حالانکہ امام کے حق میں
فرضیۃ کا وصف معدوم ہے (مقتدی میں فرضیۃ کا وصف
موجود ہے کیونکہ اسے فرض ادا کرنا ہے مگر) امام میں
فرضیۃ کا وصف معدوم ہے (کہ وہ نفل ادا کر رہا ہے)
اس لیے معدوم اس پر بناء متحقق نہیں ہوگی (جب اس
معدوم کی بناء ہی ثابت نہیں تو وہ اس موجود کا مبنی کیسے
بن سکتا ہے) ؟

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں جو شخص فرض نماز پڑھے وہ اس
شخص کی اقتداء نہیں کر سکتا جو کوئی دوسرا فرض پڑھ
رہا ہو کیونکہ اقتداء نام ہے اعمال میں امام کی موافقت
و متابعت اور شرکت کا۔ اس لیے دونوں میں اتحاد ضروری
ہے۔ (مگر ایسی صورت میں اتحاد موجود نہیں ہے کیونکہ
امام کا فرض مقتدی کے فرض سے مختلف ہے)۔
مذکورہ بالا تمام صورتیں امام شافعیؒ کے نزدیک جائز
ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اقتداء کا مفہوم یہ ہے کہ
بطریق موافقت ادا ہو (یعنی امام کے ساتھ ساتھ قیام، قعود،

رکوع و سجود وغیرہ کرتا جائے) مگر احناف کے نزدیک تضمّن و شمول بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ یعنی اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ (جب مقتدی اور امام کی نمازوں میں یکسانیت نہ ہو تو تضمن کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔

مسئلہ :

نفل پڑھنے والا فرض پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے کیونکہ مقتدی کو نفس نماز کی ضرورت ہے اور وہ امام کے حق میں موجود ہے اس لیے بناء متحقق ہے۔ (یعنی نماز میں دو باتیں مدّ نظر ہوتی ہیں ، اول اصل یعنی مطلق نماز دوم وصف۔ جیسے ظہر۔ عصر یا مغرب وغیرہ کی نماز۔ متنفّل کو اقتداء کے لیے اصل نماز کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی بناء پر متحقق ہو سکے اور وصف تو ایک زائد امر ہے نیز وصف میں إمام کی حالت قوی ہے)۔

مسئلہ :

جو شخص کسی امام کی اقتداء کرے لیکن بعد میں اسے پتا چلے کہ امام بے وضو تھا تو نماز کا اعادہ ضروری ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جو شخص لوگوں کی امامت کرے اور اسے علم ہو جائے کہ بے وضو تھا یا جنابت کی حالت میں تھا تو وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے اور اس کی اقتداء کرنے والے بھی اس نماز کا اعادہ کریں''۔

امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے۔ ان کی دلیل وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ (یعنی لِأَنَّ الْاقتداء عِنْدَهٗ آدَاءٌ عَلٰی سَبِیل الْمُوَافَقَة) اور ہم تضمن و شمول کے معنی کا اعتبار کرتے ہیں اور یہ معنی جواز و فساد میں بھی قابل اعتبار ہے۔ یعنی مقتدی کی نماز کی صحت و عدم صحت کا مدار امام کی نماز کی صحت و عدم صحت پر ہوگا۔

مسئلہ :

ایک ان پڑھ شخص نے امامت کے فرائض سر انجام دیے۔ اس کی اقتداء میں بعض لوگ قاری تھے اور بعض ان پڑھ تھے۔ امام اعظمؒ کی رائے میں ان کی نماز فاسد ہے۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ امام اور جاہل لوگوں کی نماز صحیح ہے کیونکہ معذور امام نے لوگوں کی امامت کرائی۔ جیسے ایک عُریان شخص چند عریاں اور چند لباس پہنے ہوئے لوگوں کو امامت کرائے (تو عریاں امام اور عریاں لوگوں کی نماز جائز ہوگی۔ لباس والوں کی فاسد ہوگی۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ قراءۃ پر قدرت ہونے کے باوجود امام نے فرض قراءۃ کو ترک کر دیا (کیونکہ اگر وہ کسی عالم کو آگے کھڑا کر دیتا تو یہ فرض فاسد نہ ہوتا اور وہ عالم کو امام بنانے پر قادر بھی تھا) تو امام کی نماز فاسد ہوگی کیونکہ وہ اگر قاری کو امامت کے فرائض سونپ دیتا تو قاری کی قراءۃ اس کی قراءۃ ہوتی۔ (آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے امام کی قراءۃ مقتدی کی قراءۃ

ہوتی ہے) - بخلاف مذکورہ مسئلے اور اس کی مثالوں کے - کیونکہ ان صورتوں میں جو امام کے حق میں موجود ہوتا ہے وہ مقتدی کے حق میں موجود قرار نہیں دیا جا سکتا (یعنی عریان آدمی کی امامت کو جاہل آدمی کی امامت پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ امام کی قراءۃ تو مقتدی کی قراءۃ بھی ہوتی ہے - مگر امام کا لباس مقتدی کے حق میں موجود قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ہم مقتدی کو بھی لابس کہہ سکیں - مثلاً لباس والا شخص عریان لوگوں کی امامت کرائے تو امام کا لباس اقتداء کرنے والوں کے حق میں لباس قرار نہیں پا سکتا لیکن امام کی قراءۃ اقتداء کرنے والوں کے حق میں بھی قراءۃ ہوتی ہے - اس لیے دونوں صورتوں میں بین فرق ہے) -

مسئلہ :

اگر قاری اور ان پڑھ الگ الگ نماز پڑھ رہے ہوں تو دونوں کی نماز جائز ہوگی - یہی صحیح ہے کیونکہ دونوں کی طرف سے جماعت کے لیے میلان نہیں پایا گیا -

مسئلہ :

اگر امام نے پہلی دو رکعتوں میں قراءۃ کی (بعد ازاں بے وضو ہوگیا) اور آخری دو رکعتوں میں جاہل کو خلیفہ بنا دیا تو ان سب مقتدیوں کی نماز فاسد ہوگی -

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ فاسد نہ ہوگی کیونکہ پہلی دو رکعتوں میں فرضِ قراءۃ ادا کیا جا چکا ہے - ہماری

دلیل یہ ہے کہ ہر رکعت (مستقل طور پر) نماز کا حکم رکھتی ہے۔ اس لیے تحقیقاً یا تقدیراً کوئی رکعت قراءۃ سے خالی نہیں ہوگی۔ (تحقیقاً جیسے پہلی دو رکعتوں میں۔ تقدیراً جیسے آخری دو رکعتوں میں یعنی امام اگر قراءۃ کرنا چاہے تو وہ قراءۃ پر قدرت رکھتا ہے۔ مگر ان پڑھ امام تو عدم اہلیت کی بناء پر تقدیراً بھی قراءۃ پر قادر نہیں۔

اسی طرح اگر امام چوتھی رکعت کے دوسرے سجدہ کے بعد حدث کا عارضہ پیش آئے اور آخری تشہد میں ان پڑھ کو خلیفہ بنا دے تو سب کی نماز فاسد ہوگی۔

واللہ أعلم بالصواب

بَابُ الْحَدَثِ فِی الصَّلَاۃِ

نماز میں حدث پیش آنے کا بیان

مسئلہ :

جو شخص نماز کے دوران بے وضو ہو جائے وہ وہاں سے ہٹ جائے اگر امام ہو تو کسی کو اپنا خلیفہ بنا دے۔ خود (جا کر) وضو کرے اور واپس آ کر اپنی سابقہ نماز پر) بناء کرے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ از سر نو شروع کرتا اور یہی امام شافعیؒ کا قول ہے کیونکہ حدث امام کے منافی امر ہے۔ نیز وہاں سے ہٹنا اور پھر وضو کر کے چل کر جانا بھی مفسد نماز ہیں (ان امور کے مد نظر یہ حدث بھی حدث عمد کے مشابہ ہوگا (اور حدث عمد میں جس طرح بناء جائز نہیں ہوتی اس صورت میں بھی جائز نہیں ہونی چاہیے۔

ہماری دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ''جس شخص کو نماز میں قے یا نکسیر یا مذی نکلنے کا عارضہ پیش آ جائے وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ وضو کرے اور اپنی نماز پر بناء کرے بشرطیکہ (اسی اثناء میں) کسی سے بات، نہ کی ہو۔ نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جب تم میں

سے کسی کو دوران نماز قے یا نکسیر کا عارضہ پیش آ جائے تو منہ پر ہاتھ رکھ لے اور اس شخص کو خلیفہ بنا دے جو سابقہ پوری نماز میں اس کا شریک ہو'' (یعنی مدرک کو خلیفہ بنائے مسبوق کو نہ بنائے) آپ کا اسے حدثِ عمد کے مشابہ کہنا درست نہیں کیونکہ حدث غیر عمد میں ابتلاء عام ہے اور حدثِ عمد میں نہیں ۔ لہذا اس صورت کو حدث عمد پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔

مسئلہ :

(مذکورہ بالا صورت میں) نماز از سر نو پڑھنا افضل ہے تاکہ اختلاف ائمہ قلبی سکون کے زائل ہونے کا سبب نہ ہو ۔ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ منفرد آدمی کے لیے از سر نو پڑھنا افضل ہے لیکن امام اور مقتدی کے لیے (سابقہ نماز پر) بناء کرنا مناسب ہے ۔ تاکہ فضیلت نماز ضائع نہ ہو ۔

مسئلہ :

(مذکورہ صورت میں وضو کرنے کے بعد) منفرد چاہے تو اسی جگہ نماز کو مکمل کر لے اور چاہے تو اپنی پہلی جگہ پر واپس آ کر پوری کرے مگر مقتدی پہلی جگہ واپس آئے ہاں اگر (وضو کرتے کرتے) امام نماز سے فارغ ہو چکا ہو یا مقتدی اور امام کے درمیان کچھ حائل نہ ہو (جو صحت اقتداء کے مانع ہو ۔ فراغت امام یا کسی چیز کے حائل ہونے کی صورت میں مقتدی کو اختیار ہوگا کہ وہیں نماز پوری کرے یا پہلی جگہ واپس آئے) ۔

مسئلہ :

جس شخص کو بے وضو ہونے کا گمان ہوا اور اسی گمان کے تحت مسجد سے نکل گیا ۔ (تاکہ دوبارہ وضو کرے) پھر معلوم ہوا کہ وہ بے وضو نہیں ہوا تو اپنی نماز کو از سرنو شروع کرے اور اگر مسجد سے باہر نہیں نکلا ۔ تو باقی نماز کو مکمل کر لے ۔ دونوں صورتوں میں قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نئے سرے سے شروع کرے ۔ امام محمدؒ سے بھی یہی روایۃ ہے کیونکہ بلا عذر نماز سے انصراف کیا گیا ہے ۔ (اس لیے نماز فاسد ہونی چاہیے) ۔ (قیاس جلی کے مقابلے میں) استحسان کی وجہ یہ ہے کہ وہ محض اصلاح کی نیّة سے پھرا تھا ۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اگر اس کا گمان واقعی صحیح ثابت ہوتا تو اپنی سابقہ نماز پر بناء کر سکتا تھا ۔ اس لیے ارادۂ اصلاح بھی حقیقت اصلاح سے ملحق ہے ، بشرطیکہ انصراف سے مکان تبدیل نہ ہو ۔ (اور تمام مسجد ایک ہی مکان کا حکم رکھتی ہے) ۔

مسئلہ :

اگر ظنِّ حدث کی صورت میں کسی کو خلیفہ بنا دے اور بعد میں علم ہو کہ وضو بحال ہے تو نماز فاسد ہوگی کیونکہ نماز میں بغیر کسی عذر کے عمل کثیر پایا گیا ہے اور یہ اس صورت کے خلاف ہے جب کہ اسے یہ ظن پیدا ہو کہ میں نے بے وضو ہونے کی حالت میں نماز شروع کی تھی پھر (وہ وضو کرنیکے لیے) مڑا مگر اسے یقین ہوگیا کہ

میں با وضو تھا تو نماز فاسد ہوگی ۔ خواہ وہ مسجد سے نہ
نکلا ہو کیونکہ اس صورت میں انصراف علی سبیل الرفض
ہے ۔ (یعنی نماز کو ترک کرکے اس گمان پر مڑا ہے کہ
بے وضو ہونے کی وجہ سے اس کی نماز نہیں ہوئی گویا وہ ادا
کی ہوئی نماز کو بالکل چھوڑ کر جا رہا ہے) اگر اس کا یہ
گمان صحیح ثابت ہوتا تو اسے بہر صررت از سر نو پڑھنا تھی
اس لیے یہی قاعدہ ہے ۔ (کہ اگر نماز سے انصراف اصلاح کی
نیت سے ہو اور مسجد سے باہر نہ نکلے تو پہلی ادا کی ہوئی
نماز پر بناء کر سکتا ہے لیکن اگر نماز کو بالکل ترک کرکے
پھرے خواہ مسجد سے نکلے یا نہ نکلے تو نماز فاسد ہو جائے
گی اور بناء جائز نہیں ہوگی) ۔

مسئلہ :

صحراء میں صفوں کی جگہ کو مسجد کا حکم حاصل
ہوگا ۔ اگر سامنے کی جانب آگے بڑھے تو سُترہ حد ہوگی
اگر سامنے سترہ نہ ہو تو اس کے پیچھے کی صفوں کی مقدار
کا اعتبار ہوگا (یعنی جس قدر صفوں کی جگہ ہے اسی قدر
جگہ سامنے کی جانب مسجد کے حکم میں ہوگی) ۔

اگر نماز پڑھنے والا اکیلا ہو تو ہر جانب سے سجدے
کی جگہ کی مقدار کا اعتبار ہوگا ۔

مسئلہ :

اگر کسی شخص کو نماز میں جنون کا دورہ پڑ جائے
یا سو جائے اور اسے احتلام کا عارضہ پیش آ جائے تو اپنی

نماز کو ازسرنو شروع کرے کیونکہ ایسے عوارض کا پیش آنا بہت نادر ہوتا ہے۔ لہذا یہ صورتیں منصوص حکم (یعنی مَنۡ قَاء أو رعف أو أمذی الحدیث) کے تحت داخل نہ ہوں گی۔

اسی طرح اگر نماز میں قہقہہ لگائے (تو نماز فاسد ہوگی اور ازسرنو شروع کرے گا) کیونکہ قہقہہ بمنزلہٗ کلام ہے۔ اور کلام مفسدِ نماز ہے۔

مسئلہ :

اگر امام قراءۃ کرتے کرتے رک جائے اور کسی دوسرے کو اپنی جگہ پر آگے کر دے۔ تو امام اعظمؒ کی رائے میں نماز ہو جائے گی۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں، کیونکہ اس قسم کا عارضہ شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جنابۃ فی الصلوٰۃ کے مشابہ ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ عجز کی بناء پر استخلاف جائز ہوتا ہے اور زیر بحث صورت میں عجز بالکل ظاہر ہے (کیونکہ نماز میں حدث پیش آنے پر مسجد میں وضو کرنا ممکن ہے۔ مگر قراءۃ بھول جانے پر کچھ نہیں کیا جا سکتا) نیز قراءۃ میں رکاوٹ کا پیش آنا نادر نہیں (بلکہ ایسے عوارضات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ صورت حکم میں جنابت سے ملحق نہ ہوگی۔

مسئلہ :

اگر امام اس قدر قراءۃ کر چکا ہو جس سے نماز جائز

ہو جاتی ہے تو اجتماعی طور پر استخلاف جائز نہیں ہوگا۔
کیونکہ اس صورت میں استخلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسئلہ :

اگر تشہد کے بعد حدث لاحق ہو تو وضو کرے
اور سلام پھیرے کیونکہ سلام پھیرنا واجب ہے۔ اس لیے
اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وضو ضروری ہوگا۔

مسئلہ :

اگر تشہد کے بعد عمداً بے وضو ہو یا کوئی بات
کرے، یا کوئی ایسا کام کرے جو نماز کے منافی ہے۔
تو نماز پوری ہو جائے گی کیونکہ قاطعِ نماز اس کی وجہ
سے بناء محال ہے۔ لیکن اس پر نماز کا اعادہ بھی نہ ہوگا۔
کیونکہ ارکان نماز سے کوئی شے باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ :

اگر متیمّم نماز کے دوارن پانی دیکھ لے تو نماز باطل
ہوجائیگی ۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اگر بقدر تشہد
بیٹھنے کے بعد پانی دیکھے۔ یا موزے پر مسح کئے ہوئے تھا
اور مدت مسح کی مُدّت ختم ہوگئی، یا تھوڑے بہت عمل سے
موزہ اتر گیا، یا جاہل تھا اور سورۃ کا علم ہوگیا، یا
ننگا تھا اسے کپڑا دستیاب ہوگیا، یا اشاروں سے نماز ادا کر
رہا تھا، پھر رکوع و سجود پر قدرت حاصل ہوگئی، یا
اسے اس نماز سے پہلے کی فوت شدہ نمازیں یاد آگئیں، یا

قاری امام کو حدث لاحق ہوگیا اور اس نے ان پڑھ کو خلیفہ بنا دیا ، یا فجر کی نماز میں آفتاب طلوع ہوگیا ، یا نماز جمعہ ادا کرتے ہوئے عصر کا وقت شروع ہو گیا ، یا پٹی پر مسح کرتا تھا اور درست ہونے کی صورت میں پٹی گر گئی ، یا معذور تھا عذر جاتا رہا ۔ جیسا کہ مستحاضہ (کا خون رک جائے) یا اسی قسم کے دوسرے معذورین کا عذر ختم ہو جائے تو ان سب کی نماز باطل ہو جائے گی ۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ نماز مکمل ہوگئی ۔

ابو سعید البردعیؒ کہتے ہیں کہ اختلاف کی بناء اس اصول پر ہے کہ امام اعظمؒ کی رائے میں نمازی کا اپنے فعل سے نماز سے نکلنا اور فارغ ہونا فرض ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک فرض نہیں ۔ پس ان عوارض کا مذکورہ حالات میں پیش آنا امام اعظمؒ کے نزدیک اثناء نماز میں پیش آنے کے مشابہ ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک گویا کہ عوارض سلام کے بعد پیش آئے ہیں ۔

صاحبینؒ کی دلیل ابن مسعودؓ کی وہ روایت ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں ۔ ''إِذَا قُلْتَ هٰذَا أَوْ فَعَلْتَ هٰذَا فَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُكَ)'' ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ جب تک اس نماز سے خارج نہ ہو دوسری نماز ادا کرنا ممکن نہیں اور جو چیز فرض تک رسائی کا ذریعہ اور وسیلہ ہو وہ چیز بھی فرض کی حیثیت رکھتی ہے (جیسا کہ ایک شخص ظہر کی

نماز ادا کر رہا ہو اسی اثناء میں عصر کا وقت شروع ہوگیا تو جب تک یہ صلاۃِ ظہر سے خارج نہ ہو عصر کا ادا کرنا ممکن نہیں ۔ اس لیے خروجِ عَنِ الصَّلَاۃ فرض ہے (تاکہ دوسرا فرض ادا ہو سکے) ۔ آپ کی پیش کردہ روایت میں تمت سے مراد یہ ہے کہ نماز مکمل ہونے کے قریب ہے ۔ (سوال اگر حدث پیش آنے کے بعد خلیفہ بنا دیا جائے تو استخلاف مفسد صلاۃ نہیں ہوتا کیونکہ یہ عملِ کثیر کے بغیر بھی ممکن ہے ۔ جیسا کہ محدث قاری ایک قاری کو خلیفہ بنا دے تو نماز فاسد نہیں ہوتی اسی طرح مذکورہ صورت میں بھی فاسد نہیں ہونی چاہیے مصنف جواب میں فرماتے ہیں کہ) استخلاف مفسد صلاۃ نہیں ہوتا ، حتی کہ ایک قاری کو خلیفہ بنانا جائز ہے بلکہ فساد تو حکم شرعی کی ضرورت و اہمیت کے مدنظر ہے ۔ کیونکہ ان پڑھ شخص امامت کی صلاحیت ہی سے محروم ہوتا ہے (اس لیے نماز کا فساد لازم آتا ہے) ۔

مسئلہ :

امام جب ایک رکعت پڑھا چکا تھا تو ایک شخص اس کی اقتداء میں شامل ہوا ۔ امام کو حدث کا عارضہ لاحق ہو گیا ۔ امام نے اسی شخص کو آگے کردیا تو جائز ہوگا ۔ کیونکہ تحریمہ میں مشارکۃ موجود ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ امام مدرک کو جو ابتداءِ نماز میں اس کے ساتھ شریک ہو) خلیفہ بنائے کیونکہ مدرک مسبوق کی نسبت اتمام نماز پر زیادہ قادر ہوتا ہے ۔ اور مسبوق کے لیے مناسب یہ

ہے کہ وہ آگے نہ بڑھے کیونکہ وہ مقتدیوں کے ساتھ سلام
پھیرنے سے قاصر ہے (کہ ابھی تو اسے نماز کی تکمیل
کرنا ہے) ۔ اگر مسبوق آگے ہو جائے تو نماز وہاں سے
شروع کرے جہاں سے امام نے چھوڑی تھی کیونکہ یہ
امام ہی کے قائم مقام ہے اور جب سلام تک پہنچے تو
مدرک کو آگے کر دے جو لوگوں کے ساتھ سلام کا فریضہ
سرانجام دے ۔ مسبوق اگر امام کی نماز کی تکمیل کے بعد
قہقہہ لگائے یا عملاً حادث ہو جائے یا کوئی بات کرے یا
مسجد سے نکل جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ۔ مگر
مقتدیوں کی نماز مکمل ہو جائے گی کیونکہ مفسد امر
مسبوق کے حق میں اثناء نماز میں پایا گیا اور مقتدیوں کے
حق میں ارکان نماز کے مکمل ہو جانے کے بعد پایا گیا ۔
پہلا امام اگر لوگوں کے ساتھ ہی نماز سے فارغ ہو چکا ہے
تو اس کی نماز بھی فاسد نہ ہوگی ۔ اگر فارغ نہیں ہوا تو
اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ۔ یہی صحیح ہے ۔

امام اول اگر بے وضو نہیں ہوا اور تشہد کی مقدار
قعود کر لیا پھر قہقہہ لگایا یا جان بوجھ کر حادث ہوگیا
تو وہ شخص جو ابتداء نماز میں امام کے ساتھ شامل نہیں
ہوا تھا اس کی نماز فاسد ہو جائے گی ۔ یہ امام اعظمؒ کی
رائے ہے ۔ صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ فاسد نہ ہوگی ۔

اگر امام (بقدر تشہد قعود کے بعد) کوئی بات کر لے
یا مسجد سے نکل جائے تو متفقہ طور پر مسبوقین کی نماز
فاسد نہ ہوگی ۔

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مقتدی کی نماز صحت

و عدم صحت میں امام کی نماز کی صحت یا عدم صحت پر مبنی ہوتی ہے۔ لہذا جب امام کی نماز فاسد نہیں ہوئی تو مسبوق کی نماز بھی فاسد نہ ہوگی اور یہ امام کے سلام یا کلام کرنے کی طرح ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ قہقہہ اس جزء کو فاسد کر دیگا جس کو وہ امام کی نماز سے پائے گا اور اسی قدر جزء مقتدی کی نماز سے بھی فاسد ہوگا البتہ امام کو بناء کرنے کی ضرورت نہیں (کیونکہ وہ نماز کے ارکان سے فارغ ہو چکا صرف سلام باقی ہے) لیکن مسبوق ابھی تک بناء کا محتاج ہے۔ لیکن فاسد پر بنا کرنا بھی فاسد ہوتا ہے۔ بخلاف سلام کے کیونکہ سلام نماز کی تکمیل کر دیتا ہے اور کلام کی بھی معنوی حیثیت یہی ہے (کیونکہ سلام میں بھی لوگوں سے خطاب ہوتا ہے)

علماء ثلاثہ کے نزدیک اثناء نماز میں قہقہہ کی وجہ سے امام کا وضو جاتا رہے گا۔

مسئلہ :

جو شخص رکوع یا سجدے میں بے وضو ہو جائے وہ وضو کرے اور اپنی نماز پر بناء کرے اور جس رکن (یعنی رکوع یا سجدے) میں بے وضو ہوا تھا اسے مکمل شمار نہ کرے بلکہ اسی رکن سے شروع کرے) کیونکہ رکن کی تکمیل اس رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے پر ہے اور حدث کے ساتھ انتقال متحقق نہیں لہذا اس رکن کا اعادہ ضروری ہوگا۔

اگر وہ امام ہو اور اس نے دوسرے کو خلیفہ بنایا تو خلیفہ رکوع کی حالت ہی میں آگے بڑھے کیونکہ خلیفہ اسی ہیئت میں رکن کی تکمیل کر سکتا ہے۔

مسئلہ :

اگر اسے رکوع یا سجدے میں یاد آئے کہ اس کے ذمے (تلاوت یا پہلی رکعت کا) سجدہ واجب ہے پھر رکوع ہی سے سجدے میں چلا گیا یا سجدے سے سر اٹھایا اور واجب سجدے میں چلا گیا تو رکوع اور سجود کا اعادہ کرے۔ یہ افضلیت کا بیان ہے تاکہ افعال بقدرِ امکان ترتیب میں واقع ہوں۔ اگر اعادہ نہ کرے تو جائز ہوگا کیونکہ افعال نماز میں ترتیب رکن کی حیثیت نہیں رکھتی نیز طہارت کے ساتھ منتقل ہونا شرط ہوتا ہے۔ اور یہ امر موجود ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ رکوع کا اعادہ لازم ہوگا کیونکہ قَوْمَہ ان کے نزدیک فرض ہے۔

مسئلہ :

جس نے صرف ایک شخص کی امامت کی پھر وہ (امام) بے وضو ہو گیا یا مسجد سے نکل گیا تو امام خواہ مقتدی کی امامت کی نیت کرے یا نہ کرے وہ خود بخود امام بن جائے گا۔ کیونکہ اس میں مقتدی کی نماز کا بچاؤ ہے۔ مذکورہ صورت میں (اگر مقتدی زیادہ ہوں) امام اول کا کسی کو خلیفہ معین کرنا ضروری ہے تاکہ بہت سے اشخاص

آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کریں ۔ لیکن اس صورت میں کوئی مزاحمت ہے ہی نہیں کہ تعیین کی ضرورت پیش آئے ۔ پہلا امام جو بے وضو ہوا تھا وضو کرنے کے بعد دوسرے امام کی اقتداء کر کے اپنی نماز پوری کرے جیسا کہ اسے حقیقت میں خود ہی خلیفہ بنایا ہو ۔

مسئلہ :

اگر امام کے پیچھے فقط بچہ یا عورت ہو تو بعض کے نزدیک امام کی نماز فاسد ہو جائے گی کہ اس نے اس کو خلیفہ بنایا جو امامت کا اہل نہیں ۔ بعض کے نزدیک فاسد نہ ہوگی کیونکہ امام کی جانب سے قصداً اور ارادۃً خلیفہ بنانا نہیں پایا گیا (اور حکماً بچہ یا عورت خلیفہ نہیں بن سکتے) ۔ کیونکہ ان میں صلاحیت امامت مفقود ہے ۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ !

بَابُ مَا یُفسِدُ الصَّلٰوۃُ وَمَا یُکرِہُ فِیھَا

آن امور کا بیان جو نماز کو باطل کر دیتے ھیں اور جو نماز کے دوران مکروہ ہوتے ہیں

مسئلہ :

جو شخص اپنی نماز میں جان بوجھ کر یا بھول کر بات کرے اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے ۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں غلطی سے یا بھول کر بات کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ۔ ان کی دلیل مشہور و معروف حدیث ہے (رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الخَطَاءُ وَ النَّسْيَانُ) ۔

ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''ہماری اس نماز میں کلام الناس کی کوئی جگہ نہیں یہ تو صرف تسبیح و تحلیل اور قراءۃ قرآن پر مشتمل ہے ۔'' امام شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میری امت سے خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ نہ ہوگا ۔ البتہ بھول کر سلام کہنا مفسد نماز نہ ہوگا کیونکہ سلام من جملہ اذکار سے ہے ۔ اس لیے حالت نسیان میں اسے ذکر شمار کیا جائے گا ۔ مگر حالت تعمُّد میں کلام

الناس کے ذیل میں داخل ہوگا کیونکہ اس میں کاف خطاب موجود ہے۔

مسئلہ :

اگر نماز میں ہائے ہائے کرنے یا آہیں بھرنے لگے یا بلند آواز سے رونے لگے۔ اگر ان امور کا سبب جنت یا دوزخ کا ذکر ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ یہ امور خشوع کی زیادتی پر دال ہیں۔ لیکن اگر یہ تکلیف یا مُصیبت کی بناء پر ہوں تو نماز باطل ہوگی کیونکہ ان سے جزع فزع اور حسرت و افسوس کا اظہار ہوتا ہے اس لیے کلام الناس میں شامل ہوں گے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ''آہ'' کہنے سے نماز فاسد نہ ہوگی خواہ خشوع کے طور پر ہو یا جزع کی صورت میں۔ لیکن ''اوہ'' کہنے سے فاسد ہوگی۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ جب کوئی لفظ دو حرفوں سے مرکب ہو اور وہ دونوں زائد ہوں یا ان میں ایک حرف زائد ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ اگر دونوں حروف اصلی ہوں تو فاسد ہوگی حروف زوائد کو (زباندانوں نے) اس قول میں جمع کر دیا ہے ''اَلْیَوْمَ تَنْسَاہُ''۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ اصول قابل عمل نہیں کیونکہ عرف عام میں کلام وہ ہے۔ جو حروف ھجاء پر مشتمل ہو اور اسے مفہوم کی توضیح کے لیے استعمال کیا جائے اور یہ

دونوں باتیں ان حروف میں بھی متحقق ہیں جو سب کے سب زوائد ہیں ۔

مسئلہ :

اگر بغیر کسی عذر کے کھانسنا شروع کر دیا حالانکہ اسے کھانسنے کی ضرورت یا مجبوری نہ تھی اور کھانسنے سے حروف بھی پیدا ہوئے تو شیخینؒ کے نزدیک نماز مفسد ہونی چاہیے ۔ اگر کھانسنا عذر کی بناء پر ہو تو قابل معاف ہے ۔ جیسے چھینک اور ڈکار جس سے حروف پیدا ہوں ۔

مسئلہ :

اگر کسی شخص کو چھینک آئے اور دوسرا نماز کی حالت میں یَرْحَمُكَ اللہ سے چھینک کا جواب دے تو اس کی نماز فاسد ہو گئی کیونکہ یہ الفاظ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے استعمال کیے جاتے ہیں اس لیے کلام الناس کا حصہ ہیں بخلاف اس صورت کے جب چھینکنے والا یا سننے والا اَلْحَمْدُ للہ کہے تو بعض فقہاء کے قول کے کہ نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ یہ الفاظ جواب میں استعمال نہیں ہوتے ۔

مسئلہ :

اگر کسی نے استفتاح کیا (جب کوئی شخص قراءۃ کرتے کرتے بھول جائے تو وہ پچھلی آیت کو دہراتا ہے تاکہ نماز پڑھنے والوں میں سے کوئی اسے بتا دے ۔ اس کو استفتاح کہتے ہیں اور بتلانا فتح کہلاتا ہے یا لقمہ دینا) اور

دوسرے شخص نے نماز ہی میں بتا دیا تو اس بتانے والے کی نماز فاسد ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازی کسی دوسرے امام کو لقمہ دے کیونکہ یہ بتلانا وغیرہ تعلیم و تعلم میں داخل ہے۔ اس لیے کلام الناس سے ہوگا۔ مبسوط میں تکرار کی شرط ہے (یعنی بتلانے میں تکرار سے کام لے اگر ایک آدھ بار بتایا تو فاسد نہ ہوگی) کیونکہ یہ فعل نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے۔ لہذا بقدر قلیل قابل معاف ہوگا۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں تکرار کو شرط قرار نہیں دیا کیونکہ کلام اگرچہ قلیل ہی کیوں نہ ہو قاطع نماز ہوتا ہے۔

مسئلہ :

اگر اپنے امام کو لقمہ دے تو یہ استحساناً کلام شمار نہ ہوگا کیونکہ اسے اپنی نماز کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔ پھر لقمہ دینا معنوی طور پر اس کی اپنی نماز کی اصلاح شمار ہوگا۔

مسئلہ :

اپنے امام کو لقمہ دیتے وقت فتح کی نیت کرے قراءۃ کی نہ کرے ، یہی صحیح ہے کیونکہ فتح کی اجازت تو ہے مگر (مقتدی کی) قراءۃ ممنوع ہے۔

مسئلہ :

اگر امام دوسری آیت کی طرف منتقل ہوگیا ہو (یا بقدر مَا تَجُوزُ بِہ الصلاۃ پڑھ چکا ہو) اور مقتدی اسے لقمہ دے۔ تو مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر امام نے اس کے

بتانے کو قبول کر لیا (یعنی پھر پیچھے سے پڑھنا شروع کر دیا) تو امام کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی کیونکہ بلا ضرورت بتانا تعلیم و تعلم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقتدی کے لیے مناسب یہ ہے کہ فتح میں جلدی سے کام نہ لے (ہو سکتا ہے امام خود ہی اصلاح کر لے) اور امام بھی خیال رکھے کہ ان کو فتح کے لیے مجبور نہ کرے بلکہ اگر کہیں رک جائے (اور بقدر ما تجوز بہ الصلاۃ پڑھ چکا ہو) تو رکوع میں چلا جائے۔ ورنہ دوسری آیت کی طرف منتقل ہو جائے۔

مسئلہ :

اگر نماز میں کسی شخص کے جواب میں لا إلٰہ الا اللہ کہا (مثلاً کوئی شخص کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالٰی کے علاوہ بھی کوئی معبود ہے؟ اور نمازی نے نماز ہی میں جواب دے دیا) تو طرفینؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی۔

امام ابو یوسفؒ عدم فساد کے قائل ہیں۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ نمازی جواب دینے کا ارادہ کرے ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ اپنے صیغے کے لحاظ سے ثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا اس کا ارادہ اس کی حیثیت میں تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ جملہ بطور جواب استعمال کیا گیا ہے اور اس میں جواب بننے کا احتمال بھی ہے اس لیے جواب ہی قرار پائے گا جیسا کہ چھینکنے والے کو جواب دیا جاتا ہے۔ صحیح روایت کے مطابق إنَّا للہ وَ إنَّا إلَیْہِ رَاجِعُون کہنے میں بھی اختلاف ہے (کہ مفسد ہوگا یا نہیں)۔

مسئلہ :

لا إلٰہ إلا اللہ کہہ کر یہ ظاہر کرنا مقصد ہو کہ وہ نماز میں مصروف ہے ، تو متفقہ طور پر نماز فاسد نہ ہوگی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر نماز میں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو (بلند آواز سے) تسبیح پڑھ دیا کرو" ۔

مسئلہ :

اگر کوئی شخص ظہر کی ایک رکعت پڑھ کر عصر کی نماز یا نفل شروع کر دے تو ظہر کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ جب دوسری نماز کو شروع کرنا صحیح ہوا تو وہ پہلی سے لا محالہ خارج ہو جائے گا ۔

مسئلہ :

اگر کوئی شخص ظہر کی ایک رکعت پڑھ کر پھر ظہر کا افتتاح کرے تو (پہلی) ظہر ہی برقرار رہے گی اور پہلی رکعت بھی بحال ہوگی کیونکہ اس نے بعینہ اس نماز کی نیت کی ہے جس میں وہ پہلے ہی مصروف ہے لہذا اس کی نیت لغو ہوگی اور نماز جس کی نیت کی گئی تھی بحال رہے گی ۔

مسئلہ :

اگر امام قرآن کریم سے دیکھ کر قراءۃ کرے تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہوگی ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم سے دیکھ کر پڑھنے سے نماز پوری ہو

جائے گی کیونکہ یہ بھی ایک عبادت ہے۔ جو دوسری عبادت سے مل گئی ہے مگر یہ مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کے فعل سے مشابہت ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا اٹھانا۔ دیکھنا اور ورق گردانی کرنا عمل کثیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلُّم من المصحف ہے اور یہ غیر سے تعلم کرنے کی طرح ہے۔ اس دوسری وجہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کریم کو اٹھائے رکھنے یا کسی چیز پر کھلا رکھنے میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں تلقّن من الغیر ہے۔ مگر پہلی وجہ کی بناء پر موضوع اور محمول میں فرق ہے (کیونکہ اگرقرآن کریم کسی چیز پر اس طرح کھلا رکھا ہو کہ ورق گردانی کی بھی ضرورت نہ رہے۔ تو صرف دیکھنا عمل کثیر نہ ہوگا۔ لہذا نماز بھی فاسد نہیں ہونی چاہیے)۔

مسئلہ :

اگر نمازی نے اپنے سامنے (دیوار وغیرہ پر لکھی ہوئی) تحریر کو دیکھ کر اس کو سمجھ لیا۔ تو صحیح روایت کے مطابق اجماعی طور پر اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ بخلاف اس صورت کے جب وہ قسم کھائے کہ میں فلاں شخص کا خط نہ پڑھوں گا۔ تو امام محمد کے نزدیک تحریر سمجھ لینے سے وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ اس سے مقصود مفہوم ہی ہے۔ البتہ نماز عمل کثیر سے فاسد ہوتی ہے اور مذکورہ صورت میں عمل کثیر نہیں پایا گیا۔

مسئلہ :

اگر نمازی کے سامنے سے عورت گزرے تو نماز کو قطع نہ کرے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی چیز کا گزرنا قاطع نماز نہیں"۔ ہاں ! گزرنے والا گناہ‌گار ہوتا ہے ۔ ارشاد نبوی ہے کہ "اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو معلوم ہوتا کہ اس پر (آخرۃ میں) کتنا بوجھ ہوگا تو چالیس . . . . . تک کھڑا رہتا" (امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سال مراد ہیں یعنی گناہ کے مقابلے میں چالیس سال کھڑا رہنا آسان معلوم ہوتا) ۔

بعض فقہاء کا قول ہے کہ گناہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ نمازی کے سجدہ کرنے کی جگہ سے گزرے اور ان دونوں کے درمیان کوئی شے حائل نہ ہو کہ گزرنے والے کے اعضاء نمازی کے اعضاء سے محاذی ہو جائیں ۔ اگر نمازی اونچی جگہ نماز پڑھ رہا ہو (اور گزرنے والا نیچے سے گزرے تو کوئی حرج نہیں ، کیونکہ اس صورت میں دونوں کے اعضاء میں محاذات نہیں) ۔

مسئلہ :

جو شخص صحراء میں نماز پڑھے اسے اپنے سامنے سترے کا انتظام کرنا چاہیے آنحضرت کا ارشاد ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص صحراء میں نماز ادا کرے تو اپنے سامنے سُترے کا انتظام کر لے"۔ سُترے کی مقدار کم از کم ہاتھ بھر ہے یا اس سے زیادہ ہو ۔ ارشاد نبوی ہے کہ وہ جب صحراء میں نماز ادا کرے تو کیا کجاوے کی پچھلی

لکڑی جتنے سترے کا انتظام کرنا بھی مشکل ہوتا ہے" ؟
(کجاوے کی پچھلی لکڑی گز کے قریب قریب ہوتی تھی)
بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سترے کی لکڑی موٹائی میں
کم از کم انگلی کے برابر ہو کیونکہ اس سے کم موٹائی
کا سُترہ دور سے دیکھنے والوں کو نظر نہیں آ سکتا ۔ اس لیے
سترے کا مقصد پورا نہیں ہوتا ۔

مسئلہ :

سُترے کے قریب نماز پڑھے ارشاد نبوی ہے کہ
"جو شخص سُترہ کے سامنے نماز ادا کرے وہ اس کے قریب
کھڑا ہوا کرے" ۔
سُترہ کو اپنے دائیں یا بائیں ابرو کے متوازی رکھے ۔
حدیث میں اسی طرح وارد ہے ۔ جب سامنے سے کسی کے
گزرنے کا اندیشہ نہ ہو اور سامنے راستہ بھی نہ ہو تو سُترہ
ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

مسئلہ :

امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے بھی سترہ ہے ، نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے بطحاء مکہ میں چھوٹے نیزے کو
سامنے گاڑ کر امامت فرمائی مگر قوم کا کوئی علیحدہ سترہ
نہ تھا ۔

مسئلہ :

سترے کا گاڑنا ضروری ہے ۔ زمین پر رکھ دینا یا

لکیر کھینچ دینا کافی نہیں کیونکہ اس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

اگر نمازی کے سامنے سُترہ نہ ہو اور کوئی آدمی سامنے سے گزرے۔ یا سامنے سترہ تو ہو لیکن گزرنے والا نمازی سترہ کے درمیان سے گزرنا چاہیے تو نمازی گذرنے والے کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کرے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "حسب استطاعت گزرنے والے کو روکیے"۔

گزرنے والے کو اشارے سے منع کرے جیسے آنحضرت نے اُم سلمہؓ کے دونوں بچوں کو اشارے سے منع فرمایا تھا۔ یا "سبحان اللہ" کہہ کر روک دے۔ جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں (اِذَا نَابَتْ اَحَدَکُمْ نَائِبَۃٌ وَّھُوَ فِی الصَّلَاۃِ فَلْیُسَبِّحْ)

اشارے اور تسبیح دونوں کو جمع نہ کرے کیونکہ صرف ایک ہی سے کام چل سکتا ہے۔

فصل

مکروہات نماز کا بیان

مسئلہ :

نمازی کے لیے نماز میں کپڑوں یا جسم سے کھیلنا مکروہ ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ ''اللہ تعالی تین باتوں کو پسند نہیں فرماتا ، من جملہ ان کے ایک نماز میں لغو حرکات میں مشغول ہونا ہے" ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جب نماز کے علاوہ بھی لایعنی اور لغو کام حرام ہیں تو نماز میں بدرجۂ اولی ممنوع ہوں گے ۔

مسئلہ :

جائے سجدہ سے سنگریزے نہ ہٹاتا رہے ۔ یہ بھی لغو اس میں شامل ہے ۔ ہاں اگر سنگریزوں کی وجہ سے سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو صرف ایک بار انہیں ہموار کر سکتا ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے فرمایا ۔ ''ابوذرؓ ! صرف ایک بار ورنہ رہنے دے" ایک دفعہ ہموار کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔ کیونکہ اس سے مقصود اصلاح نماز ہے ۔

مسئلہ :

نماز میں انگلیوں کو نہ چٹخائے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ "جب تم نماز ادا کر رہے ہو تو انگلیاں مت چٹخاؤ۔

مسئلہ :

نماز میں تخصّر بھی مکروہ ہے اور تخصّر ہاتھ کو کولھے پر رکھنا ہے۔ نبی کریم علیہ السلام نے اختصار سے منع فرمایا۔ کیونکہ اس میں مسنون وضع کو ترک کرنا لازم آتا ہے۔ (کہاں ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہونا اور کہاں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر گستاخانہ ہیئت اخیار کرنا)۔

مسئلہ :

نماز پڑھتے ہوئے ادھر آدھر التفات نہ کرے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ "اگر نمازی کو اس ذات کی عظمت کا علم ہو جس سے محوتکلم ہے تو ادھر آدھر متوجہ نہ ہو"۔

مسئلہ :

اگرگردن پھیرے بغیر کنکھیوں سے دائیں یا بائیں جانب دیکھ لیا تو مکروہ نہ ہوگا کیونکہ آنحضرت ﷺ گاہے گاہے نماز میں کنکھیوں سے صحابہؓ کرام کو دیکھ لیا کرتے تھے۔

مسئلہ :

نماز میں نہ تو اقعاء کرے اور نہ (سجدے کی حالت میں) بازو زمین پر بچھائے۔ ابوذرؓ کا ارشاد ہے مجھے میرے

مکرم دوست نے تین امور سے منع فرمایا : اول یہ کہ نماز کو (جلد جلد) مرغ کی طرح ٹھونگے مار کر ادا کروں ۔ دوم یہ کہ کتے کی طرح اقعاء کروں ۔ سوم یہ کہ لومڑی کی طرح بازو زمین پر بچھا دوں ۔ اقعاء یہ ہے کہ سرین زمین پر رکھ کر گھٹنے کھڑے کر لیے جائیں یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

زباں سے سلام کا جواب نہ دے کیونکہ یہ کلام الناس ہے اور ہاتھ سے بھی سلام کا جواب نہ دے کیونکہ ایسا کرنا معنوی طور پر سلام کی حیثیت رکھتا ہے اور سلام کی نیت سے مصافحہ کرے تو نماز فاسد ہو جائے گی ۔

مسئلہ :

کسی عذر کے بغیر نماز میں دوزانو ہو کر نہ بیٹھے کیونکہ یہ صورت مسنون بیٹھنے کے خلاف ہے ۔

مسئلہ :

اپنے سر کے بالوں کا جوڑا نہ بنائے ۔ بایں طور کہ بالوں کو لپیٹ کر سر پر اکٹھا کر لے اور کسی دھاگے وغیرہ سے انہیں باندھ دے ۔ یا کسی لیس دار چیز سے انہیں سر پر جالے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے مرد کو بالوں کا جوڑا بنا کر نماز ادا کرنے سے منع فرمایا ۔

مسئلہ :

نماز کے دوران کپڑوں کو سمیٹے رہنا مکروہ ہے کیونکہ

یہ خشوع و خضوع کے خلاف ہے۔ بلکہ یہ لاپرواہی اور تکبر کی علامت ہے۔

مسئلہ :

کپڑے سے سدل کرنا بھی مکروہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سدل سے منع فرمایا۔ سدل کی یہ صورت ہے کہ سر اور کندھوں پر کپڑا ڈال کر اس کے پہلو کھلے چھوڑ دے (آج کل لوگ عموماً تولیہ سر اور کندھوں پر ڈال کر نماز ادا کر لیتے ہیں یہ بھی سدل میں شامل ہے۔ شاہ ولی اللہؒ حجۃاللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ جو کپڑا بھی خلاف شریعت پہنا جائے سدل کا حکم رکھتا ہے)۔

مسئلہ :

نماز میں کھانا اور پینا بھی مکروہ ہے کیونکہ اکل و شرب سے اعمال نماز کا کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ :

اگر عمداً یا بھول کر کچھ کھا لیا یا پی لیا، تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ کھانا یا پینا عمل کثیر ہے۔ (بھول کر کھانے یا پینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر نماز فاسد ہو جاتی ہے کیونکہ) نماز کی حالت یاد دلانے والی ہوتی ہے۔ انسان کا ہاتھ باندھے قبلہ رو کھڑا ہونا، رکوع وسجود کرنا، قراءۃ کرنا وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے نماز میں

مصروف ہونا یاد رہتا ہے ۔ مگر روزے میں ایسی کوئی حالت موجود نہیں ہوتی) ۔

مسئلہ :

اگر امام مسجد میں کھڑا ہو اور سجدہ محراب میں کر رہا ہو تو کوئی حرج نہیں ۔ البتہ (پورے طور پر محراب میں کھڑا ہونا مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کے فعل کی مشابہت لازم آتی ہے کہ امام کے لیے محراب یا کوئی اور مقام خاص کر لیا جائے۔ البتہ اگر قدم محراب سے باہر ہوں اور سجدہ محراب میں ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں ۔

مسئلہ :

تنہا امام کا بلند جگہ پر کھڑا ہونا (جب کہ مقتدی نیچے کھڑے ہوں) مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کے ساتھ تشبّہ ہے۔ ظاہر الروایہ کے مطابق اس کا عکس بھی جائز نہیں (کہ امام پست جگہ میں ہو اور مقتدی بلند مقام پر) کیونکہ اس سے امام کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو اس کی پیٹھ پیچھے نماز ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں کیونکہ عبداللہ بن عمرؓ سفر کے دوران اکثر نافعؒ سے سترہ کا کام لیتے تھے ۔

مسئلہ :

اگر نمازی کے سامنے قرآن کریم یا تلوار لٹک رہی ہو تو

کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کی عبادت نہیں کی جاتی اور عبادت کی بناء پر ہی کراہت ثابت ہوتی ہے۔ (یعنی ایسی اشیاء جن کی عبادت کی جاتی ہو سامنے رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ ایسا کرنے سے بت پرستوں اور مشر دین سے مشابہت لازم آتی ہے۔

مسئلہ :

ایسی چادر پر نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں جس پر تصاویر بنی ہوں کیونکہ قدموں تلے ہونے کی بناء پر تصویر کی اہانت ہوتی ہے۔ (تکریم نہیں) البتہ تصویر پر سجدہ نہ کرے کیونکہ یہ تصویر کی عبادت کرنے کے مشابہ ہے۔ امام محمدؒ نے مبسوط میں مطلق کراہت کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ سجدہ گاہ عزت والا مقام ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں تصویر کا ہونا مناسب نہیں)۔

مسئلہ :

سر کے اوپر چھت میں یا سامنے یا اس کے دائیں بائیں تصاویر ہوں یا کوئی تصویر لٹک رہی ہو تو ایسے مکان میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ حضرت جبریلؑ سے مروی ہے کہ ہم (یعنی رحمت کے فرشتے) اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

اگر تصویر اس قدر چھوٹی ہو کہ دیکھنے والے کو (ذرا دور سے) نظر نہ آتی ہو تو نماز ادا کرنے میں کراہت نہیں کیونکہ اتنی چھوٹی تصاویر کی عبادت نہیں کی جاتی۔

جب مورت کا سر کٹا ہوا ہو تو وہ بت نہیں کیونکہ سر بریدہ کی عبادت نہیں کی جاتی (اس کی موجودگی میں نماز پڑھنا ایسا ہی ہے) جیسے وہ شمع یا چراغ کی طرف نماز پڑھے (بعض فقہاء کے نزدیک شمع ۔ چراغ یا آگ وغیرہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا بھی مکروہ ہے) ۔

اگر (پلنگ پر) پڑے ہوئے تکیے یا نیچے بچھائی ہوئی چادر پر تصاویر ہوں تو نماز مکروہ نہیں کیونکہ ایسی تصاویر عموماً پاؤں تلے آ کر روندی جاتی ہیں ۔ (اس لیے ان کی تکریم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) ہاں اگر تکیہ سیدھا کھڑا ہو یا پردوں پر تصاویر ہوں (تو نماز مکروہ ہو گی) کیونکہ ان کی تعظیم کا پہلو نکل سکتا ہے ۔ سب سے زیادہ کراہت اس میں ہے کہ تصویر نمازی کے سامنے ہو ۔ جب وہ اس کے سر کے اوپر ہو ۔ پھر جب اس کے دائیں ہو ۔ پھر جب اس کے بائیں ہو پھر جب اس کے پیٹھ پیچھے ہو ۔

مسئلہ :

تصویر دار کپڑا پہننا مکروہ ہے کیونکہ حامل صنم سے مشابہت ہوتی ہے ۔ مذکورہ تمام مکروہ صورتوں میں نماز تمام شرائط کے موجود ہونے کی بناء پر جائز ہے ۔ مگر نماز کو پھر سے ایسے طریق پر ادا کیا جائے جس میں کراہت نہ ہو ۔ (مثلاً اگر تصویر دار کپڑے میں نماز پڑھی ہو تو اسے اتار کر سادہ کپڑے میں دوبارہ پڑھ لے تاکہ کراہت کا احتمال نہ رہے) اور یہی ہر اس نماز کا حکم ہے جو کراہت کے ساتھ ادا کی جائے (یعنی اسے غیر مکروہ طریق سے ادا کرلے) ۔

مسئلہ :

غیر ذی روح کی تصویر میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ ان کی عبادت نہیں کی جاتی ۔

مسئلہ :

نماز میں سانپ یا بچھو کے مارنے میں کوئی حرج نہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : ''اَسْوَدَیْن (یعنی سانپ اور بچھو) کو قتل کر دو اگرچہ تم نماز ادا کر رہے ہو''۔ نیز ان کے مارنے سے سے دل کا اندیشہ دور ہو جاتا ہے (اور نمازی اطمینان سے نماز میں مشغول ہو سکتا ہے) لہذا یہ آگے سے گزرنے والے کو روکنے کی طرح ہوگا ۔ صحیح روایت کے مطابق سانپوں کی تمام اقسام یکساں ہیں (یعنی جو بھی سانپ ہو قتل کر دیا جائے) کیونکہ مذکورہ بالا روایت مطلق ہے ۔

مسئلہ :

نماز میں ہاتھ کی انگلیوں سے آیات یا تسبیحات شمار کرنا مکروہ ہے ۔اسی طرح سورتوں کا گننا بھی (مکروہ ہے) کیونکہ یہ اعمال نماز سے نہیں ۔

صاحبینؒ سے مروی ہے کہ فرائض ونوافل میں آیات وغیرہ کے شمار کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔ خصوصاً جب کہ مقصد یہ ہو کہ قراءۃ سنت کے مطابق ہو ۔ (جیسا کہ صبح کی نماز میں چالیس سے ساٹھ آیات تک پڑھنا مسنون ہے) نیز

اس میں سنت پر بھی عمل ہے۔ (کیونکہ صلاۃ التسبیح میں گننا مسنون ہے)۔

ہم کہتے ہیں جب نماز شروع کرنے سے پہلے گن لینا ممکن ہے تو بعد میں شمار کرنے کی کیا ضرورت ہے
واللہ أعلم!

فَضْلٌ

نماز کے علاوہ مکروہات کا بیان

مسئلہ :

خلاء میں شرمگاہ کا رُخ قبلہ کی طرف کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (بوقت رفع حاجت) استقبالِ قبلہ سے منع فرمایا۔ ایک روایت کے مطابق قبلہ کی طرف پیٹھ کرنا بھی مکروہ ہے، کیونکہ استدبار سے بھی ترک تعظیم لازم آتی ہے۔ لیکن ایک روایت کے مطابق استدبار مکروہ نہیں کیونکہ جو شخص پیٹھ کر کے بیٹھا ہو اس کا فرج قبلہ کے متوازی نہیں ہوتا اور جو چیز شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے وہ زمین کے رخ گرتی ہے بخلاف اس شخص کے جو قبلہ رخ بیٹھا ہو اس کی شرمگاہ قبلے کے متوازی ہوتی ہے اور شرمگاہ سے خارج ہونے والی نجاست قبلہ کے رخ گرتی ہے۔

مسئلہ :

مسجد کی چھت پر مباشرت کرنا، پیشاب کرنا اور پاخانہ کرنا مکروہ ہے کیونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد کی حیثیت رکھتی ہے حتّی کہ مسجد کی چھت سے (امام) نیچے والوں کی امامت کر سکتا ہے۔ نیز مسجد کے چھت پر

چڑھنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا اور جُنبی آدمی کے لیے اس پر کھڑا ہونا جائز نہیں ۔

مسئلہ :

جس گھر میں مسجد ہو اس گھر کی چھت پر پیشاب کرنے میں کوئی کراہت نہیں ۔ مسجد سے مراد گھر میں وہ جگہ ہے جو نماز کے لیے مخصوص کی گئی ہو ، کیونکہ ایسی جگہ مسجد کی حیثیت نہیں رکھتی ۔ اگرچہ گھروں میں نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کر لینا مستحب ہے ۔

مسئلہ :

مسجد کو مُقفّل کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ نماز سے روکنے کے مشابہ ہے ۔ بعض فقہاء کا ارشاد ہے کہ جب نماز کے اوقات نہ ہوں اور مسجد کے سامان کے چرائے جانے کا اندیشہ ہو تو مُقفّل کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

مسئلہ :

مسجد میں چونے ، ساگوان یا سنہری پانی سے نقش و نگار بنانے میں کوئی قباحت نہیں ۔ مصنفؒ کے قول ''لَا بَأْسَ'' میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ نقش و نگار باعث ثواب نہیں البتہ گناہ بھی نہ ہوگا ۔ یہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ اپنے ذاتی مال میں سے خرچ کرے ۔

مسجد کا متولی مال وقف کو صرف تعمیری کاموں پر خرچ کر سکتا ہے۔ مال وقف سے نقش و نگار کرنا جائز نہیں اگر اس نے ایسا کیا تو خود ذمہ دار ہوگا۔ واللہ اعلم بالصّواب !

بَابُ صَلَاةِ الْوِتْرِ

نماز وتر کا بیان

مسئلہ :

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وتر واجب ہیں ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ سنّت ہیں ۔ ان کے سنّت ہونے کے واضح دلائل موجود ہیں ، کیونکہ وتروں کا منکر کافر نہیں ہوتا ۔ نیز وتروں کے لیے اذان نہیں دی جاتی ۔ (لہذا ثابت ہوا کہ وتر سنت کا درجہ رکھتے ہیں) ۔

امام اعظمؒ کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے مزید ایک نماز کا اضافہ فرمایا ہے اور یہ نماز وتر ہے ۔ اسے عشاء اور طلوع فجر کے درمیانی عرصہ میں پڑھا کرو'' ۔ آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی امر پر مشتمل ہے اور امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے ۔ اسی بناء پر ان کی قضاء بالاجماع واجب ہوتی ہے ۔ رہی یہ بات کہ ان کا منکر کافر نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے (لہذا منکر کافر نہ ہو گا) بعض روایات میں امام اعظمؒ سے سنت کا لفظ بھی منقول ہے ۔ مگر سنت سے مراد یہ ھے کہ ان کا وجوب سنت سے ثابت ہے ۔

وتر چونکہ عشاء کے اوقات میں ادا کیے جاتے ہیں اس لیے عشاء کی اذان و اقامت ہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے درمیان سلام نہیں ہوتا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر ادا فرمایا کرتے تھے (اور درمیان میں سلام نہیں پھیرا کرتے تھے) مصنفؒ ابن شیبہ نے امام حسنؒ سے وتر کی تین رکعتوں پر تمام مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ امام شافعیؒ کے دوسرے قول کے مطابق وتر میں دو سلام ہیں۔ امام مالکؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن ہماری بیان کردہ حدیث ان دونوں کے خلاف حجت ہے۔

مسئلہ :

تیسری رکعت میں رکوع سے قبل دعاءِ قنوت پڑھے۔ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ رکوع کے بعد دعاءِ قنوت پڑھے۔ آنحضرتﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے وتروں کے آخر یعنی رکوع کے بعد دعاءِ قنوت پڑھی۔

ہماری دلیل ابن ماجہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے قبل دعاءِ قنوت پڑھی اور جب کوئی چیز نصف سے زائد ہو جائے تو وہ آخر ہی کہلاتی ہے (لہذا آپ کی پیش کردہ روایت سے یہ ثابت نہ ہوسکا کہ

آپ نے رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھی، کیونکہ رکوع سے قبل پر بھی آخر کا لفظ صادق آ سکتا ہے)۔

مسئلہ :

دعاء قنوت سارا سال پڑھے ۔ امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے کہ رمضان کے آخر کے علاوہ نہ پڑھے ۔
ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے حضرت حسنؓ بن علیؓ کو دعاء قنوت سکھاتے وقت فرمایا کہ ''یہ دعا وتر کی نماز میں پڑھا کرو'' ۔ آپ کے اس ارشاد میں کوئی تفصیل یا قید نہیں (بلکہ مطلق ارشاد ہے جس سے دعاء قنوت پر مداومت کا پتا چلتا ہے) ۔

مسئلہ :

وتر کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور ایک دوسری سورۃ پڑھے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''قرآن کریم سے جو میسر ہو پڑھا کرو'' ۔

مسئلہ :

جب دعاء قنوت پڑھنے کا ارادہ کرے تو تکبیر کہے کیونکہ حالت بدل چکی ہے (اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہوئے تکبیر کہی جاتی ہے) ۔

مسئلہ :

(تکبیر کہتے وقت) دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعاء قنوت

شروع کرے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سات مواقع کے علاوہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں ۔ اور ان (سات مواقع کے ضمن) میں قنوت کا تذکرہ بھی فرمایا ۔

مسئلہ :

نمازِ وتر کے علاوہ کسی دوسری نماز میں دعاء قنوت نہ پڑھی جائے ۔ فجر کی نماز کے بارے میں امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے ۔ ہماری دلیل حضرت ابن مسعودؓ کی بیان کی ہوئی حدیث ہے کہ ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک صبح کی نماز میں دعاء قنوت پڑھی مگر بعد میں ترک فرما دی“ ۔

مسئلہ :

اگر امام صبح کی نماز میں دعاء قنوت پڑھے تو طرفینؒ کے نزدیک مقتدی خاموش کھڑا رہے ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی بھی امام کی متابعت میں پڑھے کیونکہ وہ اپنے امام کے تابع ہے اور صبح کی نماز میں قنوت پڑھنا مختلف فیہ ہے (اس لیے محض شک کی بناء پر اصل یعنی قنوت کو ترک نہیں کیا جائے گا) ۔

طرفینؒ جواب میں کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں دعاء قنوت پڑھنا منسوخ ہو چکا ہے اور امرِ منسوخ میں متابعت امام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہاں امام کی متابعت کو برقرار رکھنے کی غرض سے (خاموشی سے) کھڑا رہے ۔ تاکہ متابعتِ واجبہ میں امام کے ساتھ شریک رہے ۔

بعض فقہاء کا ارشاد ہے کہ اظہار مخالفت کے لیے بیٹھ جائے کیونکہ جو شخص اقتداء میں خاموش کھڑا رہتا ہے وہ دعائے قنوت پڑھنے والے کا شریک حال ہوتا ہے (کیونکہ امام کی قراءۃ مقتدی کے حق میں بھی قراءۃ متصور ہوتی ہے) پہلا قول زیادہ ظاہر ہے (کہ مشروع افعال میں امام کی متابعت کرے اور غیر مشروع افعال میں نہ کرے بلکہ خاموش رہے)۔

مذکورہ مسئلے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حنفی، شافعی المسلک امام کی اقتداء کر سکتا ہے۔ نیز وتر نماز میں قراءۃ قنوت میں امام کی متابعت جائز ہے۔ حنفی مقتدی کو اگر کسی ایسے امر کا پتا چلے جو اس کے خیال میں مفسد نماز ہے۔ جیسے فصد کھلوانا (یا قے آنا) وغیرہ، تو اقتداء جائز نہ ہوگی۔ مختار مسلک کے مطابق قنوت میں اخفاء افضل ہے۔ کیونکہ قنوت دعا ہے۔ اور دعا میں اخفاء بہتر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ خَیْرُ الدُّعَاءِ الْخَفِیُّ)۔

بَابُ النَّوَافِلُ

نوافل کے بیان میں

(نوافل سے مراد عام ہے جو سنتوں کو بھی شامل ہیں)

مسئلہ :

نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں ، ظہر سے پہلے چار اور اور بعد میں دو ، عصر سے قبل چار، اگر چاہے تو دو، مغرب کے بعد دو، عشاء سے قبل چار، عشاء کے بعد چار یا اگر چاہے تو دو رکعتیں سنت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: کہ جس نے دن رات میں بارہ رکعتوں پر مواظبت کی اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے گھر تعمیر فرمائیں گے" اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ رکعتوں کی تفصیل اسی طرح بیان فرمائی جس طرح متن میں مذکور ہے۔ البتہ حدیث میں عصر سے قبل چار رکعتوں کا ذکر نہیں۔ اسی لیے امام محمدؒ نے اصل میں انہیں حسن اور خیر کہا ہے کیونکہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں (بعض روایات میں عصر سے قبل چار رکعتوں کا تذکرہ ہے اور بعض میں دو کا) مگر چار

پڑھنا افضل ہیں ۔ مذکورہ روایت میں آنحضرتؐ نے عشاء
سے قبل بھی چار رکعتوں کا تذکرہ نہیں فرمایا ۔ لہذا عدم
مواظبت کی بناء پر مستحب ہیں ۔

مذکورہ حدیث میں تو عشاء کے بعد دو رکعتوں کا
بیان ہے لیکن دوسری احادیث میں چار کا ذکر بھی ملتا ہے۔
اس لیے دو یا چار میں اختیار دیا گیا ۔ البتہ امام اعظمؒ کے
اصول کے مطابق چار رکعتیں حامل فضیلت ہیں ۔ (امام اعظمؒ
کا اصول ہے کہ رات کے وقت ایک سلام سے چار رکعت
نفل ادا کرنا افضل ہیں ۔

احناف کے نزدیک ظہر سے قبل ایک سلام سے چار
رکعتیں ادا کرنا افضل ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
ابو ایوب انصاریؓ سے اسی طرح فرمایا تھا ۔ امام شافعیؒ
کو اس میں اختلاف ہے ۔ (وہ دو رکعت الگ الگ پڑھنے
کو افضل قرار دیتے ہیں) ۔

مسئلہ :

مصنّفؒ فرماتے ہیں کہ دن کے وقت چاہے تو دو
رکعت نفل ایک سلام سے ادا کرے یا چار رکعت (ایک
سلام سے) اس پر اضافہ مکروہ ہے ۔ رات کے نفلوں کے بارے
امام اعظمؒ کا ارشاد ہے کہ اگر آٹھ رکعت نفل بھی ایک سلام
سے ادا کرے تو جائز ہے البتہ ان پر اضافہ مکروہ ہے ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ رات کے وقت ایک سلام سے
دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھے ۔

الجامع الصغیر میں رات کے وقت آٹھ رکعتوں کا ذکر

نہیں (بلکہ چھ رکعتوں کا بیان ہے) ۔ کراہت کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے زیادہ رکعتیں ایک سلام سے ادا نہیں فرمائیں ۔ اگر کراہت نہ ہوتی تو آپ جواز کی تعلیم دینے کے لیے ضرور اضافہ فرماتے ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک افضل صورت یہ ہے کہ رات کے وقت دو دو اور دن کے وقت چار چار رکعتیں ادا کرے ۔

امام شافعیؒ دن رات میں دو دو رکعتیں ادا کرنے کے قائل ہیں ۔ امام اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دن رات میں چار چار رکعتیں ادا کرے ۔

امام شافعیؒ کی دلیل آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ہے کہ ''دن اور رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں'' ۔ نیز امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ رات کے نوافل کو تراویح پر قیاس کرتے ہیں (اور نماز تراویح میں دو دو رکعت ہی ادا کی جاتی ہیں) ۔

امام اعظمؒ کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد چار رکعت ادا فرمایا کرتے تھے اور چاشت کے وقت بھی چار رکعتوں پر مواظبت فرمایا کرتے تھے ۔ نیز ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھنے میں تحریمہ کافی دیر تک باقی رہتی ہے اور مشقت بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ اس لیے فضیلت بھی زیادہ ہوگی ۔ اسی بناء پر اگر کوئی شخص نذر مانے کہ وہ ایک سلام سے چار رکعت نفل ادا کرے گا تو دو سلاموں سے چار رکعتیں ادا کرنے

پر اپنی نذر سے عہدہ برآ نہ ہوگا ۔ البتہ اس کا عکس جائز ہے (کہ اگر دو سلاموں سے چار رکعتوں کی نذر مانے تو ایک سلام سے چار ادا کر کے نذر پوری کر سکتا ہے) تراویح چونکہ جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اس لیے سہولت و آسانی کے پیش نظر دو دو رکعت کر کے ادا کی جاتی ہیں (تاکہ لوگوں کو تھکن محسوس نہ ہو) امام شافعیؒ کی روایت کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے ۔ کہ دن اور رات کی نمازیں جوڑا جوڑا اور جفت ہیں وتر اور طاق نہیں ۔ واللہ أعلم !

فَصْلٌ فِی الْقِرَاءَۃ

قراءۃ کے بیان میں

مسئلہ :

فرضوں کی دو رکعتوں میں قراءۃ واجب ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سب رکعتوں میں واجب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قراءۃ کے بغیر نماز نہیں ہوتی" اور ہر رکعت نماز کا حکم رکھتی ہے۔ امامؒ مالکؒ کے نزدیک تین رکعتوں میں قراءۃ واجب ہے۔ آسانی کے لیے اکثر کو کل کا قائم مقام قرار دیا گیا۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ'' امر بالفعل تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔

پہلی رکعت پر استدلال کرتے ہوئے ہم نے دوسری رکعت میں بھی قراءۃ کو واجب قرار دیا کیونکہ پہلی اور دوسری رکعتیں من کُلِّ الوجوہ آپس میں مشابہ ہیں۔ لیکن آخری دو رکعتیں پہلی دو رکعتوں سے مختلف ہیں، کیونکہ یہ سفر میں ساقط ہو جاتی ہیں۔ قراءۃ کے جہرواخفاء میں بھی یکساں نہیں اور مقدار میں بھی فرق ہے۔ اس لیے پہلی دو کے ساتھ (حکم میں) لاحق نہ ہوں گی۔

آپ کی پیش کردہ حدیث میں لفظ صلاۃ صراحۃً مذکور ہے ۔ لہذا اس سے مراد کامل نماز ہے اور یہ عُرف میں (کم از کم) دو رکعتیں ہیں ۔ جیسا کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے ”لا یُصَلِّی صَلاۃً“ (تو جب تک دو رکعت ادا نہ کرے گا حانث نہ ہوگا اگر لفظ صلاۃ صراحۃ مذکور نہ ہو اور یوں قسم کھائے کہ ”لَا یُصَلِّی“ (تو اس صورت میں ایک رکعت ادا کرنے سے بھی حانث ہو جائے گا) ۔

مسئلہ :

آخری دو رکعتوں میں اختیار ہے یعنی چاہے تو خاموش کھڑا رہے یا قراءۃ کرے یا فقط تسبیح پڑھ لے ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے ۔ تسبیح حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور عائشہ صدیقہؓ سے بھی منقول ہے ۔ مگر قراءۃ افضل ہے ۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءۃ پر مداومت فرمائی ۔ (چونکہ قراءۃ واجب نہیں) اسی لیے ظاہرالروایۃ کے مطابق ترک قراءۃ سے سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا ۔

مسئلہ :

نفل نماز کی تمام رکعتوں اور وتر کی تینوں رکعتوں میں قراءۃ واجب ہے ۔ نفلوں میں اس لیے کہ نفل نماز کا ہر شفع (یعنی جوڑا) علیحدہ نماز ہوتا ہے (سوال : نماز نفل میں جب ہر شفع الگ نماز کا حکم رکھتا ہے ۔ تو ایک تحریمہ سے چار رکعتیں کیونکر ادا ہو سکتی ہیں ۔ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ) تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہونا نئی تحریمہ

کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لہذا اگر کوئی شخص چار رکعت کی نیت کرے اور تیسری رکعت کے لیے قیام سے پہلے نماز فاسد کر دے تو احناف کے مشہور قول کے مطابق صرف دو رکعتوں کی قضاء واجب ہوگی ۔ اسی پر فقہاء نے فرمایا کہ تیسری رکعت سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ سے شروع کرے ۔ وتروں میں احتیاط کے مدنظر تینوں رکعتوں میں قراءۃ ضروری ہے (کیونکہ وتر امام اعظمؒ کے نزدیک واجب ہیں ۔ اس لیے قراءۃ تیسری رکعت میں واجب نہ ہوگی ۔ مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سنت ہیں اس لیے قراءۃ ضروری ہوگی ۔ اس اختلاف کی بناء پر احتیاط اسی میں ہے کہ تیسری رکعت میں بھی قراءۃ کو ضروری قرار دیا جائے) ۔

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص نفل شروع کر کے فاسد کر دے ، تو ان کی قضاء بھی کرے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر قضاء واجب نہیں ، کیونکہ اس کا فعل (نفلوں کے ادا کرنے میں) کار خیر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور کار خیر کرنے والے پر کوئی چیز لازم نہیں آتی (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ما علی المحسنین من سبیل") ۔

احنافؒ کہتے ہیں کہ جس قدر نفل پڑھ چکا ہے وہ عبادت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں لہذا ان کی تکمیل ضروری ہے تا کہ ادا کی ہوئی عبادت لغو اور باطل نہ ہو ۔

مسئلہ :

کسی نے چار رکعت نماز (نفل کی نیت کر کے) شروع کی،

پہلی دو رکعتوں میں اس نے قراءۃ کی، اور تشہد کے لیے قعود بھی کیا ۔ پھر آخری دو رکعتوں کو فاسد کر دیا ۔ تو صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے ۔ کیونکہ شفع اول کی تکمیل ہو چکی ہے ۔ تیسری رکعت کے لیے قیام بمنزلہ تحریمہ جدیدہ کے ہوگا ۔ اس لیے ان (دو) کو اپنے ذمے لازم کرنے والا ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ آخری دو رکعتوں کو شروع کرنے کے بعد فاسد کرے اگر شفع ثانی کو سروع کرنے سے پہلے ہی فاسد کر دے تو شفع ثانی کی قضاء لازم نہ آئے گی ۔

امام ابو یوسفؒ نذر پر قیاس کرتے ہوئے (شفع ثانی کی) قضاء کے قائل ہیں ۔ (یعنی جس طرح چار رکعت کی نذر سے چار لازم ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح چار رکعتوں کی نیت سے بھی چار لازم ہوں گی ۔ خواہ پہلے شفع ہی کو باطل کر دے تب بھی چار کی قضاء ضروری ہوگی ۔

طرفینؒ فرماتے ہیں کہ شروع کرنے سے دو چیزیں لازم ہو جاتی ہیں ۔ ایک تو وہ جس کی ابتداء کی ہے اور دوسری وہ جس کے بغیر اس کی صحت ممکن نہ ہو ۔ جیسے نفل شروع کر دینے سے لازم ہو گئے نیز دوسری رکعت کا ادا کرنا بھی ضروری ہوگا کیونکہ دوسری رکعت کے بغیر پہلی رکعت کی صحت بھی ممکن نہیں) شفع اول کی صحت کا دارو مدار دوسرے شفع پر نہیں ہوتا ۔ بخلاف دوسری رکعت کے (کہ پہلی رکعت کی صحت کا مدار دوسری رکعت پر ہوتا ہے) ظہر کی سنتوں میں بھی یہی اختلاف ہے کیونکہ یہ بھی نفل

کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بعض فقہاء کا ارشاد ہے کہ احتیاط کے مدنظر چار کی قضاء کی جائے کیونکہ یہ (فرائض ظہر کی طرح) بمنزلہ صلاۃ واحدہ ہیں۔

مسئلہ:

اگر چار رکعتیں پڑھے لیکن ان میں قراءۃ نہ کرے تو طرفین کے نزدیک دو رکعتوں کا اعادہ کرے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ چار کی قضاء کرے۔

اس مسئلے کی آٹھ صورتیں ہیں (بلکہ تمام صورتیں سولہ بنتی ہیں (۱) تمام رکعتوں میں قراءۃ کرے۔ (۲) سب میں چھوڑ دے۔ (۳) شفع اول میں ترک کر دے۔ (۴) شفع ثانی میں ترک کر دے۔ (۵) رکعت اولی میں ترک کردے۔ (۶) رکعت ثانیہ میں ترک کرے۔ (۷) رکعت ثالثہ میں ترک کرے۔ (۸) رکعت رابعہ میں ترک کرے۔ (۹) شفع اول اور رکعت ثالثہ میں ترک کرے۔ (۱۰) شفع اول اور رکعت رابعہ میں ترک کرے۔ (۱۱) رکعت اولی اور شفع ثانی میں ترک کرے۔ (۱۲) رکعت ثانیہ اور شفع ثانی میں چھوڑ دے۔ (۱۳) پہلی اور تیسری رکعت میں چھوڑے۔ (۱۴) پہلی اور چوتھی رکعت میں چھوڑے۔ (۱۵) دوسری اور تیسری میں چھوڑے۔ (۱۶) دوسری اور چوتھی رکعت میں قراءۃ ترک کرے۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے پہلی صورت کو بیان نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ آٹھ صورتیں متن میں واضح کر دی گئی ہیں اور سات کے احکام ضمنی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں)۔

مندرجہ بالا مسئلے میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ کے اصول کے مطابق پہلی دونوں رکعتوں میں یا ایک میں قراءۃ چھوڑ دینے سے تحریمہ باطل ہو جاتی ہے کیونکہ تحریمہ کا انعقاد افعال (مخصوصہ) کے لیے ہوتا ہے۔ (لیکن جب ترک قراءۃ سے افعال ہی میں فساد پیدا ہو گیا تو تحریمہ خود بخود باطل ہو گئی)۔

امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ شفع اول میں قراءۃ چھوڑنے سے تحریمہ باطل نہ ہو گی۔ البتہ ادا میں فساد آجائے گا۔ کیونکہ قراءۃ رکن زائد ہے کیا آپ کو معلوم نہیں؟ کہ قراءۃ کے بغیر بھی نماز کا وجود ممکن ہے۔ (جیسے گونگے کی نماز۔ اگر قراءۃ رکن اصلی ہوتا تو تحریمہ باطل ہو جاتی۔ مگر مذکورہ صورت میں تحریمہ باطل نہیں ہوگی اور دوسرے دوگانہ کی قضاء بھی لازم ہوگی)۔ البتہ قراءۃ کے بغیر ادا صحیح نہیں ہوتی، لیکن فسادِ ادا اس کے ترک کرنے سے زیادہ نہیں۔ اس لیے تحریمہ باطل نہ ہوگی۔ (اگر نماز کے دوران کوئی شخص بے وضو ہو جائے تو وہ اداء نماز کو ترک کر کے وضو کرنے جاتا ہے اور واپس آ کر سابقہ نماز پر بناء کرتا ہے۔ ادا ترک کرنے کے باوجود اس کی تحریمہ باطل نہیں ہوتی۔ اور فسادِ ادا تو اس سے کمتر درجے کی چیز ہے، لہذا اس سے بھی تحریمہ باطل نہ ہوگی)۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پہلی دونوں رکعتوں میں قراءۃ چھوڑنے سے تحریمہ باطل ہو جاتی ہے اور ایک رکعت میں چھوڑنے سے باطل نہیں ہوتی کیونکہ نفلی نماز کا

پر شفع یعنی دوگانہ علیحدہ نماز کا حکم رکھتا ہے (اس لیے دونوں رکعتوں میں قراءۃ چھوڑ دینے سے تحریمہ باطل ہو جائے گی)۔

ایک رکعت میں قراءہ چھوڑنے سے نماز کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے۔ مگر ہم نے احتیاط کے طور پر قضاء کے واجب کرنے کے لیے فاسد ہونے کا فیصلہ دیا اور شفع ثانی لازم کرنے کے لیے تحریمہ کو باقی تسلیم کیا۔ (ایک رکعت میں قراءۃ کرنے اور دوسری میں چھوڑ دینے سے نماز کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک رکعت ہی میں قراءۃ کافی ہے کیونکہ امر۔ فَاقْرَءُوا۔ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ اس لیے حسن بصریؒ کے نزدیک شفع کی قضاء واجب نہ ہوگی۔ مگر امام اعظمؒ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قراءۃ ضروری ہے اس لیے ایک رکعت میں ترک قراءۃ سے شفع کی قضاء ضروری ہو گی۔ البتہ تحریمہ باقی ہوگی۔ امام محمدؒ کے نزدیک تحریمہ باطل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا شفع ثانی کی قضاء ضروری نہیں۔

امام اعظمؒ کا مسلک اعتدال اور احتیاط کے زیادہ قریب ہے کہ ایک رکعت میں ترک قراءۃ سے قضاء ضروری ہوگی۔ لیکن تحریمہ باقی رہے گی)۔

مذکورہ بیان سے جب علماء ثلاثہ کے اصول کی وضاحت ہو گئی تو ہم کہتے ہیں کہ جب چاروں رکعتوں میں قراءۃ نہ کرے تو طرفینؒ کے نزدیک دو رکعتوں کی قضاء کرے کیونکہ طرفینؒ کے اصول کے مطابق شفع اول میں ترک قراءۃ

سے تحریمہ ہی باطل ہو جائے گی اس لیے شفع ثانی کا اس پر بناء کرنا درست نہ ہوگا ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چونکہ تحریمہ باق ہے اس لیے شفع ثانی کو شروع کرنا بھی صحیح ہوگا ۔ پھر جب تمام رکعتیں قراءۃ چھوڑ دینے کی وجہ سے فاسد ہوگئیں تو اسے چار رکعتوں کی قضاء کرنا ہوگی ۔

مسئلہ :

صورت نمبر (۲) اگر صرف پہلی دو رکعتوں میں قراءۃ کر لے تو اجماعی طور پر اس کے ذمے آخری دو کی قضاء ہوگی کیونکہ تحریمہ باطل نہیں ہوئی اس لیے شفع ثانی کو شروع کرنا صحیح ہوگا اور ترک قراءۃ کی بنا پر دوسرے شفع کے باطل ہونے سے پہلے شفع کا بطلان لازم نہیں آتا) کیونکہ ہر شفع الگ الگ نماز ہے) ۔

مسئلہ :

صورت نمبر (۳) اگر صرف آخری دو رکعتوں میں قراءۃ کرے تو متفقہ طور پر پہلی دو قضاء کرے کیونکہ طرفینؒ کے نزدیک شفع ثانی کو شروع کرنا ہی صحیح نہیں رہا ۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شفع ثانی کو شروع کرنا صحیح ہے اور اس نے شفع ثانی کو صحیح طور پر ادا بھی کر دیا (اس لیے پہلی دو کی قضاء ضروری ہوگی) ۔

مسئلہ :

صورت نمبر (۴ - ۵ - ۶) اگر پہلی دونوں اور آخری

دو میں سے کسی ایک میں قراءۃ کرے تو اجماعاً آخری دو کی قضاء ہوگی ۔ اگر آخری دونوں اور پہلی دو میں سے کسی ایک میں قراءۃ کرے تو متفقہ طور پر پہلی دو کی قضاء کرے اگر پہلی اور آخری میں قراءۃ کرے تو امام ابو یوسفؒ اور امام اعظمؒ کے نزدیک چار کی قضاء ہوگی کیونکہ تحریمہ باقی ہے ۔

امام محمدؒ کے نزدیک پہلی دو کی قضاء ہوگی کیونکہ تحریمہ باطل ہو چکی ہے ۔ امام ابو یوسفؒ نے اس روایت کی نقل سے انکار کیا اور فرمایا کہ میں نے دو رکعتوں کی قضاء کی روایت امام اعظمؒ سے لی تھی ۔ مگر امام محمدؒ نے ابو یوسفؒ کی روایت سے رجوع نہیں کیا (جب امام محمدؒ نے الجامع الصغیر کو امام ابو یوسفؒ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو یہ بتایا تھا کہ امام اعظمؒ کے نزدیک دو رکعتوں کی قضاء ہے مگر آپ نے چار کی لکھی ہوئی ہے ۔ امام محمدؒ نے جواب دیا ۔ نہیں ۔ آپ بھول رہے ہیں ۔ آپ نے تو امام اعظمؒ سے چار رکعت قضاء کرنے کی روایت کی تھی ۔ چنانچہ امام محمدؒ الجامع الصغیر والی روایت ہی پر قائم رہے) ۔

مسئلہ :

صورت نمبر (۷) اگر پہلے شفع کی صرف ایک رکعت میں قراءۃ کی تو امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چار کی قضاء کرے اور امام محمدؒ کے نزدیک دو کی ۔

صورت نمبر (۸) اگر دوسرے شفع کی صرف ایک رکعت

میں قراءۃ کی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چار قضاء کرے اور طرفینؒ کے نزدیک دو۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ''لَا يُصَلَّى بَعْدَ صَلٰوةٍ مِثْلُهَا'' کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعتیں قراءۃ کے ساتھ اور دو بغیر قراءۃ نہ پڑھو (جیسے فرض نماز میں کرتے ہو) تو یہ روایت نفل کی تمام رکعتوں میں فرضیت قراءۃ کی توضیح کرتی ہے۔

مسئلہ :

قیام کی قدرت ہوتے ہوئے بھی بیٹھ کر نفل پڑھنا جائز ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملتا ہے'' (اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیٹھ کر پڑھنے والے کو ثواب ملتا ہے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ نماز بھلائی اور نیکی کا عمدہ ذریعہ ہے اور بسا اوقات (تھکان اور کمزوری وغیرہ کی وجہ سے) قیام مشکل ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں ترک قیام جائز قرار دیا گیا تا کہ یہ نفلی عبادت اس سے منقطع نہ ہو جائے۔

قعود کی کیفیت میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ لیکن مختار صورت یہ ہے کہ وہ اسی طرح بیٹھے جس طرح حالت تشہد میں بیٹھتا ہے، کیونکہ یہی نماز میں مشروع اور مسنون دیکھا گیا ہے۔

مسئلہ :

اگر نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کی اور بلا عذر بیٹھ گیا تو امام اعظمؒ کے نزدیک استحسان کے پیش نظر جائز ہے ۔ صاحبینؒ جواز کے قائل نہیں ، اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے ، کیونکہ شروع کرنے کی حالت کو نذر پر قیاس کیا گیا ہے ۔ (اگر کوئی شخص کھڑا ہو کر نفل ادا کرنے کی نذر مانے تو بیٹھ کر ادا کرنا جائز نہ ہوگا ۔ اسی طرح اگر نماز کی ابتداء کھڑا ہو کر کرے تو بلاعذر بیٹھنا جائز نہ ہوگا) ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس نے باقی ماندہ نماز میں قیام نہیں کیا اور جس حصے میں قیام کیا ہے وہ اس باقی ماندہ حصے کے بغیر بھی صحیح ہے ۔ (مثلاً ایک شخص نے چار رکعت نفل کھڑے ہو کر شروع کیے دو رکعتوں کے بعد بیٹھ گیا اور باقی دو رکعتیں اس نے بیٹھ کر ادا کیں ۔ تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہیں ، کیونکہ شفع اول کی صحت میں تو کوئی شک نہیں ۔ اس نے یہ بحالت قیام شروع کیا تھا اور بحالت قیام ہی اس کی تکمیل کی ۔ دوسرا شفع مستقل نماز ہے اگر اس میں قیام نہیں کیا تو کوئی حرج کی بات نہیں کیونکہ اس نے شفع ثانی کی بیٹھ کر ہی ابتداء کی اور بیٹھ کر ہی اس کو پورا کیا اور پہلا شفع جس میں قیام کیا تھا وہ دوسرے شفع کے بغیر بھی درست ہے لہذا دوسرے میں قیام نہ کرنے سے پہلے کی صحت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا) ۔

بخلاف نذر کے ، کیونکہ نذر میں قیام بذریعہ نص (کہ میں کھڑا ہو کر ادا کروں گا) لازم کر لیا جاتا ہے حتی کہ اگر (اپنی نذر میں) قیام کی تصریح نہ کرے تو بعض مشائخؒ کے نزدیک قیام لازم نہیں ہوتا۔

مسئلہ :

جو شخص شہر سے باہر ہو (اور سواری پر ہو تو) وہ سواری ہی پر اشاروں سے نفل ادا کر سکتا ہے۔ سواری جدھر چاہے رخ کرے اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے ، آپ نے فرمایا: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارے سے نماز پڑھتے دیکھا اس حالت میں کہ آپ خیبر کی طرف متوجہ تھے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نوافل ادا کرنے کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں (جب بھی جی چاہے انسان اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو سکتا بشرطیکہ ایسا وقت نہ ہو جس میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے) (ایسی صورت میں) اگر ہم نمازی پر سواری سے اترنا اور استقبال قبلہ لازم قرار دیں تو اس کے نفل چھوٹ جائیں گے یا وہ قافلے سے پیچھے رہ جائے گا لیکن فرائض کا وقت معیّن و مخصوص ہے (یہ سب اہل قافلہ رک کر ادا کریں گے اس لیے نہ بچھڑنے کا اندیشہ ہے نہ نماز چھوٹنے کا خطرہ ، سب اپنی اپنی سواریوں سے اتریں گے اور قبلہ رو ہو کر فرض ادا کریں گے۔ سنن راتبہ بھی نفل ہی ہیں (اس لیے سواری پر ادا کی جا سکتی ہیں) امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ صبح کی سنت سواری سے اتر

کر ادا کرے کیونکہ تمام سنت نمازوں میں اس کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

متن میں "خارج المصر" کی قید سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ اول یہ کہ مسافر ہونا شرط نہیں (بلکہ مقیم بھی شہر سے باہر سواری پر نفل ادا کر سکتا ہے)۔ دوم یہ کہ شہر میں (سواری پر نفلوں کا ادا کرنا جائز نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ شہر میں بھی (سواری پر نفل ادا کرنا) جائز ہے۔ ظاہر روایت کی (جو متن میں درج ہے) وجہ یہ ہے کہ نص میں خارج مصر کی قید موجود ہے۔ نیز سواری کی ضرورت ہمیشہ عموماً شہر سے باہر ہی پیش آتی ہے۔

مسئلہ :

اگر سواری پر نماز نفل کا افتتاح کرے پھر نیچے آتر آئے تو اپنی سابقہ نماز پر بناء کرے لیکن اگر نیچے اتر کر ایک رکعت پڑھے اور پھر سوار ہو جائے تو نماز از سر نو پڑھے (اور پہلی پر بناء نہ کرے) کیونکہ سوار کی تکبیر تحریمہ سے رکوع و سجود کا جواز یلق رہتا ہے۔ اسے سواری سے اترنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ لہذا جب وہ اتر کر رکوع و سجود ادا کرنے لگے تو اس کی ادا جائز ہوگی، مگر اترے ہوئے شخص کی تحریمہ رکوع و سجود کو واجب قرار دیتی ہے لہذا عذر کے بغیر لازم اور واجب امر کے ترک کرنے میں اختیار نہ ہوگا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ سواری سے اترنے کی

صورت میں بھی نئے سرے سے نماز کا افتتاح کرے۔ جب سواری پر ایک رکعت ادا کرکے نیچے اترے تو امام محمدؒ کے نزدیک یہی ساتھ نماز پر بناء جائز نہیں، مگر متن والی روایت زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔

فَصْلَ فِي قِيامِ رَمَضانَ

رمضان میں قیام کرنے کا بیان

مسئلہ :

ماہ رمضان میں مستحب یہ ہے کہ لوگ نماز عشاء کے بعد مسجد میں جمع ہو جائیں اور امام انہیں پانچ ترویحات پڑھائے۔ ہر ترویحہ دو سلاموں کے ساتھ ادا کیا جائے۔ دو ترویحوں کے درمیان ایک ترویحے کی مقدار بیٹھا جائے، تراویح کے بعد امام وتر پڑھائے۔

متن میں لفظِ استحباب کا ذکر ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تراویح سنت ہیں۔ امام حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ نیز خلفاءِ راشدین نے نماز تراویح پر مداومت فرمائی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک مواظبت کی وجہ بیان فرما دی تھی کہ مجھے ان کی فرضیت کا اندیشہ ہے۔

مسئلہ :

تراویح میں جماعت بطریقِ الکفایہ مسنون ہے یعنی اگر تمام اہل مسجد اقامت جماعت سے غافل ہو جائیں تو گنہگار ہوں گے اگر بعض نے جماعت قائم کر لی تو جماعت میں شامل نہ ہونے والے تارک فضیلت ہوں گے (گنہگار نہ ہوں گے)

کیونکہ کئی صحابہؓ سے تخلف عن الجماعۃ مروی ہے ۔

دو ترویحوں کے درمیان ایک ترویحے کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے ۔ اسی طرح پانچویں ترویحے اور وتر کے درمیان بھی جلوس مستحب ہے ، کیونکہ اہل حرمین شریفین کی یہی عادت تھی ۔

بعض اصحاب نے پانچ تسلیمات (یعنی نصف تراویح) کے بعد استراحت کو مستحسن قرار دیا ہے ، مگر یہ صحیح نہیں ۔ مصنف کا ارشاد کہ ثُمَّ یُوتِرُبِہِمْ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نماز تراویح کا وقت نماز عشاء کے بعد اور وتر سے پہلے ہے ۔ عامۃ المشائخ کا بھی یہی قول ہے ، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ تراویح کا وقت نماز عشاء کے بعد سے پہلے ہے ، کیونکہ تراویح ایسے نفل ہیں جو نماز عشاء کے بعد مسنون ہیں ۔

تراویح میں مقدار قراءۃ کہیں مذکور نہیں لیکن اکثر مشائخ کا یہ کہنا ہے کہ ایک بار قرآن مجید ختم کرنا مسنون ہے ۔ اسے لوگوں کی غفلت اور سستی کی بناء پر چھوڑا نہ جائے ۔ بخلاف تشہّد کے بعد کی طویل دعاؤں کے (اگر لوگ تنگ دلی اور لاپرواہی محسوس کریں تو) انہیں چھوڑ سکتا ہے کیونکہ وہ سنت کا درجہ نہیں رکھتیں ۔

مسئلہ :

ماہ رمضان کے علاوہ وتر جماعت سے نہ پڑھے ۔ تمام مسلمانوں کا اسی پر اجماع ہے واللہُ اَعْلَمُ !

بَابُ اِدْرَاكِ الْفَرِيضَةِ

فرض نماز مین شامل ہونے کا بیان

مسئلہ :

ایک شخص نے ابھی ظہر کی ایک رکعت ہی ادا کی کہ اتنے میں جماعت کے لیے اقامت کہہ دی گئی تو وہ ایک رکعت اور پڑھ لے تاکہ ادا کی ہوئی رکعت ضائع ہونے سے محفوظ رہے پھر (سلام پھیر کر) لوگوں کے ساتھ جماعت مین شامل ہو جائے تاکہ فضیلت جماعت سے بہرہور ہو سکے۔

مسئلہ :

اگر پہلی رکعت کو مقیّد بالسّجدہ نہ کیا ہو تو اپنی نماز کو قطع کرکے جماعت میں شامل ہو جائے، یہی صحیح ہے، کیونکہ سجدہ سے پہلے رکعت کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ (کیونکہ جب تک رکعت سجدہ کے ساتھ مقید نہ ہو عبادت نہیں بنتی) نیز رکعت کا چھوڑنا بھی کامل چیز حاصل کرنے کی غرض سے ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا کامل اور جماعت کے بغیر ناقص ہے) بخلاف اس صورت کے جب وہ نفل پڑھ رہا ہو (تو نماز قطع نہ کرے) کیونکہ یہ ترک اکمال کے

لیے نہیں لہذا نفل کی رکعت کو اگر مقید بہ سجدہ نہ بھی کرے تب بھی دو رکعت پوری کرے۔

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر ظہر یا جمعہ سے پہلے نماز سنت میں مصروف ہو اور اتنے میں اقامت کہی جائے یا خطبہ شروع ہو جائے تو دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دے بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ نمازِ سنت کی تکمیل کرے۔

مسئلہ :

اگر ظہر کی تین رکعتیں ادا کر چکا ہو تو نماز کی تکمیل کرلے کیونکہ اکثر شے حکم میں کل کے قائم مقام ہوتی ہے۔ لہذا نقص کا احتمال بھی نہ رہے گا۔ (یعنی چھوڑنا ضروری نہ ہوگا) بخلاف اس صورت کے جبکہ تیسری رکعت میں ہو اور اسے مقید بالسجدہ نہ کیا ہو تو نماز کو قطع کر دے کیونکہ اسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسے اختیار ہوگا کہ بیٹھ جائے اور سلام پھیر دے یا کھڑے کھڑے تکبیر کہ کر امام کی نماز میں شامل ہو جائے۔

مسئلہ :

(مذکورہ صورت میں یعنی) جب تیسری رکعت پڑھ چکا ہو۔ نماز مکمل کرنے پر جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور نفل پڑھے کیونکہ وقتِ واحد میں فرائض کا تکرار مشروع نہیں۔

مسئلہ :

اگر نماز فجر کی ایک رکعت پڑھ چکا ہو اور اقامت

کھڑی جائے تو نماز کو قطع کر کے جماعت میں شامل ہو جائے کیونکہ اگر پہلی رکعت کے ساتھ دوسری رکعت بھی ملائے گا تو جماعت سے محروم رہے گا ۔ اسی طرح اگر دوسری رکعت میں ہو تو سجدہ کرنے سے پہلے قطع کر دے (اور جماعت میں شامل ہو جائے) لیکن نماز پوری کرنے کے بعد جماعت میں شامل نہ ہو کیونکہ نماز فجر کے بعد نفل مکروہ ہیں ۔ ظاہر الروایۃ کے مطابق نماز مغرب کے بعد بھی جماعت میں شامل نہ ہو کیونکہ تین رکعت نفل مکروہ ہیں اور اگر چار پورے کرے تو امام کی مخالفت لازم آتی ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص ایسی مسجد میں داخل ہو جس میں اذان ہو چکی ہو ، تو نماز پڑھے بغیر اس سے نکلنا مکروہ ہے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اذان کے بعد مسجد سے یا تو منافق نکلتا ہے یا وہ جسے کوئی ضروری حاجت درپیش ہو اور وہ واپس آنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو'' ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے جانے میں کوئی حرج نہیں جس کے ذمے (کسی دوسری مسجد میں) جماعت کا انتظام ہو اگرچہ ظاہراً تو ترک جماعت ہے مگر حقیقۃً تکمیل جماعت ہے ۔

مسئلہ :

(اگر جماعت سے قبل) وہ نماز پڑھ چکا ہو اور ظہر یا عشاء کا وقت ہو تو مسجد سے جانے میں کوئی حرج نہیں ۔

کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دینے والے کا ایک بار جواب دے چکا ہے ۔ البتہ اس اثناء میں مؤذن اگر اقامت کہنے لگے (تو باہر نہ جائے بلکہ جماعت میں شامل ہو جائے) ورنہ ظاہر کے لحاظ سے اسے ترک جماعت کا الزام لگایا جائیگا ۔ اگر عصر یا مغرب یا فجر کی نماز کے بعد نکلے خواہ مؤذن اقامت کہنے لگے تو کوئی حرج نہیں ، کیونکہ ان نمازوں کے بعد نفل مکروہ ہیں ، (اس لیے مخالفتِ جماعت کے الزام کا بھی کوئی اندیشہ نہیں) ۔

مسئلہ :

جو شخص امام کو نمازِ فجر کی جماعت کراتے دیکھے اور اس نے فجر کی دو سنتیں ابھی نہیں پڑھیں ۔ اگر اسے ڈر ہو کہ (دو رکعت سنت ادا کرنے سے) جماعت کی پہلی رکعت جاتی رہے گی لیکن دوسری میں شامل ہو جائے گا تو مسجد کے دروازے کے پاس دو رکعت سنت ادا کر کے جماعت میں شامل ہو جائے کیونکہ دونوں فضیلتوں کو جمع کرنا اس کے لیے ممکن ہے ۔

اگر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو (تو دو رکعت سنت چھوڑ کر) امام کے ساتھ شریک ہو جائے کیونکہ جماعت بہت بڑے اجر کا سبب ہے اور ترک جماعت پر وعید شدید مروی ہے ۔ بخلاف ظہر کی سنتوں کے ، انہیں دونوں صورتوں میں چھوڑ دے کیونکہ ان کا فرض کے بعد بھی وقت میں ادا کرنا ممکن ہے ۔ یہی صحیح ہے ۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان اس امر میں

اختلاف ہے کہ چار سنّتوں کو دو سنّتوں سے قبل ادا کرے یا بعد میں۔ مگر فجر کی سنتوں کی یہ صورت نہیں۔ (کیونکہ انھیں فرض کے بعد ادا نہیں کیا جاتا) جیسا کہ ہم ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

''عند باب المسجد'' کی قید سے پتا چلتا ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو تو مسجد میں سنّتِ فجر کا ادا کرنا مکروہ ہے (ہمارے ملک میں مسد کے باہر سنتوں کے لیے عموماً جگہ مخصوص نہیں ہوتی اس لیے جماعت سے پیچھے ہٹ کر ایک طرف ادا کی جا سکتی ہیں)۔

تمام سنت اور نوافل کو گھر پر ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ :

اگر فجر کی سنّتیں رہ جائیں تو طلوع آفتاب سے پہلے قضاء نہ کی جائیں، کیونکہ اپنے مناسب وقت پر ادا نہ کرنے سے ان کی حیثیت نفل کی سی ہو جاتی اور نماز فجر کے بعد نفل ادا کرنا مکروہ ہیں۔

شیخینؒ کے نزدیک ارتفاع شمس کے بعد بھی ادا نہ کی جائیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ زوال شمس تک قضاء کی جا سکتی ہیں، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے لیلۃ التعریس کی صبح کو ارتفاع شمس کے بعد ادا فرمائی تھیں۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ سنن کا بنیادی اصول تو یہ ہے کہ ان کی قضاء نہ کی جائے کیونکہ قضاء امر واجب کے ساتھ خاص ہوتی ہے اور جس روایت سے آپ نے استدلال

کیا ہے اس میں سنّتوں کا ادا کرنا فرضوں کے تابع ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کے فرض بھی رہ گئے تھے) ۔ اس کے علاوہ سنن اپنے اصل پر باقی ہوں گی ۔ فجر کی سنّتیں زوال کے وقت تک فرضوں کے تابع ہو کر قضاء ہوں گی ، جماعت کے ساتھ نماز پڑھے یا انفرادی طور پر (یعنی اگر فرض بھی رہ گئے ہوں تو زوال شمس تک فرضوں کے ساتھ سنت بھی قضاء کر سکتا ہے) ۔

زوال کے بعد سنتوں کے ادا کرنے میں مشائخ کا اختلاف ہے (بعض قضاء کے قائل ہیں اور بعض نہیں) فجر کے علاوہ صرف دوسری سنتوں کو وقت کے بعد قضاء نہ کرے ۔ فرض کے تابع کر کے ادا کرنے میں بھی مشائخ کا اختلاف ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص ظہر کی نماز میں (جماعت کے ساتھ) صرف ایک رکعت میں شریک ہوا ۔ وہ نماز ظہر جماعت کے ساتھ پڑھنے سے محروم رہا ۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس نے جماعت کی فضیلت حاصل کر لی کیونکہ جس نے کسی چیز کے آخر کو پا لیا گویا اس نے اس چیز کو پا لیا ۔ وہ ثواب سے تو بہرہ ور ہوگا مگر اس نے حقیقۃً ظہر کی نماز جماعت سے ادا نہیں کی ۔ اسی اصول کی بناء پر اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ جماعت کو نہیں پائے گا تو مذکورہ صورت میں حانث ہوگا لیکن اگر یوں قسم کھائے کہ ظہر جماعت کے ساتھ نہیں پڑھے گا تو حانث نہ ہوگا ۔

مسئلہ :

جو شخص جماعت ہو جانے کے بعد مسجد میں آئے وہ نماز فرض سے پہلے وقت کے اندر جس قدر نوافل چاہے ادا کر سکتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت میں وسعت و گنجائش ہو ۔ اگر وقت تنگ ہو تو نوافل وغیرہ چھوڑ دے (اور مکتوبہ نماز پڑھے) صاحب محیط اور تمر تاشی فرماتے ہیں کہ یہ حکم سنت ظہر اور فجر کے علاوہ ہے کیونکہ ان دونوں اوقات کی سنّتیں بڑی فضیلت کی حامل ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت فجر کے بارے میں ارشاد ہے کہ ''انھیں ضرور پڑھا کرو خواہ تمھیں گھوڑے روند ڈالیں'' دوسری روایت میں وارد ہے : ''جس شخص نے ظہر سے پہلے چار رکعت ترک کر دیں وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا'' ۔

علامہ ''صدر الاسلام فرماتے ہیں کہ تمام سنن کا یہی حکم ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے وقت ان پر مواظبت فرمائی اور مواظبت کے بغیر ان کا سنت ہونا ثابت نہیں ہوتا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی طور پر نماز پڑھتے وقت بھی انھیں ترک نہیں فرمایا ۔ اس لیے منفرد شخص کے لیے بھی ان کا مسنون ہونا ثابت ہے ۔ صاحب ہدایہ کے قول ''وَلَا سُنَّةَ دُونَ الْمَوَاظَبَةِ'' سے پتا چلتا ہے کہ منفرد کے لیے یہ سنتیں ضروری نہیں) ۔ لیکن اولی یہی ہے کہ سنن کو کسی حالت میں بھی

(خواہ جماعت سے نماز ادا کرے یا تنہا) ترک نہ کرے کیونکہ یہ فرائض میں واقع ہونے والی کمی اور نقصان کی تلافی کرتی ہیں ہاں اگر وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو چھوڑ سکتا ہے۔

مسئلہ :

امام رکوع میں تھا اور ایک شخص شریک جماعت ہوا اس نے تکبیر تحریمہ کہی اور کھڑا رہا حتی کہ امام نے رکوع سے سر اٹھایا تو وہ شخص اس رکعت کو پانے والا نہ ہوگا۔ امام زفرؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ امام کے ساتھ اس امر میں (یعنی رکوع میں) جو قیام کے حکم میں داخل ہے شریک ہوگیا (یعنی رکوع بھی حکماً قیام میں شامل ہے تو گویا مقتدی امام کے ساتھ قیام ہی میں شریک ہوگیا۔ اس لئے رکعت میں بھی شریک شمار کیا جائے گا)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ افعال صلاۃ میں مشارکت شرط ہے اور یہ مشارکت نہ تو قیام میں پائی گئی اور نہ رکوع میں۔

مسئلہ :

اگر مقتدی اپنے امام سے پہلے رکوع میں چلا گیا اور امام نے بعد میں رکوع کیا تو مقتدی کی نماز جائز ہو جائے گی۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی کی نماز فاسد ہوگی کیونکہ اس نے جو رکوع امام سے پہلے کیا وہ قابل اعتبار

نہیں اور جو کچھ اس پر مبنی ہوگا اس کا اعتبار بھی ساقط ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جزء واحد میں مشارکت شرط ہے، جیسا کہ طرف اول میں (یعنی رکوع تو امام کے ساتھ کرے مگر کھڑا اس سے پہلے ہو جائے تو نماز جائز ہوگی اسی طرح مذکورہ صورت میں بھی جائز ہوگی)۔ واللہ اعلم!

بَابُ قَضَاءِ الْفَوَائِتِ

فوت شدہ نمازوں کی قضاء کے بیان میں

مسئلہ :

جس شخص کی نماز فوت ہو جائے تو یاد آنے پر اسے قضاء کرے لیکن وقتی فرض سے پہلے قضاء کرے کیونکہ ہمارے نزدیک قضاء نمازوں اور وقتی فرض میں ترتیب ایک ضروری امر ہے ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ترتیب مستحب ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر فرض نماز بذاتہ اصل کی حیثیت رکھتی ہے لہذا غیر کے لیے شرط نہ ہوگی ۔ امام شافعیؒ کے اصول کی تفصیل یہ ہے ۔ اگر ترتیب واجب ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تک وہ مثلاً فجر کی فوت شدہ نماز قضاء نہ کرے اس کی وقتی یعنی ظہر کی نماز درست نہ ہوگی ۔ لہذا

اداء فجر اداء ظہر کی شرط ہوگی اور یہ مسلّمہ قانون ہے کہ شرط مشروط کے تابع ہوتی ہے مگر جب ہر فرض اصل بنفسہ ہے تو دوسرے کے لیے شرط کیونکر بنے گا) ؟

ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''جو شخص سو گیا اور نماز نہ پڑھ سکا یا پڑھنا بھول گیا اور اس وقت یاد آیا جب وہ امام کے ساتھ

شریک جماعت تھا تو جس نماز میں مشغول ہے اُسے پورا کرے پھر اسے پڑھے جسے یاد کیا اور پھر اس نماز کا اعادہ کرے جو اُس نے امام کے ساتھ ادا کی ہے"۔

مسئلہ :

اگر وقت کے نکل جانے کا اندیشہ ہو تو پہلے وقتی نماز ادا کرے بعد میں قضاء کرے۔ قِلّۃِ وقت ، نسیان اور کثرت فوائت کی بناء پر ترتیب ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ تنگیِ وقت کے باوجود فوت شدہ یا یاد آنے والی نماز کو ادا کرے گا تو) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وقتی نماز بھی فوت ہو جائے گی۔

مسئلہ :

اگر فائتہ کو وقتی (نماز) پر مقدم کر دے تو جائز ہے کیونکہ اس کو مقدم کرنے کی ممانعت ایک ایسے امر کی بناء پر تھی جو اس کے غیر میں پایا جاتا ہے (یعنی فائتہ نماز میں ذاتی طور پر کوئی کوتاہی نہیں کہ تنگی وقت کی صورت میں اسے مقدم نہ کیا جائے بلکہ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ فائتہ کی قضاء سے وقتی نماز کا وقت نکل جائے گا نہی وارد ہوئی ہے اور نہی لغیرہ کا اصول یہ ہے کہ ایسا کام نہ کیا جائے جس سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر کر لے تو جائز ہوگا۔ مثلاً کسی کا کپڑا چھین لینا منع ہے۔ لیکن اگر چھین کر پہن لے اور نماز ادا کرے تو نماز جائز ہوگی۔ اسی طرح مذکورہ صورت میں بھی نہی لغیرہ ہے) البتہ جب وقت میں

وسعت ہو اور وقتی کو مقدم کرے تو جائز نہیں کیونکہ اس نے حدیث سے ثابت شدہ وقت سے پہلے (نماز) ادا کی (اور وقت سے پہلے نماز جائز نہیں ہوتی ۔ مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہے کہ پہلے فائتہ قضاء کرے اور بعد میں وقتی ادا کرے) ۔

مسئلہ :

اگر کئی نمازیں فوت ہو جائیں تو قضاء میں ترتیب کو ملحوظ رکھے اور جس طرح واجب ہوئی نہیں اسی ترتیب سے قضاء کرے کیونکہ غزوۂ خندق کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مصروفیت کی بناء پر چار نمازیں (وقت پر) ادا نہیں فرما سکے تھے پھر آپ نے انہیں ترتیب وار قضاء کیا تھا ۔ پھر فرمایا کہ ''تم نے جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ایسے ہی تم بھی پڑھا کرو'' ہاں اگر فائتہ نمازیں چھ سے زائد ہو جائیں تو کثرت فوائت کی وجہ سے ان میں ترتیب اسی طرح ساقط ہو جاتی ہے جس طرح کہ ان کے اور وقتی نمازوں کے درمیان ساقط ہو جاتی ہے ۔

کثرت کی حد یہ ہے کہ چھٹی نماز کا وقت نکل جانے سے فائتہ نمازوں کی تعداد چھ ہو جائے ۔ الجامع الصغیر میں مذکور مسئلے سے بھی یہی مراد ہے ۔ یعنی اگر دن رات سے زیادہ نمازیں فوت ہو جائیں تو جس نماز کی بھی قضاء شروع کرے جائز ہے کیونکہ دن رات سے زائد ہوں تو تعداد میں چھ ہو جاتی ہیں ۔ امام محمدؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ چھٹی نماز کا وقت شروع ہونے کا اعتبار ہوگا مگر پہلی روایت صحت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ کثرت حد تکرار میں داخل

ہونے سے وجود میں آتی ہے اور یہ پہلی صورت ہی میں ممکن ہے۔

مسئلہ :

اگر قدیم اور جدید فائتہ نمازیں اکھٹی ہو جائیں تو بعض فقہاء کے قول کے مطابق فائتہ نمازوں کے یاد ہونے کے باوجود وقتی نماز کا ادا کرنا جائز ہے کیونکہ فوائت حد کثرت میں داخل ہو چکی ہیں اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وقتی کا تقدم جائز نہیں اور قدیم نمازوں کو معدوم فرض کرتے ہوئے پہلے اس کی قضاء کا حکم دیں گے تا کہ اسے غفلت اور سستی پر تنبیہ ہو۔

مسئلہ :

اگر چند فوائت کی قضاء کرے اور تھوڑی باقی رہ جائیں۔ تو بعض فقہاء کے نزدیک ترتیب لوٹ آئے گی اور یہی ظاہر ہے کیونکہ امام محمدؒ سے مروی ہے اگر کسی شخص کی دن رات کی نمازیں رہ جائیں اور وہ دوسرے دن ہر وقتی کے ساتھ ایک ایک فائتہ بھی ادا کرنے لگے تو فوائت کو (خواہ وقتی سے مؤخر کرے یا مقدم) بہر صورت جائز ہوں گی مگر وقتی نمازوں کو اگر فوائت پر مقدم کرے تو وہ فاسد ہو جائیں گی ، کیونکہ فوائت حد قلت میں داخل ہو گئیں۔ اگر وقتی نمازوں کو فوائت سے مؤخر کرے تب بھی یہی حکم ہے (کہ وقتی نمازیں فاسد ہوں گی) ہاں وقتی عشاء جائز

ہوگی ۔ کیونکہ عشاء کے ادا کرتے وقت اس کا یہ خیال ہے کہ اب میں فوائت کو ادا کرنے سے مبکدوش ہو چکا ہوں (امام محمدؒ کی مذکورہ روایت سے عیاں ہے کہ جب فوائت قلیل ہو جائیں تو ترتیب عود کر آتی ہے) ۔

مسئلہ :

جس شخص نے عصر کی نماز ادا کی اور اسے یہ بھی یاد ہے کہ اس نے ظہر کی نماز نہیں پڑھی تو اس کی عصر کی نماز بھی فاسد ہوگی ۔ ہاں اگر عصر کا آخری وقت ہو (تو قلت وقت کی بناء پر جائز ہوگی) اور یہ ترتیب کا مسئلہ ہے۔

مسئلہ :

مذکورہ صورت میں اگر عصر کی فرضیت کا وصف باطل ہو جائے تو شیخینؒ کے نزدیک اصل نماز باطل نہیں ہوگی (بلکہ چار رکعت نفل بن جائیں گے) ۔

امام محمدؒ کے نزدیک اصل نماز ہی باطل ہو جائے گی کیونکہ تحریمہ کا انعقاد فرض کے لیے ہوا تھا لیکن جب فرضیت ہی باطل ہو گئی تو تحریمہ بھی کلیۃً باطل ہوگی ۔

شیخینؒ فرماتے ہیں تحریمہ کا انعقاد دو امور کے پیش نظر ہوتا ہے ۔ اصل صلاۃ اور وصف فرضیت اور وصف کے بطلان سے اصل بطلان لازم نہیں آتا ۔

عصر کا فساد موقوف قسم کا فساد ہوگا حتی کہ اگر اس نے چھ نمازیں پڑھ لیں اور ظہر کا اعادہ نہ کیا تو (چھٹی نماز ادا کرنے پر) تمام جائز ہو جائیں گی کیونکہ نمازوں

کی تعداد جب چھ ہو گئی تو ترتیب ساقط ہو گئی اور تمام جائز ہو گئیں) یہ امام اعظمؒ کا مسلک ہے ۔ صاحبینؒ کے نزدیک پورے طور پر فاسد ہوں گی اور کسی حالت میں بھی جائز نہ ہوں گی (خواہ تعداد چھ سے بھی تجاوز کر جائے) اس مسئلہ کی مکمل تفصیل مبسوط کے باب الصلاۃ میں موجود ہے ۔

مسئلہ :

جس شخص نے فجر کی نماز پڑھی اور اسے یاد ہے کہ اس نے وتر نہیں پڑھے تو امام اعظمؒ کے نزدیک صبح کی نماز فاسد ہوگی اور صاحبینؒ جواز کے قائل ہیں ۔ اس اختلاف کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک وتر واجب ہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک سنت ہیں ۔

فرائض اور سنن میں (فرائض والی) ترتیب نہیں ۔ اسی اصول کی بناء پر اگر کسی شخص نے عشاء کے فرض ادا کر کے وضو کیا، پھر سنتیں اور وتر ادا کئے، پھر یاد آیا کہ اس نے عشاء کے فرائض بے وضو پڑھے ہیں ۔ تو امام اعظمؒ کے نزدیک صرف فرض اور سنتیں دوبارہ ادا کرے وتروں کا اعادہ نہ کرے ، کیونکہ ان کے نزدیک وتر علیحدہ (طور پر) فرض ہیں ۔ صاحبینؒ کے نزدیک وتروں کا بھی اعادہ کرے ، کیونکہ وتر عشاء کے تابع ہوتے ہیں ۔ واللہ اعلم !

بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ

سجدۂ سہو کا بیان

مسئلہ :

نماز میں زیادتی یا نقصان کی صورت میں سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کرے پھر تشہد پڑھے اور سلام پھیرے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سلام سے قبل سجدۂ سہو کرے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے سہو کے لیے سجدہ سلام سے پہلے کیا۔ ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "ہر سہو کے لیے سلام کے بعد دو سجدے ہیں"۔ نیز مسلم میں روایت ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کیے۔ آنحضرت ﷺ کے فعل کی دونوں روایتوں میں تعارض آ گیا لہذا آپ کے ارشاد کے ساتھ تمسک باقی رہا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ سجود سہو میں تکرار نہیں ہوتا، اس لیے یہ سلام کے بعد ہونے چاہییں، حتی کہ اگر سلام پھیرنا بھول جائے تو بھی سجود سہو سے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان یہ اختلاف اولویت میں ہے، اور صحیح یہ ہے کہ دونوں طرف سلام

پھیرے تاکہ مذکورہ سلام مشروع و معہود طریق پر ادا ہو ۔ سجدۂ سہو کے بعد قعدہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور دعا مانگے ، یہی صحیح ہے ، کیونکہ مقامِ دعا نماز کے آخر میں ہے ۔ [صاحب ہدایہ کے مذکورہ قول پر ''کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے ساتھ صحیح طور پر تمسّک باقی رہا'' علماء نے اعتراض کیا ہے ، ان کا کہنا ہے کہ مشکاۃ المصابیح کے کتاب الصلاۃ باب سجود السہو میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد مروی ہے ، کہ سلام سے پہلے سجدہ کرے تو فعل کی طرح قول میں بھی تعارض موجود ہے اور یہ بھی کہ علم اصول کے مسلمہ قانون کی رو سے اگر دو چیزوں میں تعارض ہو تو ان کے مابعد کو دیکھا جائے گا ، مثلاً اگر دو آیتوں میں تعارض ہو تو حدیث کی طرف رجوع کیا جائے گا ، اور اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو قیاس کا سہارا لیا جائے گا ، لیکن صاحب ہدایہ نے اس اصول کو اختیار نہیں کیا] سجود سہو میں ائمۃ کا مسلک حسب ذیل ہے ۔ امام اعظمؒ کے نزدیک زیادت و نقصان کی صورت میں سلام کے بعد دو سجدے کرے ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں قبل از سلام ۔ امام مالکؒ کے نزدیک فی القافِ قافْ و فِی الدَّالِ دالْ ۔ یعنی بصورت نقصان قبل از سلام اور بصورت زیادت بعد از سلام ۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ قبلیّت و بعدیّت جس طرح آنحضرت ﷺ سے مروی ہے اسی طرح کیا جائے اور جہاں کوئی روایت نہ مل سکے

تو زیادت و نقصان دونوں صورتوں میں سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرے) ۔

مسئلہ :

امام قدوری فرماتے ہیں کہ اگر نماز میں کسی ایسے فعل کا اضافہ کرے جو جنس نماز سے تو ہو مگر نماز میں اس طرح مشروع نہ ہو (جیسے ایک کے بجائے دو رکوع کر دے) تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہوگا ۔ صاحب قدوری کے ''یلزمہ'' کہنے سے پتا چلتا ہے کہ سجدۂ سہو واجب ہے ۔ یہی صحیح ہے ، کیونکہ سجدۂ سہو عبادت میں پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی کرتا ہے ، اس لیے واجب ہوگا ۔ جیسا کہ حج میں قربانی دینا ۔ (حج کے افعال میں اگر نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی واجب ہے جو دم یعنی خون سے ہوتی ہے ، تو جس طرح تلافی کے لیے دم واجب ہے ، اسی طرح سجدۂ سہو بھی واجب ہوگا) اور یہ سجدۂ سہو جب واجب ہے تو نماز میں یہ اسی وقت واجب ہوگا جب کوئی واجب امر ترک کرے یا واجب کے ادا کرنے میں تأخیر کرے ۔ یا بھول کر کسی رکن میں تأخیر کرے ، یہی بات قانون کی حیثیت رکھتی ہے ۔ زیادت کی صورت میں سجدۂ سہو اس لیے واجب ہوتا ہے کہ اضافے سے کسی رکن کی تأخیر لازم آتی ہے یا کوئی واجب متروک ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ :

امام قدوری فرماتے ہیں کہ فعلِ مسنون کے ترک

کرنے پر بھی اس پر سجدہ لازم ہوگا ۔ فعل مسنون سے مراد فعل واجب ہے ۔ اس کو سنت کے نام سے اس لیے موسوم کیا کہ سجدۂ سہو کا واجب ہونا سنت سے ثابت ہے ۔ یا فاتحہ چھوڑ دے کیونکہ فاتحہ واجب ہے ۔ اسی طرح قنوت ، تشہّد اور تکبیرات عیدین کے ترک کرنے پر بھی سجدۂ سہو واجب ہوگا ، کیونکہ یہ واجب امور ہیں ۔ ان امور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواظبت فرمائی ہے اور انہیں ایک بار بھی ترک نہیں کیا یہ (مواظبت اور عدم ترک) وجوب کی علامات ہیں ۔ امام قدوریؒ کے بیان کردہ لفظِ تشہّد میں حسب ذیل احتمال ہیں ۔

قعدۂ اولیٰ ، قعدۂ ثانیہ اور ان دونوں میں پڑھنا یہ تمام امور واجب ہیں ، ان کے ترک کرنے پر سجدۂ سہو واجب ہوگا ، یہی صحیح ہے ۔ (صاحب ہدایہ ان سب امور کو واجب قرار دیتے ہیں حالانکہ قعدۂ اولیٰ واجب ہے مگر اس میں پڑھنا مسنون ہے ، اور قعدۂ ثانیہ فرض ہے اور قراءۃ واجب ہے ۔ شارحین نے اس اعتراض کے کافی و شافی جواب دے ہیں) ۔

مسئلہ :

جہری نمازوں میں اگر امام پست آواز سے قراءۃ کرے یا سِرّی نمازوں میں بلند آواز سے پڑھے تو سہو کے دو سجدے لازم ہوں گے کیونکہ جہر اپنی جگہ واجب ہے اور مخافت اپنی جگہ ۔ مقدار (أیْ مقدار مَا يَتَعَلَّقُ به السهو) کے

بارے میں روایات مختلف ہیں ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں قَدَرَ مَا تَجُوزُ بِهِ الصَّلَاة کا اعتبار ہوگا ۔ (یعنی اگر ایک طویل یا تین مختصر آیات سِرّی نماز میں بلند آواز سے پڑھے یا جہری نماز میں چپکے سے پڑھے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا) کیونکہ قلیل جہر یا اخفاء سے احتراز کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن کثیر سے پرہیز کیا جا سکتا ہے اور جس مقدار سے نماز صحیح ہو جاتی ہے وہ کثیر میں داخل ہے لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک (مَا تَجُوزُ بِهِ الصَّلٰوة) ایک آیت ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک تین ۔ مذکورہ قانون امام کے بارے میں ہے مقتدی کے لیے نہیں کیونکہ جہر و اخفاء جماعت سے متعلق ہیں ۔

مسئلہ :

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ امام کے سہو سے مقتدی کو بھی سجدہ کرنا ہوگا کیونکہ جب سجدے کو واجب کرنے والا فعل حقِّ اصل (یعنی امام) میں ثابت ہو گیا تو حق فرع (یعنی مقتدی) میں بھی ثابت ہوگا ۔ اسی اصول کی بناء پر امام کی نیت اقامت سے مقتدی کی نماز پر بھی مقیم کا حکم جاری ہوگا (یعنی دو شخص مسافر ہوں ۔ ایک نماز میں امامت کے فرائض سر انجام دے اور نماز پڑھانے سے پہلے اقامت کی نیت کر لے تو مقتدی کو خواہ وہ نیت اقامت کرے یا نہ کرے پوری نماز ادا کرنا ہوگی کیونکہ اس کا دار و مدار امام پر ہے) ۔

مسئلہ :

اگر امام سجدہ نہ کرے تو مقتدی بھی نہ کرے ورنہ امام کی مخالفت لازم آئے گی کیونکہ اس نے امام کی متابعت کا التزام کرکے اقتداء کی تھی -

مسئلہ :

مقتدی اگر نماز میں بھول جائے تو نہ تو امام پر سجدۂ سہو لازم آئے گا نہ مقتدی پر کیونکہ اگر وہ اکیلا سجدہ کرے تو اپنے امام کا مخالف ہوگا اور اگر امام اس کی متابعت کرے تو اصل کو فرع اور تابع کی حیثیت حاصل ہوگی (اور یہ امامت کے خلاف ہے) -

مسئلہ :

اگر کوئی شخص قعدۂ اولیٰ بھول گیا لیکن حالت قعود کے عین قریب تر تھا کہ اسے یاد آ گیا تو لوٹ آئے اور بیٹھ کر تشہّد پڑھے کیونکہ جو کسی چیز کے قریب ہو وہ اسی کے حکم میں داخل ہوتا ہے (جس طرح فناءِ مصر، مصر کے حکم میں ہوتا ہے اسی طرح جب کوئی حالت قعود کے قریب ہو تو یہ حکماً قعود ہی متصور ہوگا) بعض فقہاء کا قول ہے کہ تأخیر (واجب) کی بناء پر وہ سجدۂ سہو کرے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ سجدہ نہ کرے گویا کہ وہ کھڑا ہی نہیں ہوا -

اگر قیام کے زیادہ قریب ہو تو واپس نہ لوٹے کیونکہ

اب وہ کھڑے ہونے والے ہی کی طرح ہے ، وہ سجدۂ سہو کرے کیونکہ اس نے ترک واجب کا ارتکاب کیا ہے۔

مسئلہ :

اگر قعدۂ اخیرہ بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو قعدہ کی طرف لوٹ آئے بشرطیکہ پانچویں رکعت کو مقید بالسجدہ نہ کیا ہو کیونکہ قعدہ کی طرف رجوع کرنے میں اس کی (ادا کی ہوئی) نماز کی اصلاح ہے اور قعدہ کی طرف رجوع کرنا ممکن بھی ہے ، کیونکہ جو نماز رکعت سے کم ہو اسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ پانچویں رکعت لغو جائے گی کیونکہ اس نے ایسے امر (یعنی قعود) کی طرف رجوع کیا جس کا محل پانچویں رکعت سے پہلے تھا۔ لہٰذا پانچویں رکعت خود بخود چھوٹ جائے گی اور سجدۂ سہو کرے کیونکہ اس نے واجب امر میں تأخیر سے کام لیا ہے۔

اگر پانچویں رکعت کو سجدے سے مقید کرے تو ہمارے نزدیک فرض باطل ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے۔

ہماری دلیل یہ کہ (پانچویں رکعت کو مقید بالسجدہ کرنے سے) اس نے فرض نماز کے ارکان کو پورا کرنے سے پہلے نفل نماز کے شروع کو مستحکم کیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ فرض سے خارج ہو گیا ہے۔ (فرض کو پورا کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ دینا اس کے بطلان کا موجب ہے)۔ اس (مقید بالسجدہ سے فرض کے باطل نہ ہونے)

کی وجہ یہ ہے کہ ایک رکعت کا سجدہ کر لینے سے وہ درحقیقت نماز بن جاتی ہے حتی کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ (خدا نخواستہ) وہ نماز نہیں پڑھے گا تو ایک رکعت کا سجدہ کر لینے سے حانث ہو جائے گا۔

شیخینؒ کے نزدیک اس کی نماز نفل میں تبدیل ہو جائے گی۔ امام محمدؒ کو اس میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ (یعنی اِنَّ بُطْلَانَ الْوَصْفِ لَا یُوجِبُ بُطْلَانَ الْأَصْلِ عِنْدَهُمَا خِلَافاً لِمُحَمَّدٍ) پھر وہ پانچویں رکعت کے ساتھ چھٹی رکعت کو ضم کرے (تاکہ چھ رکعت نفل مکمل ہوں کیونکہ کسی نماز کی پانچ رکعتیں نہیں ہوتیں) اگر چھٹی رکعت ساتھ نہ ملائے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ وہ مظنون ہے (یعنی اپنے گمان کے مطابق تو وہ فرضوں کی چوتھی رکعت ادا کر رہا ہے)۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک پیشانی زمین پر رکھتے ہی اس کا فرض باطل ہو جائے گا کیونکہ پیشانی کا زمین پر رکھنا کامل سجدہ ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ سجدہ سے سر اٹھانے پر فرض باطل ہوگا کیونکہ کسی چیز کی تکمیل اس شے کے آخر پر ہوتی ہے اور وہ سجدے سے سر اٹھانا ہے۔

حدث کی حالت میں سجدہ درست نہیں (کیونکہ انتقال بالطہارۃ شرط ہے) اختلاف کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوگا جب نمازی حالت سجدہ میں بے وضو ہو جائے امام محمدؒ کے نزدیک (وضو کرنے کے بعد اسی سجدے پر نماز کی) بناء

کر سکتا ہے مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نہیں کر سکتا ۔

مسئلہ :

اگر چوتھی رکعت کے بعد قعود کرے اور سلام پھیرے بغیر کھڑا ہو جائے اور اس نے اگر پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو قعدہ کی طرف لوٹ آئے اور سلام پھیرے کیونکہ حالت قیام میں سلام پھیرنا مشروع نہیں اور وہ بیٹھ کر مشروع طریق پر فریضۂ سلام سر انجام دے سکتا ہے کیونکہ جو نماز رکعت سے کم ہو اسے چھوڑا جا سکتا ہے ۔ اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے پر یاد آئے (کہ وہ زائد پڑھ رہا ہے) تو ایک رکعت اور ساتھ ملائے اس کا فرض مکمل ہوگا کیونکہ سلام ادا کرنا رہ گیا تھا اور یہ واجب ہے ۔ لہذا ان کے ساتھ ایک اور رکعت ملائے تاکہ دو رکعتیں نفل ہو جائیں کیونکہ ایک رکعت کافی نہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک رکعت (ادا کرنے) سے منع فرمایا ہے ۔ زائد دو رکعتیں سنت ظہر کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں ۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ان دو رکعتوں پر جدید تحریمہ سے مواظبت فرمائی ہے ۔ استحسان کے طور پر سجدۂ سہو بھی کرے کیونکہ وہ مسنون طریق سے نماز فرض سے فارغ نہیں ہوا اور نہ مسنون طور پر نماز نفل میں مصروف ہؤا ۔

اگر پانچویں رکعت کے بعد کچھ نہ پڑھے (بلکہ بیٹھ کر سلام پھیر دے) تو اس پر کوئی قضاء نہ ہوگی کیونکہ وہ مظنون ہے ۔

اگر آخری دو رکعتوں میں کوئی شخص اس کی اقتداء کرے تو امام محمدؒ کے نزدیک وہ چھہ رکعت پوری کرے کیونکہ وہ (دو رکعت نفل بھی) اس تحریمہ سے ادا کیے گئے ہیں۔

شیخینؒ کا قول ہے کہ صرف دو رکعت پڑھے کیونکہ فرض سے اس کا فارغ ہونا مستحکم اور یقینی ہو چکا ہے۔

اگر مقتدی اس (نفلی نماز) کو فاسد کر دے تو امام محمدؒ کے نزدیک امام پر قیاس کرتے ہوئے اس پر قضاء واجب نہ ہوگی۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دو رکعت کی قضاء کرے کیونکہ عارضے کی بناء پر قضاء کا ساقط ہونا صرف امام کے حق میں مخصوص ہے۔

مسئلہ :

امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے دو رکعتیں بطور نفل پڑھیں اور ان میں وہ بھول گیا اور اس نے سجدۂ سہو کیا۔ پھر اس نے مزید دو رکعت ادا کرنے کا ارادہ کیا تو (پہلی نماز پر) بناء نہیں کر سکتا کیونکہ اس طرح سجدۂ سہو وسط صلاۃ میں واقع ہونے کی وجہ سے باطل ہو جائے گا، بخلاف مسافر کے، کہ اگر وہ سجدۂ سہو کے بعد اقامت کی نیت کر لے تو (سابقہ نماز پر) بناء کر سکتا ہے، کیونکہ اگر وہ بناء نہ کرے تو ساری نماز ضائع ہوتی ہے (اس کے باوجود اگر وہ مزید دو رکعت نفل (پہلی دو رکعتوں کے ساتھ) ادا کرلے تو تحریمہ کے باقی

رہنے کی وجہ سے صحیح ہوں گے ۔ البتہ سجدۂ سہو باطل ہو جائے گا (کہ یہ وسط نماز میں جائز نہیں) اور یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

ایک شخص نے (نماز کے آخر میں) سلام پھیر دیا درآنحالیکہ اس پر سجدۂ سہو واجب تھا ۔ پھر سلام کے بعد ایک آدمی اس کی نماز میں داخل ہوا اگر امام نے سجدۂ سہو کیا تو وہ شخص نماز میں داخل ہوگا ورنہ نہیں ۔ یہ شیخین کا قول ہے ۔ امام محمد فرماتے ہیں امام سجدہ کرے یا نہ کرے وہ شخص نماز میں داخل شمار ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک جس شخص پر سجدۂ سہو واجب ہو سلام اس کو نماز سے بالکل نہیں نکالتا ۔ کیونکہ سجدۂ سہو نقصان کی تلافی کے لیے واجب ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ (سجدہ سہو نہ کرنے تک) تحریمہ صلاۃ میں شمار ہو ۔

شیخین کے نزدیک سلام عَلَی سَبِیلِ التَّوَقُّف احرام صلاۃ سے نکال دیتا ہے ۔ (توقف کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے بعد میں سجدۂ سہو کر لیا تو سلام حالت نماز سے نہیں نکالے گا اور نہیں کیا تو وہ نماز کی حالت سے نکال دے گا) کیونکہ سلام فی نفسہ تو محلل صلاۃ ہے (یعنی سلام سے حالت نماز ختم ہو جاتی ہے) (سوال ۔ اگر سلام محلل فی نفسہ ہے تو آپ کا علی سبیل التوقف کہنا کیونکر درست ہے ۔ بلکہ وہ سجدہ کرے یا نہ کرے سلام حلت کا عمل کرے گا ۔ صاحب ہدایہ جواب میں فرماتے ہیں کہ) سلام حلت والا عمل نہیں

کرے گا کیونکہ اس کے ذمے ابھی سجدۂ سہو باقی ہے اس لیے حاجت پوری ہوئے بغیر عمل حلت ظہور پذیر نہ ہوگا۔ (یعنی اگر وہ سہو کے دو سجدے کر لے تو سلام پورے طور پر محلل ہو جائے گا)' لیکن اگر اس نے سجدۂ سہو کی طرف عود نہ کیا تو اب حاجت بھی نہ رہی، (یعنی اگر بعد میں سجدۂ سہو کرے تو اس کی ضرورت نہیں کیونکہ سلام اس حلت والا عمل کرے گا اور اسے نماز سے خارج کر دے گا)۔ یہ اختلاف ایک تو متن والی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک قہقہہ سے طہارت کے ضائع ہو جانے کی صورت میں (یعنی جس شخص پر سجدۂ سہو واجب ہو اگر وہ سلام پھیر کر ہنسنے لگے تو امام محمدؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہے گا۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ ابھی تک نماز میں ہے مگر شیخینؒ کے نزدیک طہارت سجدے پر موقوف ہے اگر سجدہ کرے گا تو طہارت باطل ہو جائے گی نہ کریگا تو باقی رہے گی) اسی طرح اس حالت میں اقامت کی نیت سے فرضوں میں تغیر ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ (امام محمدؒ کے نزدیک چار پوری کرے اور شیخینؒ کے نزدیک موقوف ہے)۔

مسئلہ :

اگر کسی نے قطعِ صلاۃ کے ارادہ سے سلام پھیرا درآنحالیکہ اس پر سجدۂ سہو بھی واجب تھا تو وہ سجدۂ سہو کرے، کیونکہ (سجدۂ سہو کے ہوتے ہوئے) یہ سلام قاطع صلاۃ نہیں۔ (اگر سوال کیا جائے کہ نمازی تو قطع صلاۃ کی نیت بھی کر چکا ہے، لہذا نیت کی بناء پر سلام قاطع ہے۔ اس

کے جواب میں کہا گیا ہے کہ) اس کی نیت چونکہ ایک مشروع فعل کو بدلنے کی ہے اس لیے لغو ہے۔ (مشروع فعل یہی ہے کہ سجدۂ سہو ادا کر کے نماز قطع کرے) ۔

مسئلہ :

جسے اپنی نماز میں شک ہو اور معلوم نہ ہو کہ تین پڑھی ہیں یا چار، اور شک کا یہ عارضہ اسے پہلی مرتبہ پیش آیا تو نماز کو نئے سرے سے شروع کرے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کسی کو اگر نماز میں شک پڑ جائے کہ اس نے کتنی پڑھی ہے تو اسے پھر سے نماز پڑھنی چاہیے ۔

اگر اسے شک کا عارضہ بہت زیادہ پیش آتا ہو تو اپنی غالب رائے پر بناء کرے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ''جسے نماز میں شک لاحق ہو وہ صحیح امر معلوم کرنے کی کوشش کرے'' ۔

اگر اس کی رائے کسی جانب راجح نہ ہو تو یقینی صورت پر بناء کرے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ''جسے اپنی نماز میں شک لاحق ہو اور اسے پتا نہ ہو کہ اس نے تین پڑھی ہیں یا چار، تو اقل صورت پر بناء کرے'' ۔ (اگر شک پہلی بار لاحق ہو اور از سر نو نماز پڑھنا چاہے تو) سلام پھیر کر دوبارہ شروع کرے ، سلام پھیر کر نئی نماز شروع کرنا اولی ہے، کیونکہ سلام محلل ہے، کلام محلل نہیں۔ اور محض نیت بھی کافی نہیں ۔ جب اقل صورت پر بناء کرے تو ہر اس رکعت کے بعد قعدہ کرے جو اس کے گمان میں

آخری ہے ، تاکہ قعدہ کے فرض کا تارک نہ ہو ۔ (مثلاً ایک شخص نے تین رکعتیں ادا کیں جب چوتھی میں کھڑا ہوا تو اسے شک ہوگیا کہ شاید یہ تیسری ہے ۔ اس رکعت کے آخر میں بھی قعدہ کرے کیونکہ درحقیقت یہ چوتھی ہے ورنہ فرض ترک ہو جائے گا) واللہ أعلم !

باب صلاۃ المریض

مریض کی نماز کا بیان

مسئلہ :

مریض جب قیام سے عاجز ہو تو بیٹھ کر رکوع سجود سے نماز پڑھے۔ اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے عمران بن حصین سے فرمایا کہ ”کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھنے پر بھی قدرت نہ ہو تو پہلو کے بل (لیٹ کر) (اور رکوع و سجود) اشارے سے کر لیا کرو“۔ نیز طاعت طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔

مسئلہ :

امام قدوری فرماتے ہیں کہ اگر بیٹھ کر (بھی) رکوع وسجود نہ کر سکے تو اشارے سے کام لے کیونکہ (اشارے سے رکوع و سجود کرنا ہی) اس مریض کی وسعت میں ہے۔

اپنے سجود رکوع سے زیادہ پست کرے (یعنی سجدے کا اشارہ رکوع کی نسبت سر کو زیادہ جھکا کر کرے) کیونکہ اشارہ (رکوع و سجود دونوں کا قائم مقام ہے اس لیے اسی پر ان دونوں کا حکم جاری ہوگا جس طرح سجدہ رکوع

سے پست تر ہوتا ہے سجدے کا اشارہ بھی رکوع کے اشارے
سے پست تر ہوگا) ۔

مسئلہ :

ایسی کوئی چیز مریض کے منہ کی طرف نہ اٹھائی
جائے کہ جس پر وہ سجدہ کرے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
''اگر تم زمین پر سجدہ کرنے کی قدرت رکھتے ہو تو سجدہ
کرو ۔ ورنہ اپنے سر سے اشارہ کر لیا کرو'' ۔ اگر کوئی
چیز مریض کے چہرے کی طرف اونچی کی جائے اور وہ اپنا
سر جھکا لے تو جائز ہے ، کیونکہ اشارہ پایا گیا ۔ اگر اس
چیز کو اس کے ماتھے پر رکھ دیا جائے تو سجدہ ادا نہ
ہوگا کیونکہ اشارہ معدوم ہے ۔

مسئلہ :

اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو پیٹھ کے بل لیٹ جائے
اور اپنی ٹانگیں قبلہ رخ کر کے اشارے سے رکوع و سجود
کرے ۔ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے ''مریض کھڑا ہو کر نماز
پڑھے ۔ اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر ۔ اگر
بیٹھنے کی طاقت بھی نہ ہو تو پیٹھ کے بل لیٹ کر اشارے
سے کام لے ۔ اگر اشارے کی استطاعت بھی نہ رہے ۔ تو اللہ
تعالیٰ ہی عذر قبول فرمانے والا ہے'' ۔

مسئلہ :

اگر قبلہ رو ہو کر پہلو کے بل لیٹ جائے تو بھی جائز

ہے ۔ اس کی دلیل حضرت عمران بن حصین ؓ والی روایت ہے مگر دوسری صورت (یعنی پیٹھ کے بل لیٹنا) ہمارے نزدیک اولی ھے ۔ بخلاف امام شافعی ؒ کے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ پیٹھ کے بل لیٹنے والے کا اشارہ فضائے کعبہ کی طرف واقع ہوتا ہے اور پہلو کے بل لیٹنے والے کا اشارہ اس کے قدموں کی طرف ۔ البتہ اس سے نماز تو ادا ہو جاتی ہے ۔ (مگر پہلی صورت اولی ہے) ۔

مسئلہ :

اگر سر سے بھی اشارہ کرنے کی طاقت نہ رہے تو نماز ملتوی ہو جائے گی ۔ آنکھوں ، دل یا ابروؤں سے اشارہ کرنا قابل اعتبار نہیں ۔ امام زفر ؒ (مالک ؒ ۔ شافعی ؒ اور احمد) کو اس سے اختلاف ہے ۔

ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو ہم پہلے روایت کر چکے ہیں (کہ اگر زمین پر سجدہ نہ کر سکو تو سر سے اشارہ کر لیا کرو الخ) نیز امور شرعیہ میں اپنی رائے سے بدل مقرر کرنا جائز نہیں (یعنی سر سے اشارے کا رکوع وسجود عھ بدل ہونا تو شرع سے ثابت ہے مگر آنکھوں ، دل یا ابرو سے اشارہ کرنا شرع سے ثابت نہیں ۔ لہذا یہ بدل نہ بن سکیں گے) اور ان اعضاء کو سر پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا (کہ جس طرح سر سے اشارہ درست ہے ان اعضاء سے بھی درست ہو) کیونکہ سر سے رکن نماز (یعنی سجدہ) ادا کیا جاتا ہے مگر آنکھ ، دل اور ابرو سے نماز کا کوئی رکن ادا

نہیں کیا جاتا ۔ امام قدوریؒ کے الفاظ اُخِّرَتْ عَنْہُ سے پتا چلتا ہے (کہ نماز مؤخر تو ہوگی مگر) اس کے ذمہ سے ساقط نہ ہوگی، خواہ عجز دن رات سے بھی زیادہ ہو، بشرطیکہ اسے بعد بعد میں افاقہ ہو جائے (اگر افاقہ نہ ہو اور وہ اس حالت میں مر جائے تو اس کے ذمہ کوئی نماز نہ ہوگی) یہی صحیح ہے کیونکہ وہ مضمون خطاب (یعنی اقیموا الصلاۃ) کو سمجھتا ہے (یعنی مریض اگرچہ اشارہ کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا مگر اقیموا الصلاۃ کا مضمون سمجھ سکتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ اب فلاں نماز کا وقت ہے) بخلاف اس شخص کے جس پر غشی طاری ہو (کیونکہ وہ مضمون خطاب کو سمجھنے سے قاصر ہے) ۔

مسئلہ :

اگر مریض قیام پر قادر ہو، لیکن رکوع و سجود نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے قیام ضروری نہیں، بلکہ بیٹھ کر اشارے سے پڑھے، کیونکہ قیام کو سجدے کا وسیلہ اور ذریعہ بننے کے لیے رکن قرار دیا گیا ہے، کہ اس میں حد درجہ کی تعظیم ہوتی ہے، پھر جب قیام کے بعد سجدہ ہی ممکن نہ ہو تو وہ رکن نہ ہوگا اور مریض کو اختیار ہوگا ۔ (قیام کی حالت میں اشارے سے کام لے یا بیٹھ کر پڑھے) بیٹھ کر اشاروں سے نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ بیٹھنا کسی نہ کسی حد تک سجدے سے مشابہت رکھتا ہے ۔

مسئلہ :

اگر تندرست شخص نے نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر

پڑھا پھر مرض کا عارضہ پیش آ گیا تو بیٹھ کر رکوع و سجود کر کے نماز پوری کرے، اگر رکوع و سجود پر قادر نہ ہو تو اشارے سے کام لے اور اگر بیٹھ بھی نہ سکے تو پیٹھ کے بل لیٹ کر پڑھے ،کیونکہ مذکورہ تینوں صورتوں میں اس نے اعلیٰ پر ادنیٰ کی بناء کی ہے اس لیے یہ اقتداء کی طرح ہوگی (یعنی جس طرح بیٹھ کر نماز پڑھنے والا کھڑے ہو کر نماز کی اقتداء کرے۔

مسئلہ :

جو شخص کسی مرض کی وجہ سے بیٹھ کر رکوع وسجود کر رہا ہو پھر وہ تندرست ہو جائے۔ تو شیخینؒ کے نزدیک وہ کھڑے ہو کر اپنی نماز پر بناء کرے۔ امام محمدؒ کے نزدیک اقتداء میں ان کے اس اختلاف کی بناء پر جو باب الامامہ میں گزر چکا ہے وہ نماز ازسرِ نو شروع کرے۔
امام محمدؒ کے نزدیک قائم قاعد کی اقتداء نہیں کرسکتا ، لیکن شیخینؒ کے نزدیک جائز ہے)۔

مسئلہ :

اگر نماز کا کچھ حصہ اشارے سے پڑھا ہو پھر رکوع و سجود پر قادر ہو جائے تو ان سب کے نزدیک نماز کو پھر سے شروع کرے کیونکہ جس طرح رکوع پر قادر شخص اشارہ کرنے والے کی اقتداء نہیں کر سکتا ، اسی طرح اشارے والی نماز پر رکوع والی نماز کی بناء بھی نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ :

اگر کوئی شخص کھڑا ہو کر نفل شروع کرے پھر وہ تھک جائے تو اس کے لاٹھی یا دیوار سے ٹیک لگانے یا بیٹھ جانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ عذر ہے ۔ عذر کے بغیر ٹیک لگانا مکروہ ہے کیونکہ عبادت میں ایسا کرنا سوءِ ادب ہے ۔ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ، کیونکہ ان کے نزدیک بلا عذر بیٹھنا بھی جائز ہے تو ٹیک لگانا بھی مکروہ نہ ہوگا ۔ صاحبینؒ کے نزدیک اتّکاء مکروہ ہے ، کیونکہ ان کے نزدیک بلاعذر قعود جائز نہیں ، اس لیے اتّکاء بھی مکروہ ہے ۔ اگر کسی عذر کے بغیر ہی بیٹھ جائے تو متفقہ طور پر مکروہ ہے ، لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک نماز جائز ہوگی اور صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگی ۔ باب النوافل میں اس پر بحث ہو چکی ہے ۔

مسئلہ :

اگر جہاز میں کسی علت کے بغیر ہی بیٹھ کر نماز پڑھے تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے ، البتہ قیام افضل ہے ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ عذر کے بغیر جائز نہیں کیونکہ کھڑے ہونے پر قادر ہو تو کسی علت کے بغیر اسے ترک نہ کرے ۔ امام اعظمؒ فرماتے ہیں جہاز میں عام طور پر سر چکرانے لگتا ہے اس لیے اسے (یعنی دوران رأس کو) حقیقۃً موجود تسلیم کیا جائے گا ، البتہ قیام افضل ضرور ہے ، کیونکہ وہ شبہ خلاف سے بعید ہے اور اختلاف سے جہاں تک ممکن ہو دور

رہنا ہی مناسب ہے ، کہ یہ سکون قلب کا ذریعہ ہے ۔

اختلاف کی مذکورہ صورت غیر مربوط جہاز کے بارے میں ہے اور مربوط (یعنی لنگر سے بندھا ہوا) جہاز کنارے کے حکم میں ہے ۔ یہی صحیح ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص پانچ یا اس سے کم نمازوں کے دوران بیہوش رہے اس پر قضاء لازم ہے ۔ اگر پانچ نمازوں سے زیادہ وقت بے ہوش رہے تو قضاء نہ ہوگی ۔ یہ استحسان ہے ورنہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب ایک نماز کے مکمل وقت میں ہوش میں نہ آئے تو اس پر قضاء واجب نہ ہو کیونکہ عجز (عن فہم مضمون الخطاب) متحقق ہے ۔ لہذا یہ جنون کا مشابہ ہوگا ۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ جب مدت زیادہ ہو جائے تو فوائت کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور ان کا (بصورت قضاء) ادا کرنا حرج اور تکلیف کا موجب ہے ، اور جب بے ہوشی کی مدت کم ہو تو کوئی حرج نہیں ، اور کثیر یہ ہے کہ نمازیں دن رات سے زائد ہو جائیں ، کیونکہ وہ حدتکرار میں داخل ہو جاتی ہیں ۔ دیوانگی بھی بےہوشی کی طرح ہے ۔ ابو سلیمانؒ نے اسی طرح بیان کیا ہے ۔ بخلاف نیند کے کہ اس کا اتنا طویل ہونا (کہ دن رات سے تجاوز کر جائے) نادر ہے اس لیے طویل نیند کا حکم بھی مختصر نیند جیسا ہوگا ۔ (اگر نیند کی وجہ سے پانچ سے زائد نمازیں بھی رہ جائیں تو قضاء واجب ہوگی) ۔

امام محمدؒ کے نزدیک کثرت کا اعتبار اوقات کے لحاظ سے ہوگا، اور شیخینؒ کے نزدیک گھنٹوں کے حساب سے، (یعنی دن رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور جنون یا اغماء اگر چوبیس گھنٹوں سے بڑھ جائے تو کثرت شمار کی جائے) حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ (ایک شخص پر اگر زوال سے قبل بے ہوشی طاری ہو اور دوسرے دن زوال کے بعد وہ ہوش میں آئے تو شیخینؒ کے نزدیک قضاء واجب نہ ہوگی، کیونکہ بے ہوشی دن رات مستوعب ہے، اس لیے کثرت متحقق ہوگئی۔ اگر ظہر کا وقت نکلنے سے پہلے اسے افاقہ ہو جائے، تو امام محمدؒ کے نزدیک قضاء واجب ہوگی) وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

بَابٌ فِي سَجْدَةِ التِّلَاوَةِ

سجدۂ تلاوۃ کا بیان

مسئلہ :

امام قدوری فرماتے ہیں قرآن کریم میں سجدۂ تلاوۃ چودہ ہیں۔ (۱) سورۂ اعراف کے آخر میں۔ (۲) رعد میں۔ (۳) نحل میں۔ (۴) بنی اسرائیل۔ (۵) مریم۔ (۶) سورۂ حج میں پہلا۔ (۷) فرقان۔ (۸) نمل۔ (۹) الٓم تنزیل۔ (۱۰) ص۔ (۱۱) حم السجدۃ۔ (۱۲) نجم۔ (۱۳) إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (۱۴) اِقْرَأْ میں۔ مصحفِ عثمان میں ایسا ہی لکھا ہے اور یہی قابل اعتماد ہے۔ حج کا دوسرا سجدہ ہمارے نزدیک صلاتی سجدہ ہے۔ حٰم السجدہ میں مقام سجدہ لَا يَسْأَمُونَ کے بعد ہے۔ یہی حضرت عمرؓ کا ارشاد بھی ہے اور یہی احتیاط کے زیادہ قریب ہے۔ (بعض اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ پر سجدہ کے قائل ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر لَا يَسْأَمُونَ پر پہنچ کر سجدہ کرے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس صورت میں ایک آیت زیادہ پڑھ کر سجدہ کرے گا۔ لیکن اگر حقیقۃً سجدہ

ہی لَا یَسْأَمُون پر ہو تو اِیَّاہُ تَعْبُدُون پر سجدہ ادا نہ ہوگا اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ لَا یَسْأَمُون پر سجدہ کیا جائے ۔

مسئلہ :

مذکورہ مقامات میں پڑھنے اور سننے والے دونوں پر سجدۂ تلاوۃ واجب ہوگا خواہ سامع قرآن کریم کے سماع کا قصد کرے یا نہ کرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''سجدۂ تلاوۃ ہر اس شخص پر واجب ہے جو سنے اور جو تلاوۃ کرے'' حدیث میں لفظ ''علی'' سے وجوب کا پتا چلتا ہے نیز حدیث میں قصد سماع کی کوئی قید بھی نہیں ۔

مسئلہ :

جب امام آیت سجدہ پڑھے تو سجدہ کرے اور اس کے ساتھ مقتدی بھی سجدہ کرے کیونکہ مقتدی نے امام کی متابعت اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے ۔

مسئلہ :

اگر مقتدی آیت سجدہ پڑھے تو نہ امام سجدہ کرے نہ مقتدی ، نہ نماز میں سجدہ کریں نہ فارغ ہونے کے بعد ، یہ شیخینؒ کے نزدیک ہے ۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں نماز سے فارغ ہونے کے بعد سجدہ کریں ، کیونکہ سجدے کا سبب (مقتدی

کا آیت سجدہ پڑھنا) متحقق ہو چکا ہے اور اب (نماز سے فارغ ہونے کے بعد) کوئی چیز مانع بھی نہیں ۔ بخلاف حالت نماز کے ، کیونکہ بحالت نماز سجدہ کرنے سے وضع امامت یا وضع تلاوت کا خلاف لازم آتا ہے ۔ (سجدۂ تلاوۃ کا اصول یہ ہے کہ پہلے تالی (یعنی پڑھنے والا شخص سجدہ) کرے ۔ پھر سامعین تو مذکورہ صورت میں اگر پہلے مقتدی (سجدہ) کرے جس نے آیت سجدہ پڑھی ہے اور بعد میں امام ، تو یہ موضوع امامت کے خلاف ہے ، کیونکہ اس صورت میں امام کی حیثیت تابع کی ہو جاتی ہے اور اگر امام پہلے (سجدہ) کرے اور ساتھ ساتھ مقتدی بھی تو یہ موضوع تلاوۃ کے خلاف ہے (کیونکہ تالی کا حق پہلے تھا) ۔

شیخینؒ فرماتے ہیں چونکہ امام کا تصرُّف مقتدی پر نافذ ہوتا ہے اس لیے مقتدی قراءۃ کا مجاز نہیں ہوتا ، اور محجور آدمی کے تصرف پر کوئی حکم مترتب نہیں ہوتا (جیسا کہ اگر نابالغ بچہ کسی چیز کی بیع کر دے تو بیع نافذ نہیں ہوتی ۔ اسی طرح مقتدی قراءۃ سے محجور ہے اور اس کے قراءۃ کرنے پر بھی کوئی حکم مترتب نہ ہوگا) ۔ (سوال ۔ جس طرح مقتدی ممنوع عن القراءۃ ہے اسی طرح حائض اور جنب بھی ممنوع عن القراءۃ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مقتدی پر تو (سجدہ) واجب نہیں ہوتا ، مگر جنب وغیرہ پر واجب ہو جاتا ہے؟ صاحب ہدایہ جواب میں فرماتے ہیں ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی محجور ہے مگر جنب وحائض محجور نہیں بلکہ منہیان عن القراءۃ ہیں ۔ منہی عنہ کام کا کرنا اگرچہ جائز نہیں ، لیکن

اگر کر لیا جائے تو ثمرہ مترتب ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی سے کپڑا چھین لینا ممنوع ہے، لیکن اگر کسی شخص نے کپڑا چھین کر اس میں نماز ادا کی تو نماز ہو جائے گی۔ اسی طرح جنبی شخص کے لیے تلاوت جائز نہیں لیکن اگر وہ تلاوت کرے اور آیت سجدہ پڑھے تو نہا دھو کر سجدہ کرنا واجب ہوگا۔ حائض کی صورت اس سے الگ ہے اس پر نہ اپنی تلاوت سے واجب ہوتا ہے اور نہ سماع سے کیونکہ اس میں اہلیت نماز ہی مفقود ہے)۔

بخلاف جنب اور حائض کے کیونکہ وہ منہیان عن القراءۃ ہیں، البتہ حائض پر نہ تلاوۃ سے اور نہ سماع ہی سے واجب ہوگا کیونکہ وہ اہلیت نماز سے محروم ہے، بخلاف جنب کے۔

مسئلہ :

اگر مقتدی کی قراءۃ وہ شخص سنے جو نماز سے خارج ہے تو وہ سجدہ کرے، یہی صحیح ہے، کیونکہ ممانعت تو صرف امام اور مقتدیوں کے لیے ہے ان کے علاوہ (ممانعت) کسی کی طرف متجاوز نہ ہوگی (لہذا نماز سے باہر سامع سجدہ کرے)۔

مسئلہ :

اگر امام اور مقتدی کسی ایسے شخص سے آیت سجدہ سنیں جو نماز میں ان کے شریک نہیں تو نماز میں سجدہ نہ کریں کیونکہ یہ سجدۂ صلاتیہ نہیں ہے اور ان کا اس سجدے کو سننا افعال صلاۃ میں سے نہیں۔ البتہ نماز سے فارغ ہو کر سجدہ کر لیں، کیونکہ سبب متحقق ہے۔

اگر وہ نماز میں ادا کریں تو جائز نہیں ، کیونکہ نماز میں ایسا سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے ، لہذا نہی کی بناء پر اس کا ادا کرنا ناقص ہوگا اور (نماز میں) یہ کامل طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا (اس لیے فراغت کے بعد ادا کیا جائے) ۔

مسئلہ :

مصنفؒ فرماتے ہیں (کہ اگر وہ نماز میں سجدہ کریں تو پھر) اس کا اعادہ کریں کیونکہ سبب متحقق ہے ، نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں ، کیونکہ محض سجدہ احرام صلاۃ کے منافی نہیں ۔ نوادر میں مذکور ہے کہ نماز فاسد ہوگی ، کیونکہ انہوں نے نماز میں ایسے امر کا اضافہ کیا جو نماز میں شامل نہیں ۔ بعض نے کہا یہ امام محمدؒ کا قول ہے ۔

مسئلہ :

اگر امام آیت سجدہ پڑھے اور اسے ایسا شخص سنے جو ابھی نماز میں اس کے ساتھ شامل نہیں ہوا بلکہ امام کے سجدہ کرنے کے بعد شریک ہؤا تو اس پر سجدہ کرنا واجب نہیں کیونکہ رکعت پا لینے کی بناء پر وہ سجدے کا پانے والا بھی شمار ہوگا ۔ اگر وہ شخص امام کے سجدہ کرنے سے پہلے نماز میں شریک ہو جائے تو امام کے ساتھ ہی سجدہ کرے کیونکہ اگر اس نے آیت سجدہ نہ بھی سنی ہوتی تو بھی امام کی متابعت میں سجدہ کرتا ۔ مگر سماع کی صورت میں تو امام کا ساتھ دینا بدرجۂ اولی ضروری ہے ۔

اگر امام کے ساتھ نماز میں شامل نہ ہو تو بھی سجدہ کرے کیونکہ سبب متحقق ہے ۔

مسئلہ :

ہر وہ سجدہ جو نماز میں واجب ہے مگر اسے نماز میں ادا نہ کرے تو نماز کے بعد قضاء نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ سجدۂ صلاتیہ ہے اور اسے نماز میں ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ لہذا یہ ناقص طور پر (یعنی نماز کے بعد) ادا نہ ہوگا۔

مسئلہ :

ایک شخص نے آیت سجدہ کی، تلاوت کی لیکن سجدہ نہ کیا۔ حتی کہ نماز میں مصروف ہوگیا، پھر اس نے اسی آیت سجدہ کا اعادہ کر کے سجدہ کیا تو یہ سجدہ دونوں بار کی تلاوت کے لیے کافی ہے، کیونکہ دوسرا سجدہ صلاتی ہے اور وہ پہلے سے قوی تر ہے، اس لیے وہ پہلے کو بھی اپنا تابع بنا لے گا۔ (اس طرح پہلا بھی دوسرے کے ضمن میں ادا ہو جائے گا)۔

نوادر میں مذکور ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر ایک سجدہ اور کرے کیونکہ پہلے سجدے کو تقدم کی فضیلت حاصل ہے تو وہ دونوں قوت وفضیلت میں برابر ہیں (اس لیے پہلا دوسرے کے ضمن میں ادا نہ ہوگا)۔

ہم کہتے ہیں کہ دوسرے سجدے کو اتصالِ مقصود کی وجہ سے مزید فضیلت حاصل ہے (کیونکہ آیت سجدہ پڑھتے ہی سجدہ کرلیا گیا۔ مگر پہلے سجدے میں یہ خوبی موجود نہیں) اس لیے اس خوبی کی بناء پر دوسرے کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر (نماز سے پہلے) آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا پھر نماز میں داخل ہو کر اسی آیت کا اعادہ کیا تو دوبارہ سجدہ کرے کیونکہ

تابع بنانے کی قوت ثانی سجدہ میں ہے (لہذا اسے پہلے کا تابع نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ وہ اس سے درجے میں کمتر ہے)۔ نیز ہم ثانی کو پہلے کے ساتھ لاحق بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ اس سے سبب پر تقدمِ حکم لازم آتا ہے۔ (یعنی دوسرے سجدے کو پہلے کے ساتھ لاحق بھی نہیں کر سکتے کہ پہلے کے ادا کرنے سے دوسرا بھی ادا ہو جائے، کیونکہ اس طرح تو جو آیت ابھی تک پڑھی ہی نہیں گئی اس کا سجدہ بھی ادا ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں، کیونکہ اس طرح مسبب کا سبب سے تقدم لازم آتا ہے۔

مسئلہ :

جو شخص ایک ہی مجلس میں ایک ہی آیتِ سجدہ کو بار بار پڑھے۔ اس کے لیے ایک سجدہ ہی کافی ہے، اگر اس نے اپنی مجلس میں اس کو پڑھ کر سجدہ کیا پھر چلا گیا اور لوٹ کر اسی آیت کو پڑھا تو دوبارہ سجدہ کرے اگر اس نے پہلی مرتبہ کا سجدہ نہ کیا تو اس پر دو سجدے واجب ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ حرج دور کرنے کے لیے سجدہ کی بنیاد تداخل پر رکھی گئی ہے اور وہ تداخل فی السبب ہے، تداخل فی الحکم نہیں، کیونکہ تداخل فی السبب ہی عبادات کے شایان شان ہے اور تداخل فی الحکم تو عقوبات میں ہوتا ہے۔ [یعنی جب ایک ہی مجلس میں آیت سجدہ کی بار بار تلاوت کی جائے تو ان تلاوتوں میں تداخل کیا جائے گا گویا اس نے ایک ہی بار تلاوت کی ہے اور ایک ہی سجدہ لازم ہوگا

اگر تداخل نہ کریں اور جتنی مرتبہ اس آیت کی تلاوت کریں سجدہ واجب قرار دیں تو اس میں بڑا حرج اور دشواری ہو ، خصوصاً اس طالب علم کو جو قرآن کریم حفظ کر رہا ہو ۔ لہذا سہولت کے مدنظر تداخل کا قانون اختیار کیا گیا ۔

تداخل کی دو قسمیں ہیں: تداخل فی السبب اور تداخل فی الحکم ۔ تداخل فی السبب یہ ہے کہ اسباب کثیر ہوں مگر تداخل کے اصول کے مطابق انہیں ایک ہی شمار کیا جائے ۔ جیسے آیت سجدہ کا بار بار تلاوت کرنا کثیر اسباب کا باعث ہے ، مگر تداخل فی السبب کے کلیے کے تحت ہم نے تمام تلاوتوں کو تلاوۃ واحدہ قرار دے کر ایک ہی سجدہ کرنے کا فیصلہ کیا ۔

تداخل فی الحکم یہ ہے ۔ کہ اسباب کثیرہ کے باوجود حکم ایک ہی لگایا جائے ۔ مثلاً ایک آدمی نے ایک رات میں پانچ چوریوں کا ارتکاب کیا ، تو قطع ید کے اسباب پانچ ہیں ۔ مگر قطع ید کا حکم ایک رہے گا ۔ اور ایک بار ہی ہاتھ کٹ گا یا ایک شخص نے پانچ چھ بار زناء کا ارتکاب کیا تو اسباب اگرچہ کثیر ہیں مگر حکم واحد ہوگا (اگر وہ غیر شادی شدہ ہو تو) سو کوڑے لگائے جائیں گے ۔

مذکورہ مسئلہ میں تداخل فی الحکم مراد نہیں اگرچہ سجدہ کے اسباب کثیر ہیں مگر حکم واحد ہوگا ، کیونکہ ہر بار کی تلاوۃ علیحدہ سجدے کا سبب ہے ، مگر ہم نے سہولت اور آسانی کے مدنظر تداخل فی السبب پر عمل کیا اور یہی تداخل عبادات کے شایان شان ہے ۔

تداخل فی الحکم کا تعلّق عقوبات اور سزاؤں سے ہے۔ اس میں بھی آسانی پیش نظر ہے ورنہ اگر ہر زناء کی سزا الگ الگ ہوتی تو انسان کا بچ نکلنا محال ہوتا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ علی ذٰلِکَ]۔

تداخل کا امکان اتحاد مجلس کی صورت ہی میں ممکن ہے کیونکہ مجلس واحد متفرقات (یعنی مختلف اشیاء، اسباب اور ساعات وغیرہ) کے لیے جامع کا حکم رکھتی ہیں (اگر مجلس واحد میں بہت سے اسباب وقوع پذیر ہوں تو انھیں اتحاد مجلس کی بناء پر جمع کر دیا جاتا ہے) لیکن جب مجلس مختلف ہوگئی تو حکم اپنے اصل کی طرف لوٹ آئے گا (اور تداخل کا جواز باقی نہ رہے گا) مجلس محض کھڑا ہو جانے سے مختلف نہیں ہوتی۔ بخلاف مخیرہ عورت کے (یعنی اگر عورت کو خاوند طلاق کا اختیار دے اور وہ مجلس سے اٹھ کھڑی ہو تو اختیار باقی نہ رہے گا) کیونکہ قیام اعراض کی دلیل ہے اور اختیار کی صورت میں قیام اسے باطل کر دیتا ہے۔

کپڑا تاننے کی صورت میں بھی وجوب میں تکرار ہوتا رہے گا یعنی اگر جلاہا کپڑا تاننے کے لیے ایک کنارے سے دوسرے تک جاتے ہوئے ساتھ ساتھ آیۃ سجدہ بھی پڑھتا رہے تو ہر تلاوۃ کا سجدہ الگ ہوگا کیونکہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے سے مجلس مختلف ہو جاتی ہے)

ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جانا بھی صحیح روایت کے مطابق اختلاف مجلس کے حکم میں ہے۔ احتیاط کے پیش نظر

غلّہ گاہنے کا حکم بھی یہی ہے -
اگر تلاوۃ کرنے والا ایک ہی جگہ بیٹھا رہے اور سامع مجلس تبدیل کرتا رہے تو سامع پر وجوب متکرر ہوتا جائے گا ، کیونکہ سامع کے حق میں وجوب سجدہ کا سبب سماع ہے -
ایک روایت کے مطابق جب قاری کی مجلس تبدیل ہو اور سامع کی نہ ہو ، تو بھی یہی حکم ہے ، لیکن صحیح یہ ہے کہ سامع کے حق میں وجوب متکرر نہ ہوگا - جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں - (أی أن السبب فی حقہ السماع ولم یتکرر) -

مسئلہ :

(سجدۂ تلاوۃ ادا کرنے کا طریقہ) جو شخص سجدۂ تلاوۃ کرنا چاہے وہ تکبیر کہے - لیکن ہاتھ نہ اٹھائے اور سجدے میں چلا جائے - پھر تکبیر کہہ کر سر اٹھا لے جیسا کہ نماز کا سجدہ ادا کیا جاتا ہے - ابن مسعودؓ سے اسی طرح روایت کیا گیا ہے - سجدۂ تلاوۃ کے لیے نہ تو تشہد کی ضرورت ہے اور نہ سلام کی - کیونکہ سلام بغرض تحلیل مشروع ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پہلے تحریمہ بھی ہو اور سجدۂ تلاوۃ کے لیے تحریمہ کا کوئی سوال نہیں -

مسئلہ :

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ نماز میں یا نماز سے باہر کسی سورۃ کا پڑھنا اور آیۃ سجدہ کا چھوڑ دینا مکروہ ہے ، کیونکہ

اس سے اعراض واستنکاف کا پہلو نکلتا ہے۔

اگر آیۃ سجدہ پڑھ کر باقی آیات چھوڑ دے تو کوئی حرج نہیں ، کیونکہ اس ترک میں سجدے کی طرف عجلت اور مبادرت ثابت ہوتی ہے (کہ جونہی تلاوۃ کی ، سجدے کا فریضہ ادا کر لیا) ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں پسندیدہ صورت یہ ہے کہ آیات سجدہ سے پہلے بھی ایک دو آیتیں پڑھے تا کہ تفصیل کا وہم دور ہو جائے۔ آیات سجدہ کو سامعین پر شفقت کے طور پر ہلکی آواز میں پڑھنا مستحسن قرار دیا ہے (کیونکہ سامعین میں کئی تو بے وضو ہوتے ہیں اور کئی مختلف کام کاج میں مصروف) واللہ أعلم !

بَابُ صَلٰوةِ الْمُسَافِر

مسافر کی نماز کا بیان

مسئلہ :

وہ سفر کہ جس سے احکام میں تغیّر آ جاتا ہے یہ ہے کہ انسان تین دن رات کے سفر کا قصد کرے ۔ سفر کا اندازہ اونٹ کی یا پیدل چلنے کی رفتار سے لگایا جائے گا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مقیم ایک کامل دن رات موزوں پر مسح کرے اور مسافر تین دن رات" ۔

(سوال ۔ آپ کے دعوے اور دلیل میں مطابقت نہیں ۔ دعوٰی تو یہ ہے کہ جس سفر سے احکام میں تغیّر آتا ہے وہ کم از کم تین دن رات ہو ، مگر دلیل آپ کی یہ ہے کہ مسافر تین دن رات مسح کرے ۔ صاحب ہدایہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ) یہ رخصت اور رعایت جنس سفر کو شامل ہے اور جنس کے عموم کا لازمی نتیجہ عموم تقدیر یعنی سفر کا اندازہ ہے ۔ (جواب کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث میں جو المسافر آیا ہے اس میں الف لام جنس کا ہے (جو ہر قسم کے مسافر کو شامل ہے) مطلب یہ ہے کہ جنس مسافر تین دن رات تک مسح کرے ۔ جب مسافر کے لیے تین دن رات

مسح کرنے کا جواز ثابت ہوگیا تو نتیجۃً یہ بھی ثابت ہوگا کہ سفر بھی تین دن کا ہو - یعنی تین دن رات کا مسح تین دن رات کے سفر کو مستلزم ہے ، کیونکہ اگر کسی کو ایک دن رات کا سفر کرنا ہو اور حدیث کو بھی مدنظر رکھا جائے تو مطلب یہ ہوا کہ مسافر تین دن رات اس جگہ رہ کر مسح کی مدت پوری کرے، لیکن یہ مطلب سیاق وسباق اور حقیقت کے خلاف ہے - لہذا ہمارا بیان کردہ مطلب صحیح ثابت ہوا ، کہ تین دن رات کا مسح تین دن رات کے سفر کو بھی مستلزم ہے اور دلیل بھی دعوے کے مطابق ہے) -

امام ابو یوسف نے سفر کا اندازہ پورے دو دن اور تیسرے کے اکثر حصے سے لگایا ہے اور امام شافعی نے ایک دن رات کے ساتھ -

ہماری پیش کردہ روایۃ ان دونوں حضرات پر حجّۃ ہے-

سیر مذکور سے مراد درمیانہ درجے کی رفتار ہے - امام ابو حنیفہ منازل سے اندازہ فرماتے ہیں اور یہ صورۃ پہلی (یعنی تین دن رات سے اندازہ کرنے والی) صورۃ سے قریب ہے - (کیونکہ مراحل سے اندازہ کرنا زیادہ آسان ہے) فراسخ کا کوئی اعتبار نہیں ، یہی صحیح ہے - (یعنی سفر کا اندازہ میلوں سے لگانا درست نہیں - مگر عام فقہاء میلوں سے اندازہ کرنا درست قرار دیتے ہیں - چنانچہ احناف کے نزدیک کم از کم سفر اڑتالیس میل کا ہو) -

مسئلہ :

اگر قدوری کے اس قول کا کہ پانی میں سفر کی رفتار

سے اندازہ نہیں لگایا جاتا ، یہ مطلب ہے کہ سمندر کے سفر کا قیاس خشکی کے سفر کی رفتار پر نہیں ہوگا بلکہ سمندر میں اس کی اپنی مناسب حالت سے اندازہ کیا جائے گا (کہ نہ تو طوفانی کیفیۃ ہو اور نہ بالکل سکون ہو بلکہ اگر موسم مناسب ہو تو تین دن رات کے سفر کا اندازہ ہوگا ۔ اسی طرح پہاڑی علاقے میں (میدانی سفر پر اعتبار نہ ہوگا ۔ بلکہ پہاڑی سفر کا لحاظ ہوگا) ۔

مسئلہ :

رباعی نمازوں میں مسافر کے فرض دو رکعتیں ہیں ، ان سے زیادہ نہیں ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسافر کے فرض چار ہیں اور قصر روزے پر اعتبار کرتے ہوئے رخصت ہے (یعنی جس طرح روزے میں رخصت ہے کہ رکھے یا افطار کرے مگر روزہ رکھنا افضل ہے ، اسی طرح نماز میں قصر کی رعایت ہے ، مگر چار رکعت ادا کرنا افضل ہے) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ (سفر سے واپسی پر) شفع ثانی کی (نہ تو قضاء ہوگی) نہ اس کے چھوڑنے میں گناہ ہوگا اور یہ شفع ثانی کے نفل ہونے کی دلیل ہے ۔ نماز کو روزے پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ روزے کی قضاء ضروری ہے (یعنی اگر سفر میں روزہ نہ رکھے تو واپس آ کر قضاء کرے لیکن قصر کرنے پر شفع ثانی کی قضاء نہیں) ۔

مسئلہ :

مسافر اگر چار رکعت ادا کرے اور دوسری رکعت

کے بعد تشہد کی مقدار قعود کرے تو پہلی دو رکعتیں فرض ہوں گی اور آخری دو نفل ۔ جیسا کہ فجر کی نماز میں (دو رکعت کے بعد قعدہ کر کے دو مزید پڑھے تو پہلی دو فرض کے طور پر ہوں گی اور آخری دو نفل) مگر چار پڑھنے میں کچھ نہ کچھ قباحت ضرور ہے کیونکہ فرض نماز کے سلام میں بلاوجہ تأخیر لازم آتی ہے ۔

اگر دوسری رکعت کے بعد تشہّد کی مقدار قعود نہ کرے تو نماز باطل ہوگی ، کیونکہ اس نے نفل نماز کو فرض نماز کے ارکان کی تکمیل سے قبل ہی اس سے ملا دیا (اور یہ جائز نہیں) ۔

مسئلہ :

مسافر جب شہر کی عمارت چھوڑ کر آگے نکل جائے تو دو رکعتیں پڑھے کیونکہ امامت کا تعلق ان عمارات میں داخل ہونے سے ہے ، تو سفر کا تعلق ان سے باہر نکل جانے سے ہوگا ۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ سے مروی ہے (آپ جب بصرہ سے نکل کر کوفہ کی طرف جا رہے تھے تو فرمایا) اگر ہم اس جھونپڑی سے آگے نکل جاتے تو قصر کرتے ۔

مسئلہ :

جب تک کسی شہر یا گاؤں میں پندرہ یا پندرہ دن سے زیادہ کی اقامت کی نیت نہ کرے تو اس پر سفر کے احکام ہی جاری ہوں گے اگر مذکورہ مدت سے کم کی نیت کرے تو (مقیم نہ ہونے کی وجہ سے) قصر کرے کیونکہ مدت کا اعتبار

ضروری ہے اور سفر میں چونکہ تھوڑا بہت قیام تو ہوتا ہی رہتا ہے ، اس لیے ہم نے مدت طُہر پر قیاس کرتے ہوئے سفر کے لیے پندرہ دن مقرر کیے ، کیونکہ یہ دونوں موجب مدتیں ہیں (صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ آخر ہمیں سفر کی مدت کا کچھ نہ کچھ تعین تو کرنا ہی تھا ۔ اگر ایک یا دو دن معین کرتے تو یہ ممکن نہ تھا کیونکہ سفر میں کام کاج میں مصروفیت کی بناء پر دو تین دن کا قیام تو عموماً ہو ہی جاتا ہے ۔ لہذا ہم نے مدت طہر پر قیاس کر لیا کہ جس طرح طہر کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے اسی طرح اقامت کی کم از کم مدت بھی پندرہ دن ہوگی ۔

سوال مقیس اور مقیس علیہ میں تو ایسی مشترکہ علت کا موجود ہونا ضروری ہے جس کی بناء پر قیاس درست ہو سکے ، مگر سفر اور طہر میں ایسی کوئی مشترک علت نہیں ۔ مصنفؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ دونوں میں علت مشترکہ موجود ہے کیونکہ جس طرح طہر سے وہ احکام (صوم وصلاۃ وغیرہ) لوٹ آتے ہیں جو حیض کی وجہ سے ساقط ہو گئے تھے اسی طرح مدت اقامت سے بھی وہ احکام لوٹ آتے ہیں جو سفر کی وجہ سے ساقط ہو گئے تھے ۔ یہی علت مقیس اور مقیس علیہ میں مشترک ہے) ۔

نیز ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے بھی یہی مدت منقول ہے اور مقادیر میں صحابہؓ کرام کی بات بھی حدیث نبویؐ کی طرح ہوتی ہے (کیونکہ مقادیر سماعی امور ہیں ان میں اپنے اجتہاد کا دخل نہیں ہوتا) ۔

بلدہ اور قریہ کی قید سے پتا چلتا ہے کہ جنگل میں نیت اقامت کا کوئی اعتبار نہیں اور یہی ظاہر ہے ۔

مسئلہ :

اگر کسی شہر میں یہ ارادہ لے کر داخل ہو کہ آج یا کل چلا جاؤں گا اور وہ مدت اقامت کی نیت نہ کرے حتی کہ اس طرح آج کل کرتے اسے کئی سال گزر جائیں تو وہ قصر کرے کیونکہ حضرت ابن عمرؓ آذربائیجان میں چھ ماہ تک سکونت پذیر رہے اور قصر فرماتے رہے اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے متعلق بھی اسی طرح منقول ہے ۔

مسئلہ :

لشکر اسلامی اگر دارالحرب میں داخل ہو اور اقامت کی نیت کر لے تو بھی قصر کرے ۔ اگر دارالحرب میں کسی شہر یا قلعے کا محاصرہ کیے بیٹھے ہوں تب بھی یہی حکم ہے ، کیونکہ دارالحرب میں داخل ہونے والا اسلامی لشکر دو حالتوں سے خالی نہیں ، یا تو دشمن کو شکست دے کر وہیں رہے گا یا (اگر خدا نخواستہ) شکست کا سامنا ہو تو بھاگنا پڑے گا ۔ لہذا اس شک کی بناء پر دارالحرب دارالاقامہ نہیں بن سکتا ۔

مسئلہ :

اسی طرح اگر وہ دارالاسلام میں آبادی سے باہر یا سمندر میں شرپسندوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہوں (تو نیت اقامت

معتبر نہ ہوگی) کیونکہ ان کی حالت نیّۃ اقامت کو باطل کر سکتی ہے (کہ اگر خدا نخواستہ باغی تسلط جمالیں تو لشکریوں کو بھاگنا پڑے گا) -

امام زفرؒ فرماتے ہیں مذکورہ دونوں صورتوں میں اگر لشکرِ اسلام کو شان و شوکت اور غلبہ حاصل ہو تو نیّۃ اقامت معتبر ہوگی کیونکہ شان و شوکت کی بناء پر ظاہراً لشکر اسلام کو قرار حاصل ہے -

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر لشکر اسلام (خیموں میں مقیم نہ ہو بلکہ) مٹی کے گھروں میں رہایش پذیر ہو تو نیّۃ اقامت درست ہوگی کیونکہ مٹی کے گھر اقامت کی جگہ ہیں -

بعض حضرات کے نزدیک خانہ بدوشوں کی نیّۃ اقامت معتبر نہیں ہوتی - لیکن امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ وہ کچھ عرصہ ایک جگہ پر رہایش رکھنے سے مقیم بن سکتے ہیں ، کیونکہ اقامت اصل کی حیثیت رکھتی ہے - اس لیے ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف کوچ کرنے سے باطل نہ ہوگی -

مسئلہ :

نماز کے وقت میں مسافر اگر مقیم کی اقتداء کرے تو چار رکعۃ ادا کرے کیونکہ امام کی متابعت میں اس کا فرض اسی طرح چار رکعتوں کی طرف تبدیل ہو جائیگا جس طرح اقامت کی نیّۃ سے فرض دو رکعت سے چار رکعت کی طرف تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ مغیر سبب یعنی وقت سے متصل

ہے (مغیر سے مراد مقیم کی اقتداء ہے۔ یعنی اگر وقت میں اقتداء پائی جائے تو فرض دو سے چار ہو جاتے ہیں)۔

اگر مسافر امام کے ساتھ کسی فائتہ نماز میں شریک ہو تو جائز نہیں، کیونکہ سبب کے ختم ہو جانے کی وجہ سے وقت کے بعد وہ اسی طرح نہیں بدلتا جس طرح کہ اقامت کی نیت سے نہیں بدلتا۔ (اگر کسی مسافر کی ظہر کی نماز قضاء ہو جائے اور عصر کے وقت وہ اقامت کی نیت کرے تو ظہر کی دو رکعۃ ہی قضاء کرے گا)۔

(مصنفؒ مذکورہ صورۃ میں عدم جواز کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں) کہ قعدہ یا قراءۃ کے حق میں اقتداء المفترض بالمتنفل لازم آتی ہے (کیونکہ مقتدی مسافر اگر شروع نماز میں اقتداء کرے تو مقتدی کا قعدۂ اولی فرض ہوگا اور امام کا واجب، مقتدی امام سے اقوی حال والا ہے اس لیے مفترض کی اقتداء بالمتنفل لازم آئے گی۔ اگر قعدۂ اولی کے بعد شامل ہو تو باقی دو رکعتوں کی قراءۃ امام کے حق میں مستحب اور مقتدی کے حق میں واجب ہوگی اسی طرح اقتداء مفترض بالمتنفل بھی لازم ہے)۔

اگر مسافر مقیم لوگوں کو نماز پڑھائے تو دو رکعۃ پڑھ کر سلام پھیر دے اور مقیم اپنی نماز پوری کر لیں کیونکہ مقتدی نے دو رکعتوں میں تو امام کی متابعت کا التزام کیا اور باقی میں اسی طرح منفرد ہوگا جیسا کہ مسبوق (جو دو رکعۃ کے بعد شامل ہو) البتہ وہ (منفرد) صحیح روایت کے مطابق قراءۃ نہیں کرے گا کیونکہ وہ تحریمہ کے

لحاظ سے مقتدی ہے (امام کے سلام پھیر کر فارغ ہو جانے کی وجہ سے) بالفعل مقتدی نہیں اور فرض قراءۃ ادا ہو چکا ہے (یعنی جن رکعات میں قراءۃ ضروری تھی وہ امام کے ساتھ ادا کی جا چکی ہیں) اس لیے احتیاط کے مدنظر قراءۃ نہ کرے (کیونکہ اگر اقتداء تحریمہ کا لحاظ ہو تو قراءۃ مکروہ تحریمی ہے اور اگر بالفعل عدم اقتداء کو ملحوظ رکھیں تو قراءۃ مستحب ہے ۔ لہذا جب حرمت اور استحباب میں تعارض ہو تو اس کام کا نہ کرنا ہی محتاط صورۃ ہے) ۔

بخلاف مسبوق کے کہ وہ قراءۃ نافلہ میں شامل ہوتا ہے اور اس کا فریضہ قراءۃ ادا نہیں ہوا ۔ اس لیے اس پر قراءۃ واجب ہوگی (اولی سے مراد واجب ہے) ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مسافر امام جب دو رکعۃ کے بعد سلام پھیر دے تو مستحب یہ ہے کہ اقتداء کرنے والوں سے کہ دے کہ آپ اپنی نماز کی تکمیل کر لیں ہم تو مسافر ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی حالت میں جب اہل مکہ کو نماز پڑھائی تو اسی طرح فرمایا تھا ۔

مسئلہ :

جب مسافر اپنے شہر میں آ جائے تو پوری نماز پڑھے خواہ وہ نیت اقامت نہ کرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم سفر اختیار فرمایا کرتے تھے اور اپنے اوطان کی طرف بغیر کسی عزم جدید کے مقیم ہو کر لوٹا کرتے تھے" ۔

مسئلہ :

جو شخص اپنے وطن سے منتقل ہو کر کسی دوسری جگہ کو وطن بنا لے پھر سفر کر کے اپنے پہلے وطن میں آئے تو قصر کرے کیونکہ وطن اول اب اس کا وطن نہیں رہا ۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ ھجرت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ میں اپنے آپ کو مسافروں کے زمرہ میں شمار فرمایا تھا ، اور یہ اس لیے کہ وطن اصلی اپنے جیسے دوسرے وطن اصلی سے باطل ہوتا ہے ۔ سفر سے باطل نہیں ہوتا ، وطن اقامت اسی جیسے وطن اقامت سے ، سفر سے اور وطن اصلی سے باطل ہو جاتا ہے ۔

مسئلہ :

اگر کوئی مسافر یہ نیت کرے کہ وہ مکہ اور منی میں پندرہ روز اقامت کرے گا تو نماز پوری نہ کرے ، کیونکہ دو جگھوں میں اقامت کی نیّۃ کا اعتبار یہ تقاضا کرتا ہے کہ دو سے زیادہ مواضع میں بھی نیت اقامت درست ہے (مثلاً یہ نیت کرے کہ میں پندرہ دن لاہور ، شیخوپورہ ، گوجرانوالہ اور قصور میں اقامت کروں گا) لیکن یہ ممنوع ہے (کہ اس طرح تو وہ مسافر بن ہی نہیں سکتا) کیونکہ سفر عام طور پر تھوڑے بہت قیام سے خالی نہیں رہتا (اس لیے کہ بعض اوقات تاجر کو کئی شہروں میں دو دو تین تین دن رہنے کا اتفاق ہوتا ہے) البتہ اگر ایک ہی شہر میں راتیں بسر کرنے کا ارادہ کرے تو اس شہر میں داخل ہونے سے مقیم ہو جائے گا کیونکہ انسان کی اقامت کا تعلق عموماً اس کے رات بسر کرنے کی

جگہ سے ہوتا ہے۔

مسئلہ :

جس شخص کی نمازیں سفر میں قضاء ہوں وہ گھر آکر دو دو رکعتیں ادا کرے اور اگر اقامت کی حالت میں قضاء ہوں اور دوران سفر قضاء کرنا چاہے تو چار چار رکعت ادا کرے کیونکہ قضاء ادا کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ (یعنی جس پر چار کی ادا واجب ہو وہ قضاء بھی چار ہی کرے اور جس پر دو کی ادا واجب ہو وہ دو ہی قضاء کرے) اداء میں آخری وقت کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ وقت میں عدم ادا کی صورت میں آخری وقت ہی سبب بنتا ہے (یعنی اگر کوئی شخص آخر وقت تک نماز ادا نہ کرے تو آخری وقت ادا کا سبب بنتا ہے اس لیے آخری وقت کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اول وقت ظہر میں مسافر تھا اور نماز ادا نہ کی، لیکن ظہر کے آخری وقت میں اقامت کی نیت کر لی تو چار رکعت ادا کرے)۔

مسئلہ :

سفر کی مراعات کے لحاظ سے عاصی اور مطیع برابر ہیں (یعنی سفر کسی نیک کام کے لیے ہو یا برے کام کے لیے مراعات سفر حاصل ہوں گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ معصیت پر رخصت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ رخصت کا مقصد تو سہولت اور آسانی مہیا کرنا ہے (اور عاصی مراعات کا مستحق نہیں) اس لیے رخصت کی رعایت اس معصیت پر نہیں دی جائے گی جو سختی اور سزا کو واجب قرار دیتی ہے۔

(یعنی عاصی انسان پر تو سختی کرنی چاہیے تاکہ اسے عبرت حاصل ہو اور وہ عصیان سے احتراز کرے ، مگر آپ اسے سفر کی مراعات سے نواز رہے ہیں اس طرح تو وہ عصیان پر دلیر ہوگا) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ سفر کے متعلق وارد نصوص مطلق ہیں (جن میں خیروشر کی کوئی قید نہیں) دوسری دلیل یہ ہے کہ نفس سفر میں تو کوئی قباحت نہیں (اور نہ ہی نفس سفر معصیت ہے) بلکہ معصیت کا وجود یا تو سفر کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے - (مثلاً اگر چوری کرنے جائے تو سفر ختم کر کے چوری کا ارتکاب کرتا ہے) یا سفر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے ، (مثلاً غلام کا فرار - تو اس صورت میں سفر اور معصیت ساتھ ساتھ ہیں نفس سفر میں کوئی قباحت نہیں - یعنی معصیت، سفر سے الگ چیز ہے) لہذا سفر میں رخصت سے تعلق کی اہلیت موجود رہتی ہے (یعنی جب نفس سفر معصیت نہیں ہوتا تو اس میں مراعات بھی نہیں دی جا سکتی ہیں) واللہ اعلم !

بَابُ صَلاَةِ الْجُمُعَةِ

نماز جمعه کا بیان

مسئلہ :

نماز جمعہ مصر جامع یا مصر کے مصلّی یعنی عیدگاہ وغیرہ ہی میں درست ہے (چھوٹے) گاؤں میں جائز نہیں ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''مصر جامع کے علاوہ کہیں جمعہ ، تشریق ، عیدالفطر اور عیدالاضحی (جائز) نہیں ہوتی ۔ (محدثین کا قول ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ حضرت علیؓ پر موقوف ہے) ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مصر جامع ہر وہ موضع ہے جہاں احکام (شرعیہ) نافذ کرنے اور حدیں قائم کرنے کو امیر اور قاضی ہوں اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ مصر جامع وہ ہے کہ جس کی سب سے بڑی مسجد میں اگر شہر کے لوگ جمع ہوں تو وہ ان کے لیے کافی نہ ہو ۔ پہلی تعریف کو امام کرخیؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی ظاہر ہے ۔ دوسری کو امام ثلجیؒ نے اختیار کیا ہے ۔ جمعے کا حکم صرف مصلی یعنی عیدگاہ وغیرہ تک ہی محدود نہیں بلکہ شہر کے سب مضافات کے لیے جائز ہے کیونکہ شہر مضافات (یعنی ارد گرد کے میدان) اہل شہر کی

ضروریات کے سلسلے میں بمنزلہ نمازگاہ ہوتے ہیں ۔

مسئلہ :

اگر حجاز کا امیر موجود ہو (جیسے آجکل شاہ فیصل امیر حجاز ہیں) ۔ یا مسافر خلیفہ ہو (جیسے پہلے عثمانی خلفاء تھے) تو منٰی میں بھی جمعہ جائز ہے ۔ یہ شیخین[ؒ] کا مسلک ہے ، امام محمد[ؒ] فرماتے ہیں کہ منٰی میں جمعہ جائز نہیں ۔ کیونکہ وہ گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے حتی کہ وہاں عید کی نماز بھی ادا نہیں کی جائے گی ۔

شیخین[ؒ] فرماتے ہیں منٰی موسم حج میں شہر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور لوگوں کی سہولت کے مدنظر وہاں عید کی نماز نہیں پڑھی جاتی (کیونکہ لوگ مراسم حج میں مصروف ہوتے ہیں) ۔

تمام ائمہ کے نزدیک متفقہ طور پر عرفات میں جمعہ جائز نہیں کیونکہ عرفات غیر آباد جگہ ہے اور منٰی میں عمارات ہیں ۔ خلیفہ اور امیر الحجاز کی قید اس لیے لگائی گئی کہ (اقامت جمعہ میں) حق ولایت انہیں کو حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن امیر الحج صرف امور حج کا والی ہوتا ہے دوسرے امور کا نہیں ۔

مسئلہ :

جمعہ کی امامت کا حق یا تو سلطان کو حاصل ہے یا جسے سلطان مامور کرے کیونکہ جمعہ میں بے شمار لوگ ہوتے ہیں (اگر سلطان نہ ہو تو) کسی کے امام بننے یا بنانے

کے بارے میں تنازعہ پیدا ہونے کا امکان ہے اور بعض اوقات دیگر امور میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ پس جمعہ کے امور کی تکمیل وتتمیم کے لیے امیرِ حجاز یا خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔

(شرائط جمعہ) جُمُعہ کی پہلی شرط وقت ہے۔ ظہر کے وقت ہی میں صحیح ہوگا۔ بعد میں صحیح نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُصعب بن عُمیرؓ سے فرمایا: "جب سورج (نصف النہار سے) مائل ہو جائے تو لوگوں کو نماز جمعہ پڑھایا کرو"۔ لوگ ابھی جمعہ کی نماز ہی میں ہوں کہ ظہر کا وقت نکل جائے تو نئے سرے سے ظہر پڑھیں اور جمعہ کی نماز پر بناء نہ کریں کیونکہ دونوں مختلف نمازیں ہیں۔

مسئلہ:

جمعہ کی دوسری شرط خطبہ ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر میں خطبہ کے بغیر کوئی جمعہ نہیں پڑھا۔ خطبہ زوال کے بعد نماز سے پہلے ہے۔ سنت میں ایسے ہی مذکور ہے۔ جمعہ کے لیے دو خطبے پڑھے اور اور کچھ دیر بیٹھ کر ان دونوں کے درمیان فصل کرے کیونکہ اسلاف واخلاف سے یہی دستور رہا ہے۔ خطبہ وضو کی حالت میں کھڑے ہو کر پڑھے کیونکہ ان دونوں میں قیام متوارث ہے۔ پھر یہ خطبہ نماز کی شرط ہے اس لیے اذان کی طرح اس میں بھی طہارۃ مستحب ہے۔ اگر بیٹھ کر خطبہ دے یا بے وضو تو مقصد حاصل ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔ البتہ توارث کی مخالفت اور خطبے اور نماز کے

درمیان فاصلہ حائل ہونے کی وجہ سے یہ مکروہ ہے۔

مسئلہ :

اگر خطبے میں فقط اللہ تعالی کے ذکر ہی پر اکتفاء کرے (مثلاً الحمد للہ۔ سبحان اللہ یا لا إلہ إلا اللہ کہ دے) تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے، صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ اتنا طویل ذکر ضرور ہو جسے خطبہ کہا جا سکے۔ کیونکہ خطبہ تو واجب ہے اور تسبیح یا تحمید کو خطبہ نہیں کہا جاتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک عرف اور دستور کے مطابق دو خطبے نہ دے جائز نہ ہوگا۔ امام اعظمؒ کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی ہے ''فاسعوا الی ذکر اللہ'' اس میں طوالت یا اختصار کے متعلق کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی، نیز حضرت عثمانؓ سے منقول کہ انہوں نے الحمد للہ ہی کہا تھا کہ آپ کو التباس ہوگیا، پھر منبر سے اترے اور نماز پڑھائی۔

مسئلہ :

جمعہ کی تیسری شرط جماعت ہے کیونکہ لفظ جمعہ جماعت ہی سے مأخوذ ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک امام کے علاوہ کم از کم تین آدمی ہوں۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ امام کے سوا کم از کم دو ہوں۔

مصنفؒ فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ یہ اکیلے امام ابو یوسفؒ کا قول ہے انہی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مثنّی

میں اجتماع کا معنی موجود ہے اور لفظ جمعہ سے بھی اجتماع کا اظہار ہوتا ہے۔

طرفینؒ فرماتے ہیں کہ جمع صحیح کے کم از کم تین افراد ہوتے ہیں کیونکہ تین افراد اسم اور معنی دونوں کے لحاظ سے جمع ہیں (اور مثنّی اگرچہ معنوی طور پر جمع ہے مگر اسم کے لحاظ سے جمع نہیں۔ اسی لیے اہل لغۃ نے دونوں کے الگ الگ نام وضع کیے ہیں یعنی تثنیہ اور جمع)۔

نیز جماعت الگ شرط ہے اور امام الگ، لہذا امام ان میں شامل نہیں کیا جائے گا، (بلکہ امام کے علاوہ کم از کم تین افراد کی جماعت ہو)۔

مسئلہ :

امام کے رکوع سجود سے پہلے اگر لوگ بھاگ جائیں اور صرف عورتیں اور بچے باقی رہ جائیں تو امام اعظمؒ کے نزدیک نئے سرے سے ظہر کی نماز پڑھے۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر افتتاح نماز کے بعد بھاگیں تو امام جمعہ پڑھے اور اگر رکوع اور ایک سجدہ کرنے کے بعد بھاگ جائیں تو جمعہ ہی پر بناء کرے بخلاف امام زفرؒ کے (کہ وہ ظہر پڑھنے کے قائل ہیں)۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ جمعہ کے لیے جماعت شرط ہے اس لیے اس کا دوام ضروری ہے)۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ جماعت جمعہ کے انعقاد کی شرط ہے اس لیے دوام ضروری نہ ہوگا جس طرح خطبہ (انعقاد جمعہ کی شرط ہے مگر اس کا دوام لازم نہیں کہ جب تک

جمعہ ختم نہ ہو خطبہ پڑھا جاتا رہے) ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں انعقاد کا دارو مدار نماز شروع ہونے پر ہے اور یہ رکعت پوری ہونے پر ہی پورا ہوتا ہے، کیونکہ ایک رکعت سے کم نماز نہیں ۔ اس لیے رکعت کی تکمیل تک انعقاد کا دوام ضروری ہے ۔ بخلاف خطبہ کے ، کہ وہ چونکہ نماز کے منافی ہوتا ہے اس لیے اس کا دوام شرط نہیں ۔

عورتوں اور بچوں کے رہ جانے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ ان سے جمعہ منعقد نہیں ہوتا اس لیے ان سے جماعت کا انعقاد بھی نہ ہوگا ۔

مسئلہ :

مسافر ، عورت ، مریض ، غلام اور اندھے آدمی پر جمعہ واجب نہیں ، کیونکہ مسافر کو جمعہ میں حاضری دینے سے تکلیف کا سامنا کرنا ہوتا ہے ، شاید اسے جمعہ کے بعد سفر کے لیے کوئی سواری ہی نہ مل سکے) مریض اور اندھے کو بھی حاضری دینے میں مشقّت پیش آتی ہے ۔ غلام اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہوتا ہے اور عورت خاوند کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے ۔ اس لیے انہیں معذور قرار دیا گیا تاکہ ان سے حرج اور ضرر کو دور کیا جا سکے ۔ اگر یہ لوگ آ جائیں اور لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کریں تو انہیں فرض وقت سے کفایت کرے گا ، کیونکہ انہوں نے اس کو برداشت کر لیا اس لیے وہ اس مسافر کی طرح ہوگئے جو روزہ رکھے (مسافر کو روزہ رکھنے نہ رکھنے میں اختیار ہے لیکن اگر

رکھ لے تو فرض ساقط ہو جاتا ہے) ۔

مسئلہ :

مسافر ، غلام اور مریض جمعہ میں امامت کے فرائض بھی سر انجام دے سکتے ہیں ۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ان کی امامت جائز نہیں کیونکہ جمعہ ان پر فرض نہیں اس لیے یہ بچے اور عورت کے حکم میں ہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ان لوگوں کو رخصت حاصل تھی ، (مگر جب انھوں نے اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا) اور حاضر ہوگئے تو ان سے بھی بطور فرض واقع ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔ رہا بچے کا معاملہ تو وہ مسلوب الاھلیۃ ہے اور عورت میں مردوں کی امامت کی صلاحیت مفقود ہے ۔

ان اشخاص سے جمعہ منعقد ہوجاتا ہے کیونکہ جب ان میں امامت کی صلاحیت موجود ہے تو اقتداء کی صلاحیت بدرجہ اولی موجود ہوگی ۔

مسئلہ :

جو شخص جمعہ کے دن امام کی نماز سے پہلے اپنے گھر میں نماز ظہر پڑھ لے اور (نماز جمعہ کے ترک کرنے کا) کوئی عذر نہ ہو تو (گھر پر نماز ادا کرنا) مکروہ ہے ۔ البتہ نماز ادا ہو جائے گی ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ظہر جائز نہیں ہوگی کیونکہ ان کے نزدیک جمعہ ایک حقیقی فریضہ ہے اور ظہر اس کے

بدل کی مانند ہے جب اصل پر قدرت ہو تو بدل کو اختیار کرنا جائز نہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ تمام لوگوں کے حق میں اصل فرض تو ظہر ہے ۔ یہی ظاہر مذہب ہے ، لیکن ہمیں جمعہ کے ادا کرنے اور ظہر کے ساقط کرنے کا حکم دیا گیا ۔ (یعنی اصل فرض تو ظہر ہے مگر شرع نے ہمیں جمعہ کے دن جمعہ ادا کرنے اور ظہر ساقط کرنے کا حکم دیا ہے ، اس لیے جمعہ کے ادا کرنے میں ظہر بھی ادا ہو جائے گی) ۔

ظہر کے اصل فرض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان ظہر تو بنفسہ اکیلا بھی ادا کر سکتا ہے مگر جمعہ اکیلا نہیں ادا کر سکتا ، کیونکہ جمعہ کئی شرائط پر موقوف ہے جن کو اکیلا شخص پورا نہیں کر سکتا اور تکالیف شرعیہ کا دار و مدار انسان کی قدرت کے مطابق ہوتا ہے "اَلطَّاعَةُ بِحَسْبِ السَّعَةِ" ۔

مسئلہ :

اگر اس شخص کو ظہر ادا کرنے کے بعد خیال آئے کہ مجھے تو جمعہ پڑھنا چاہیے تھا ۔ چنانچہ وہ مسجد کی طرف چل پڑا اور امام نماز جمعہ میں مشغول تھا تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی سعی الی الجمعہ سے ظہر باطل ہو جائے گی ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ جب تک جماعت میں شریک نہ ہو باطل نہ ہوگی کیونکہ سعی فضیلت اور درجے میں ظہر سے کمتر ہے لہذا ظہر مکمل ہونے کے بعد کمتر چیز سے

باطل نہیں ہوگی ، مگر جمعہ کو فوقیت حاصل ہے اس لیے شرکت جمعہ سے ظہر باطل ہو جائیگی (اور جب تک وہ اس میں شریک نہ ہو) وہ اس شخص کی طرح ہوگا جو فراغ امام کے بعد متوجہ ہو ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں جمعہ کی طرف سعی کرنا جمعہ کی خصوصیات میں سے ہے ، لہذا احتیاط کے طور پر ظہر کو ساقط کرنے کے حق میں سعی نماز جمعہ کے قائم مقام ہوگی (شاید سعی الی الجمعۃ سے ظہر باطل ہو اس لیے اگر جمعہ میں شریک نہ ہو سکے تو ظہر کا اعادہ کرے) بخلاف اس صورت کے جب وہ امام کے جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد پہنچے تو وہ سعی الی الجمعۃ نہیں (لہذا ظہر باطل نہیں ہوگی) ۔

مسئلہ :

معذور لوگوں کے لیے جمعہ کے دن شہر میں ظہر کی نماز جماعت سے ادا کرنا مکروہ ہے اسی طرح قیدی بھی (اگر جیل میں جماعت کے ساتھ ظہر ادا کریں) تو یہ امور جمعہ میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے ، کیونکہ جمعہ تمام جماعات کا جامع ہے ۔ (یعنی جمعہ کے دن جامع مسجد کے سوا مسجدوں یا گھروں میں جماعتیں نہ کرائی جائیں) اور معذورین کو دیکھ کر کبھی غیر معذور بھی جماعت میں شامل ہو جائے گا (جس سے جمعہ میں خلل واقع ہوگا) بخلاف اہل دیہات کے کہ ان پر جمعہ فرض ہی نہیں ہوتا ۔

اگر کچھ لوگ نماز با جماعت ادا کر لیں تو نماز ادا ہو جائے گی کیونکہ جماعت اور نماز کی تمام شرائط موجود ہیں ۔

مسئلہ :

جو شخص جمعہ کے دن امام کے ساتھ شریک ہو جائے تو جس قدر نماز اس کے ساتھ پائے پڑھے اور اس پر جمعہ کی بناء کرے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”جس قدر پالو پڑھ لو اور جو رہ جائے قضاء کر لو“ ۔

مسئلہ :

اگر اس نے امام کو تشہد میں یا سجود سہو میں پایا ہو تو شیخینؒ کے نزدیک اسی پر جمعہ کی بناء کرے ۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ امام کے ساتھ دوسری رکعت کے اکثر حصے میں (یعنی قبل الرکوع) شریک ہوا ہو تو جمعہ کی بناء کرے ، اگر اس سے کم تر حصے میں شریک ہوا ہو تو اس پر ظہر کی بناء کرے ، کیونکہ یہ جمعہ ہے اور اس کے حق میں بعض شرائط کے کھو جانے کی وجہ سے ایک طرح ظہر بھی ہے ، لہذا ظہر کا اعتبار کرتے ہوئے وہ چار رکعت ادا کرے اور جمعہ کا اعتبار کرتے ہوئے دو رکعتوں کے بعد قعود ضروری ہے ۔ نیز آخری دو رکعتوں میں بھی قراءۃ کرے ممکن ہے یہ دو رکعتیں نفل ہی ہوں ۔

شیخینؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس حالت میں جمعہ کو پانے والا ہے ۔ حتی کہ اقتداء کے وقت جمعہ کی نیت کرے اور وہ دو رکعتیں ہیں ۔ امام محمدؒ کے مذکورہ دلائل کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جمعہ اور ظہر دو مختلف چیزیں ہیں لہذا ایک کی تحریمہ پر دوسری کی بناء نہیں ہوگی ۔

مسئلہ :

جب امام جمعہ کے دن (خطبہ کے لیے) نکلے تو لوگ اس کے خطبہ سے فارغ ہونے تک بات چیت اور نماز سے باز رہیں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ امام اعظمؒ کا قول ہے صاحبینؒ کہتے ہیں کہ امام کے نکلنے کے وقت بات چیت کرنے میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ وہ خطبہ شروع نہ کردے۔ اسی طرح نزول منبر اور تکبیرے کے درمیانی عرصہ میں بھی بات چیت مکروہ نہیں، کیونکہ کراہت تو فریضۂ سماع میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے ہے، مگر ان مذکورہ وقفوں میں سماع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بخلاف نماز کے، کیونکہ بعض اوقات نماز طویل ہو جاتی ہے (اور نمازی خطبہ سننے سے محروم رہ جاتا ہے)۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں ہماری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "جب امام نکل آئے تو نہ نماز پڑھی جائے اور نہ کلام کیا جائے" اس میں کوئی تفصیل نہیں (کہ امام کے خطبے سے پہلے یا بعد میں کلام جائز ہے کہ نہیں) نیز بعض اوقات کلام بھی طوالت اختیار کر لیتا ہے اس لیے نماز کے مشابہ ہوگا۔

مسئلہ :

مؤذن جب پہلی اذان کہیں تو لوگ خرید و فروخت ترک کر کے جمعہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔ "فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ" کہ اللہ تعالی کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

مسئلہ :

امام منبر پر چڑھ کر بیٹھ جائے اور مؤذن منبر کے سامنے اذان کہے۔ اسلاف سے یہی طریق منقول ہے البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صرف یہی اذان تھی، اس لیے کہا جاتا ہے کہ سعی کے وجوب اور خرید و فروخت کی حرمت کا تعلق اسی اذان سے ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کا اعتبار کیا جائے جبکہ وہ زوال کے بعد کہی جائے، کیونکہ اس سے اعلان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

بَابُ الْعِيدَیْنِ

نماز عیدین کا بیان

مسئلہ :

ہر وہ شخص جس پر نماز جمعہ واجب ہے اس پر نماز عید بھی واجب ہے۔ امام محمدؒ جامع صغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر ایک دن میں دو عیدیں اکٹھی ہو جائیں (یعنی عید اور جمعہ) تو پہلی مسنون ہے اور دوسری فرض۔ لیکن ان میں سے ایک کو بھی چھوڑا نہ جائے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے قول سے نماز عید کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے اور متن والی عبارت سے وجوب کا پتا چلتا ہے۔ امام اعظمؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ پہلے قول (یعنی قول وجوب) کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس پر مواظبت فرمائی اور دوسرے قول کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت نے حدیث اعرابی میں اس کے سوال ''هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ کے بعد فرمایا'' ۔ نہیں الاّ یہ کہ نفل پڑھ لیے جائیں''۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اسے سنت کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ :

یوم عیدالفطر میں عیدگاہ کو جانے سے پہلے کچھ کھ

پی لینا مستحب ہے، نیز غسل کرے، مسواک استعمال کرے اور خوشبو لگائے، آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ آپ فطر کے دن عیدگاہ جانے سے قبل کچھ تناول فرمایا کرتے تھے اور دونوں عیدوں کے لیے غسل فرماتے تھے۔ نیز عیدین کا دن اجتماع کا دن ہوتا ہے اس لیے جمعہ کے دن کی طرح غسل کرنا اور خوشبو لگانا مسنون ہے۔ اپنے عمدہ کپڑے زیب تن کرے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے موقع پر پوستین یا اُون کا جبّہ زیب تن فرمایا کرتے تھے۔

مسئلہ :

(عید پڑھنے سے پہلے) صدقۂ فطر ادا کرے تا کہ تنگدست بھی اپنی ضروریات کی کفالت کر سکے اور اس کا دل نماز عید کے لیے فارغ ہو سکے۔

مسئلہ :

(اس کے بعد) عیدُگاہ کی طرف چل پڑے اور امام اعظمؒ کے نزدیک عیدگاہ کے راستے میں تکبیر نہ کہے اور صاحبینؒ کے نزدیک عیدالاضحی کی طرح تکبیر کہی جائے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ تکبیر ثناء ہے اور ثناء میں اصل اخفاء ہے۔ لیکن شریعت نے اضحی کے موقع پر جہر کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ وہ تکبیر کا دن ہے، مگر یوم الفطر ایسا نہیں ہوتا۔

مسئلہ :

نماز عید سے پہلے عیدگاہ میں نفل نہ پڑھے کیونکہ نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجودیکہ آپ کو عبادت الٰہی سے قلبی لگاؤ اور شغف تھا ایسا کبھی نہیں کیا۔

بعض فقہاء کا ارشاد ہے کہ نفل پڑھنے کی کراہت عیدگاہ سے مخصوص ہے اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ کراہت کا تعلق عیدگاہ اور غیر عیدگاہ دونوں سے ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔

مسئلہ :

جب سورج بلند ہو جائے تو نماز عید کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور زوال تک رہتا ہے۔ سورج ڈھلنے پر نماز عید کا وقت ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے جب سورج نیزے یا دو نیزے کی مقدار بلند ہو جاتا اور ایک بار جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرامؓ نے عید کا چاند زوال کے بعد دیکھا تو دوسرے روز عیدگاہ کی طرف نکلنے کا حکم دیا۔ (اس سے پتا چلا کہ زوال کے بعد نماز عید کا وقت نہیں رہتا)۔

مسئلہ :

امام نماز عید کے لیے دو رکعتیں پڑھائے پہلی رکعت میں سب سے پہلے تکبیر افتتاح کہے اور (ثناء کے بعد) تین زائد تکبیرات پھر فاتحہ اور کوئی سورت پڑھے اور تکبیر کہہ کر رکوع کرے پھر دوسری رکعت قراءۃ سے شروع کرے اور قراءۃ کے بعد تین زائد تکبیریں کہے اور چوتھی تکبیر کے

ساتھ رکوع کرے - یہ ابن مسعودؓ کا قول ہے اور ہمارا بھی یہی مسلک ہے -

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلی رکعت میں تکبیر افتتاح کہے اور اس کے بعد پانچ زائد تکبیرات کہے اسی طرح دوسری رکعت میں بھی پانچ تکبیرات کہ کر قراءۃ شروع کرے - ایک روایت میں ہے کہ دوسری رکعت میں چار تکبیرات کہے -

آج کل عوام کا عمل ابن عباسؓ کے قول پر ہے کیونکہ خلفاء بنی عباس نے ابن عباسؓ کے قول پر عمل کرنے کا حکم دے رکھا ہے ، مگر مسلک کے اعتبار سے پہلا مناسب ہے کیونکہ بار بار تکبیر کہنا اور ہاتھوں کا اٹھانا معہود کے خلاف ہے اس لیے عمل بالاقل زیادہ مناسب ہوگا (کیونکہ خلاف معہود کام نماز میں جتنا کم کیا جائے اچھا ہے) رہا تکبیرات کا معاملہ تو تکبیرات شعائر دین سے ہیں حتی کہ انہیں بلند آواز سے کہا جاتا ہے - اس لیے ان کو اکٹھا کر کے کہنا اصل کی حیثیت رکھتا ہے - اسی بناء پر پہلی رکعت میں تکبیر افتتاح کے ساتھ ان کا الحاق واجب ہے کیونکہ تکبیر افتتاح فرض ہونے اور مقدم ہونے کے لحاظ سے قوت کی حامل ہوتی ہے اور دوسری رکعت میں تکبیر رکوع کے علاوہ اور کوئی تکبیر (حالت قیام میں) نہیں ہوتی اس لیے اس کے ساتھ تکبیرات زوائد کا ضم واجب ہے -

امام شافعیؒ نے ابن عباس کے قول کو اختیار کیا ہے مگر آپ نے روایت کردہ تمام تکبیرات کو زوائد پر محمول

کیا ہے جس سے آپ کے نزدیک تکبیرات کی تعداد پندرہ یا سولہ بن جاتی ہے (ابن عباسؓ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بارہ تکبیرات کہتے تھے ۔ ایک افتتاح ، دو رکوع، پانچ زوائد پہلی رکعت میں اور چار دوسری میں ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپ تیرہ تکبیرات کہتے ۔ یعنی دوسری رکعت میں بھی پانچ ۔ امام شافعیؒ نے خیال کیا کہ شاید یہ زوائد ہوں ، تو ان کے نزدیک تکبیرات کی تعداد پندرہ یا سولہ ہو گئی ۔ یعنی ایک تکبیر افتتاح کی ، دو رکوع کی اور بارہ یا تیرہ زوائد) ۔

مسئلہ :

تکبیرات عیدین میں ہاتھ بھی اٹھائے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تکبیرِ رکوع کے علاوہ تکبیرات زوائد میں (ہاتھ اٹھائے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''سات مواقع کے علاوہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں ''ان سات مواقع میں آپ نے تکبیرات الاعیاد کو بھی شامل فرمایا امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں ۔ ہماری پیش کردہ روایت امام ابو یوسفؒ کے خلاف حجت ہے ۔

مسئلہ :

نماز کے بعد دو خطبے پڑھے ۔ حدیث مشہور میں اسی طرح وارد ہے ۔ ان خطبوں میں لوگوں کو صدقۂ فطر اور اس کے متعلقہ احکام سے آگاہ کرے کیونکہ خطبہ تعلیم ہی کے لیے مشروع ہے ۔

مسئلہ :

جو شخص امام کے ساتھ نماز عید ادا نہ کر سکے وہ بعد میں قضاء نہ کرے کیونکہ نماز عید چند شرائط کے ساتھ عبادت کا درجہ حاصل کرتی ہے اور ان شرائط کی تکمیل اکیلے شخص سے ممکن نہیں ۔

مسئلہ :

مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے اگر چاند نظر نہ آئے اور لوگ (دوسرے دن) زوال کے بعد امام کے پاس آ کر رؤیۃ ہلال کی شہادت دیں تو عید کی نماز اگلے دن پڑھی جائے کیونکہ عذر کی بناء پر تأخیر واقع ہوئی ہے ۔ اور اس سلسلے میں حدیث بھی موجود ہے (کہ آپ نے بھی اسی طرح کی صورت میں اگلے دن نماز پڑھی تھی) ۔

اگر اگلے دن بھی کوئی ایسا عذر پیش آ جائے کہ نماز نہ پڑھی جا سکے تو بعد میں نہ پڑھی جائے کیونکہ نماز عید کے بارے میں اصل یعنی قیاس تو یہ ہے کہ جمعہ کی طرح قضاء نہ کی جائے ۔ مگر ہم نے حدیث کے پیش نظر قیاس کو چھوڑ دیا ، اور حدیث پر عمل کیا کہ عذر کی بناء پر صرف دوسرے دن تک تأخیر جائز ہے ۔ اس کے بعد جائز نہیں) ۔

مسئلہ :

عیدالاضحی کے دن غسل کرنا اور خوشبو لگانا مستحب ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ۔ اس دن نماز سے فارغ ہونے تک کھانے کو مؤخر کرے ۔ روایت ہے کہ

آنحضرتؐ نحر کے دن عیدگاہ سے مراجعت سے پہلے کچھ نہ کچھ تناول فرماتے واپس تشریف لا کر اپنے قربانی کے گوشت سے کھاتے۔

مسئلہ :

تکبیر کہتا ہؤا عیدگاہ کی طرف روانہ ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی راستے میں تکبیر کہا کرتے تھے۔ نماز فطر کی طرح دو رکعتیں پڑھے اسی طرح منقول ہے۔
نماز کے بعد دو خطبے پڑھے کیونکہ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اِن خطبوں میں لوگوں کو قربانی اور تکبیرات تشریق کے احکام سکھائے، کیونکہ قربانی اور تکبیرات تشریق ہی اس وقت میں مشروع ہیں اور خطبے کی غرض ہی لوگوں کو تعلیم دینا ہے۔

مسئلہ :

اضحیٰ کے دن اگر کوئی عذر نماز سے روکتا ہو تو دوسرے اور تیسرے دن اس کو پڑھ لیں اس کے بعد اسے نہ پڑھیں کیونکہ نماز قربانی کے اوقات تک مؤقت ہے، اس لیے قربانی کے ایام تک ہی محدود رہے گی۔ کسی عذر اور مانع کے بغیر ہی تأخیر کرنا منقول روایات کی مخالفت کی وجہ سے گناہ ہے۔

مسئلہ :

جس طرح بعض لوگ عرفات مناتے ہیں۔ وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض لوگ عرفہ کے دن بعض جگہوں میں اکٹھے

ہو کر عرفہ میں قیام کرنے والوں کی مشابہت کرتے ہیں (مگر اس کا کوئی اصل نہیں) کیونکہ عرفہ میں وقوف تو ایک مخصوص عبادت ہے جو ایک مخصوص مقام کے ساتھ خاص ہے لہذا (طواف وسعی وغیرہ) تمام مناسک حج کی طرح وقوف بھی کسی دوسرے مقام میں عبادت نہیں بن سکتا ۔

فَصْلٌ فِی تَکْبِیرَاتِ التَّشْرِیقِ

تکبیرات تشریق کے بیان میں

مسئلہ :

عرفہ کے دن نماز فجر کے بعد تکبیر تشریق شروع کرے اور نحر کے دن نماز عصر کے بعد ختم کرے ۔ یہ امام اعظمؒ کا قول ہے۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں ایام تشریق کے آخری دن نماز عصر کے بعد ختم کرے ۔ (حضرت عمرؓ ، ابن عباسؓ اور علیؓ کا بھی یہی قول ہے) یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ میں بھی مختلف فیہ تھا ۔ صاحبینؒ نے حضرت علیؓ کا قول اختیار کرتے ہوئے اکثریت کی صورت کو اختیار کیا کیونکہ عبادات میں یہی صورت محتاط ہے (کہ عبادت کثرت سے کی جائے) ۔

امام اعظمؒ نے ابن مسعودؓ کے قول کو اختیار فرمایا اور اقل صورت کو لیا کیونکہ تکبیر کے ساتھ جھر کرنا بدعت ہے (اور بدعت سے احتراز ہی اولی ہے ۔ تکبیر تشریق یہ ہے کہ ایک بار کہے اَللّٰهُ اَکْبَرْ اَللّٰهُ اَکْبَرْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرْ ، اَللّٰهُ اَکْبَرْ ، وَلِلّٰهِ الْحَمْد حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلوات اللہ علیہ سے اسی طرح منقول ہے ۔

مسئلہ :

امام اعظمؒ کے نزدیک تکبیرات تشریق شہروں میں مقیم لوگوں پر مسنون جماعت کے ساتھ فرض نمازوں کے بعد واجب ہیں ، عورتوں کی جماعت میں اگر مرد ساتھ نہ ہوں تو عورتوں پر ضروری نہیں ۔ اسی طرح مسافروں کی جماعت پر بھی ضروری نہیں جب تک کہ ان کے ساتھ کوئی مقیم نہ ہو ۔

صاحبینؒ کے نزدیک تکبیرات تشریق ہر اس شخص کے لیے ضروری ہیں جو مکتوبہ نماز پڑھے کیونکہ تکبیرات نماز نماز مکتوبہ کے تابع ہوتی ہیں ۔

امامؒ صاحب کی دلیل وہ روایۃ ہے جو ہم (باب الجمعہ میں) ذکر کر چکے ہیں (یعنی لاجمعۃ ولا تشریق الخ) اور تشریق تکبیر کو کہتے ہیں ۔ (امام لغۃ) خلیل ابن احمدؒ سے اسی طرح نقل کیا گیا ہے ۔ نیز تکبیر کو جہراً کہنا خلاف سنۃ ہے لیکن چند شرائط کے موجود ہونے پر شریعۃ نے تکبیر بالجہر کا حکم دیا ہے (اور یہ جو متن میں مذکور ہیں) عورتوں میں (تکبیرات) اس وقت واجب ہیں جب وہ مردوں کے ساتھ اقتداء کریں اور مسافروں پر جب وہ مقیم کے ساتھ تبعیۃ کے طریق پر اقتداء کریں ۔ امام یعقوب ابو یوسفؒ فرماتے ہیں ۔ میں نے عرفہ کے دن مسافروں کو مغرب کی نماز پڑھائی تو تکبیر کہنا بھول گیا اس پر امام ابو حنفیہ رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ امام اگر تکبیر کہنا چھوڑ دے تو مقتدی نہ چھوڑیں کیونکہ یہ احرام صلاۃ (یعنی اثناء نماز) میں ادا نہیں کی جاتیں

(کہ امام کی مخالفت لازم آئے) پھر تکبیرات تشریق میں امام کا موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ مستحب ہے (اس لیے اگر امام تکبیر بھول جائے یا چھوڑ دے تو مقتدی ہرگز نہ چھوڑے اور اگر وہ انفرادی طور پر نماز ادا کرے تو بھی تکبیر کہے)۔

تو اسے غسل دیا جائے اور نماز پڑھی جائے کیونکہ وہ اپنی جان ایک ایسے حق کے ایفاء میں دے رہا ہے جو اس پر واجب ہے، لیکن شہداء احد نے اپنی عزیز جانیں محض اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں صرف کی تھیں اس لیے یہ مقتول ان کے ساتھ شامل نہیں ہوگا۔

مسئلہ:

اگر باغیوں یا ڈاکوؤں میں کوئی شخص مارا جائے تو اس پر نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ حضرت علیؓ نے باغیوں پر نماز نہیں پڑھی تھی۔

باب صلاة الكسوف
سورج گہن کے وقت نماز کا بیان

مسئلہ :

جب سورج کو گہن لگ جائے تو امام لوگوں کو نفل کی طرح دو رکعتیں پڑھائے ہر رکعة میں ایک رکوع ہو ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دو رکوع ہوں ۔ ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے ۔

ہماری دلیل حضرت ابنؓ عمر کی روایة ہے نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہونے کی وجہ سے مرد حقیقت حال سے زیادہ واقف ہوتے تھے اس لیے حضرت عائشہ کی روایة پر ابن عمرؓ کی روایة کو ترجیح حاصل ہوگی ۔

مسئلہ :

دونوں رکعتوں میں قراءة لمبی کرے اور امام اعظمؒ کے نزدیک قراءة خفی کرے ۔ صاحبینؒ کہتے ہیں بالجہر کرے ۔ امام محمدؒ کا ایک قول امام اعظمؒ کے مطابق بھی ہے ۔ قراءة کو طول دینا افضل کام ہے چاہے تو مختصر بھی کر سکتا ہے ، کیونکہ مسنون یہی ہے جب کہ تک گہن رہے نماز اور دعا میں مصروف رہے ۔ جب ایک کو مختصر کرے تو

دوسری کو لمبا کرے۔ (یعنی نماز و دعا میں سے اگر ایک کو مختصر کیا ہے تو دوسری کو اتنا طویل کرے کہ سورج گہن کا وقت پورا ہو جائے)۔

اخفاء اور جہر کے سلسلے میں صاحبینؒ کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہر فرمایا تھا، اور امام اعظمؒ کی دلیل ابن عباسؓ اور سَمُرَةُ بن جندبؓ کی روایت ہے اور وجہ ترجیح کے متعلق ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ نیز یہ دن کی نماز ہے اور دن کی نمازیں عجماء ہوتی ہیں (یعنی ان میں بلند آواز سے قراءۃ نہیں کی جاتی)۔

مسئلہ :

نماز کے بعد امام دعا میں مصروف ہو جائے حتی کہ سورج گہن سے نکل جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم اس نوع کے وحشتناک امور دیکھو تو اللہ تعالی کی طرف رغبت کر کے (امن وعافیت کی) دعا کیا کرو'' اور دعا میں مسنون یہی ہے کہ اسے نماز سے مؤخر کیا جائے۔

مسئلہ :

جو شخص جمعہ میں امامت کے فرائض ادا کرتا ہو وہی نماز کسوف بھی پڑھائے اگر وہ موجود نہ ہو تو لوگ الگ الگ نمازیں پڑھیں تاکہ کوئی جھگڑا رونما نہ ہو (دوبارۂ امامت۔ اگر تمام لوگ متفقہ طور پر کسی کو امام بنا لیں تو جائز ہے)۔

مسئلہ :

چاندگہن کے موقع پر رات کے وقت لوگوں کا جمع ہونا مشکل ہونے کی وجہ سے یا کسی فتنے کے خوف کے باعث جماعت ضروری نہیں ۔ ہر شخص (اپنے گھر میں) خود ہی نماز پڑھے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ۔ ''جب تم ان ہولناک امور میں سے کوئی چیز دیکھو تو نماز کا سہارا تلاش کیا کرو'' ۔

نماز کسوف کا خطبہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ منقول نہیں (یعنی کسی مشہور روایت میں خطبے کا ذکر نہیں) ۔

باب الاستسقاء

نماز اِستسقاء کا بیان

مسئلہ :

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں استسقاء میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مسنون نہیں ۔ لوگ الگ الگ بھی پڑھ لیں تو جائز ہے ورنہ استسقاء تو محض دعا واستغفار کا نام ہے ۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ۔ اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَاراً،، ۔ نبی اکرمؐ نے بارش طلب فرمائی لیکن آپ سے نماز منقول نہیں ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ امام دو رکعتیں پڑھائے کیونکہ ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے نماز عید کی طرح دو رکعتیں پڑھائیں ۔ ہم کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اس کو ایک مرتبہ کیا اور دوسری مرتبہ ترک کر دیا تو یہ نماز مسنون نہ رہی ۔ اصل یعنی کتاب مبسوط میں (نماز کے متعلق) اکیلے امام محمدؒ کا قول مذکور ہے ۔

مسئلہ :

نماز عید پر قیاس کرتے ہوئے دونوں رکعتوں میں قراءۃ

بالجهر کرے پھر خطبہ پڑھے ۔ آنحضرتؐ سے خطبہ پڑھنا مروی ہے ۔ امام محمدؒ کے نزدیک عید کی طرح دو خطبے پڑھے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ایک خطبہ ۔ امام اعظمؒ کے نزدیک خطبہ نہیں ہے ، کیونکہ خطبہ جماعت کے تابع ہے اور وہ جماعت ہی کے قائل نہیں ۔

مسئلہ :

دعا کرتے وقت قبلہ رو ہو کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور اپنی چادر تبدیل کی ۔

مسئلہ :

(نماز اور خطبے کے بعد) تحویل رداء کرے (یعنی چادر بدلے) جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ قلب رداء کے قائل ہیں ۔ (یعنی چادرکا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کرنا) اما اعظمؒ کے نزدیک قلب رداء نہ کرے کیونکہ استسقاء دعا ہی تو ہے ، لہذا یہ بھی دوسری دعاؤں کی طرح ہوگی ۔ نبی کریمؐ نے محض فال اور شگون کی طور پر چادر بدلی تھی ۔

مقتدی قلبِ رداء نہ کریں کیونکہ ایسی کوئی روایت نہیں جس سے ثابت ہو کہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو بھی قلبِ رداء کا حکم دیا تھا ۔

دعاءِ استسقاء میں اہل ذمہ یعنی غیر مسلم شریک نہ ہوں کیونکہ استسقاء تو طلب رحمت کے لیے ہے اور کافر لعنت کے مستحق ہیں ۔

بَابُ صَلَاةِ الْخَوْف
نماز خوف کا بیان

مسئلہ :

جب خوف شدید ہو جائے تو امام لشکریوں کے دو گروہ بنادے ۔ ایک گروہ دشمن کے سامنے ہو اور دوسرا اس کے پیچھے ہو اور یہ اس گروہ کو دو سجدوں سمیت ایک رکعۃ پڑھائے ۔ جب وہ دوسرے سجدہ سے سر اٹھائے تو یہ گروہ دشمن کے سامنے چلا جائے اور وہ گروہ آئے (جو پہلے دشمن کے سامنے ہو) پھر امام ان کو دو سجدوں سمیت ایک رکعۃ پڑھائے ، تشہد پڑھے اور سلام پھیر دے ، وہ مقتدی سلام نہ پھیریں اور (امام کے سلام پھیرنے کے بعد اٹھ کر) دشمن کے سامنے چلے جائیں اور پہلا گروہ آئے (جس نے امام کے ساتھ نماز شروع کی تھی) اور قراۃ کے بغیر ایک رکعۃ اور دو سجدے تنہا ادا کریں کیونکہ وہ لاحق کے حکم میں ہیں تشہد پڑھیں اور سلام پھیر دیں ، پھر دشمن کے سامنے چلے جائیں اور دوسرا گروہ آئے اور وہ قراۃ کے ساتھ ایک رکعت دو سجدوں سمیت پڑھیں کیونکہ وہ مسبوق کے حکم میں ہیں اور تشہد پڑھیں اور سلام پھیریں ۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے صلاۃ خوف اسی طرح ادا فرمائی تھی اور یہ اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے موجودہ دور میں اس کی مشروعیۃ سے انکار کیا ہے لیکن پیش کردہ حدیث ان پر حجّۃ ہے۔

مسئلہ :

اگر امام مقیم ہو تو وہ گروہ اول اور دوم دونوں کو دو دو رکعتیں پڑھائے۔ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دونوں گروہوں کو نماز ظہر کی دو دو رکعتیں پڑھائی تھیں۔

مسئلہ :

مغرب کی نماز میں پہلے گروہ کو دو اور دوسرے کو ایک رکعۃ پڑھائے کیونکہ ایک رکعۃ کی تنصیف ممکن نہیں اس لیے سبقت اور تقدم کی بناء پر اس کو پہلی رکعۃ کے ساتھ (پڑھنا) اولی قرار دیا۔

مسئلہ :

نماز کی حالت میں جنگ نہ کریں، اگر ایسا کیا تو نماز باطل ہو جائے گی، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق کے دن چار نمازیں ادا نہیں فرما سکے تھے۔ اگر جنگ کرنے کے ساتھ ساتھ نماز بھی جائز ہوتی تو آپ ہرگز نہ ترک فرماتے۔

مسئلہ :

اگر حالات زیادہ نازک صورت اختیار کر لیں تو سواری

ہی ہر اکیلے اکیلے نماز پڑھ لیں۔ رکوع و سجود اشارے سے ادا کریں اور اگر استقبال قبلہ پر قادر نہ ہوں تو جس رخ بھی ممکن ہو پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تمھیں (دشمن کا) خوف ہو تو سوار یا پیدل (جس طرح چاہو پڑھ لو) استقبال قبلہ کا حکم ضرورۃ اور مجبوری کی بناء پر ساقط ہو جائے گا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جماعۃ سے نماز پڑھیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایسے نازک حالات میں میدان جنگ میں اتحاد فی المکان ممکن نہیں۔

[آج کل جنگ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ ہتھیار اس قدر مہلک ایجاد ہو چکے ہیں کہ لحظہ بھر میں مخالف قوت کو نیست و نابود کر سکتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی نماز معاف نہیں اگر محاذ پرسکون ہو تو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا اولیٰ ہے، لیکن اگر فوجیں پر تولے کھڑی ہوں تو ہر مجاہد اپنی سہولت کے مطابق نماز ادا کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مورچے میں ہو، ٹینک میں ہو یا ہوائی جہاز میں۔ اگر وضو کرنا ممکن نہ ہو تو تیمم سے کام لے سکتا ہے۔ بلکہ شدید حالات میں تو بوٹ وغیرہ اتارنے کی بھی ضرورۃ نہیں۔

اگر حالات اور زیادہ سنگین ہو جائیں، گولہ باری شروع ہو۔ بندوقیں ٹینک اور توپیں آگ اگلنے لگیں اور ذرا سی غفلت بھی مہلک ثابت ہو تو نماز میں تأخیر بھی کی جا سکتی ہے، کیونکہ ہمارے آقائے نامدار بھی غزوۂ خندق میں شدت

حالات کی وجہ سے چار نمازیں ادا نہیں فرما سکے تھے ، مگر ان کی قضاء ضروری ہے ۔ گولہ باری بند ہو جانے کے بعد مجاہدین کا فرض ہے کہ وہ فوت شدہ نمازوں کی قضاء کر لیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی ہو اور اس کی رضاء و نصرت حاصل کرنے کے بجائے اس کی ناراضی مول لے لیں ۔

اللہ تبارک و تعالی عالم اسلام کے تمام مجاہدین کو اسلام کا سچا جانثار بنائے اور پاکستان کے مجاھدین کو خاص طور پر اپنی نصرت و رحمت سے سرفراز فرمائے تاکہ یہ قرون اولی کے مسلمانوں کی طرح سچے مسلمان بن کر دنیا میں اسلامی اخلاق و اقدار کو روشن کر سکیں ۔ آمین ثم آمین] !

بَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے کا بیان

مسئلہ :

جب کسی شخص پر موت کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو قبر میں رکھنے کی حالت پر اعتبار کرتے ہوئے اسے دائیں پہلو پر لٹا کر قبلہ رو کر دیا جائے، کیونکہ وہ قبر کے قریب پہنچ چکا ہے، اگر چت لٹا دیا جائے اور منہ قبلہ کی طرف کر دیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ سب اس صورت میں ہے جب مریض کو تکلیف نہ ہو ورنہ جس طرح بھی اس کو آرام ملے اسی طرح لیٹا رہنے دیا جائے۔ ہمارے علاقہ میں چت لٹانا مختار ہے کیونکہ اس طرح روح نہایت آسانی سے خارج ہوتی ہے۔ مگر پہلا طریقہ مسنون ہے۔

مسئلہ :

اس کو تلقین کی جائے (یعنی اس کے سامنے بلند آواز سے شَہادَتَیْن پڑھی جائیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اپنے موتٰی کو اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کی تلقین کیا کرو۔ موتٰی سے مراد وہ شخص ہے جو موت کے قریب پہنچ چکا ہو۔

مسئلہ :

جب وفات پا جائے تو اس کے جبڑے باندھ دیے جائیں

(تاکہ منہ کھلا نہ رہ جائے) اور آنکھیں (نہایت نرمی سے) بند کر دی جائیں یہی طریقہ اسلاف سے چلا آتا ہے - پھر اس میں مردے کی تحسین بھی ہے اس لیے مستحسن ہے -

---

فَصْلٌ فِي الْغُسْلِ

غسل دینے کے بیان میں

مسئلہ :

جب میت کو غسل دینا چاہیں تو اسے تختے پر لٹا دیں تاکہ پانی ادھر آدھر بہ جائے اور اس کی شرمگاہ پر کپڑا رکھ دیں تاکہ واجب پردہ قائم رہے ۔ صرف شرمگاہ کو ڈھانپ دینا کافی ہے ؛ یہی صحیح ہے ، کیونکہ اس سے غسل میں آسانی رہتی ہے ۔

مسئلہ :

میت کے کپڑے اتار دیے جائیں تاکہ صفائی کرنے میں سہولت رہے کلّی کرانے اور ناک میں پانی ڈالنے کے سوا میت کو وضو کرائیں کیونکہ وضو غسل کی سنت ہے ۔ البتہ منہ اور ناک سے پانی نکالنا مشکل ہے اس لیے مضمضہ اور استنشاق چھوڑ دیے جائیں ۔ پھر اس (میت) پر اس طرح پانی بہائیں جس طرح کہ زندہ آدمی غسل کرتے وقت بہاتا ہے ۔

مسئلہ :

میت کی چارپائی کو طاق بار دھونی دی جائے کیونکہ اس میں اس کی تعظیم ہے (اور ماحول بھی پاک صاف اور

معطّر ہوتا ہے) طاق بار کی شرط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب ہے کہ إنَّ اللہَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ یعنی اللہ تعالی وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے ۔

مسئلہ :

پانی میں بیری کے پتے یا اشنان ڈال کر ابالا جائے تا کہ خوب اچھی طرح صفائی ہو سکے ۔ اگر مذکورہ اشیاء دستیاب نہ ہو سکیں تو خالص پانی ہی کافی ہے ، کیونکہ اصل مقصد تو اس سے بھی حاصل ہو جاتا ہے (آج کل تو عمدہ قسم کے صابون بھی موجود ہیں اس لیے دیگر کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں) ۔

مسئلہ :

میت کے سر اور داڑھی کو گل خطمی کے پانی سے دھویا جائے تاکہ خوب صاف ہو جائے ، پھر میت کو بائیں پہلو لٹا کر پانی اور بیری کے پتوں سے دھویا جائے حتی کہ پانی جسم کے اس حصے تک پہنچ جائے جو تختے سے متصل ہے پھر دائیں پہلو پر لٹا کر اسی طرح غسل دیا جائے حتی کہ پانی جسم کے اس حصے تک پہنچ جائے جو تختے کے ساتھ لگا ہے، کیونکہ غسل میں سنت دائیں طرف سے شروع کرنا ہے ۔

پھر اسے سہارا دے کر بٹھایا جائے اور نرم ہاتھوں سے پیٹ کو ملا جائے (نرم ہاتھوں سے ملنا اس لیے ضروری ہے) کہ کہیں کفن ملوّث نہ ہو جائے ۔ (یعنی اگر سختی

سے ملا جائے تو ہو سکتا ہے کہ پیٹ سے کوئی نجاست نکل کر کفن ہی کو خراب کر دے) غسل کے بعد اگر کوئی شے نکلے تو دھو لی جائے اس کے غسل کا اعادہ نہ کیا جائے اور نہ وضو ہی کا کیونکہ غسل کا وجوب ہمیں نص سے معلوم ہوا ہے اور وہ ایک بار دیا جا چکا ہے ۔

غسل کے بعد بدن کو کپڑے سے پونچھ دیا جائے تاکہ اس میت کے کفن گیلے نہ ہو جائیں ۔ اس کے بعد اس کو کفن پہنایا جائے ۔

مسئلہ :

میت کے سر اور داڑھی پر حنوط (خوشبو دار مرکب) اور سجدے والے اعضاء (یعنی ماتھے، ہاتھ، گھٹنے اور قدم) پر کافور لگایا جائے ۔ کیونکہ خوشبو لگانا سنت ہے اور سجدے والے اعضاء کرامت کے زیادہ مستحق ہیں ۔

مسئلہ :

میت کے بالوں اور داڑھی کو کنگھی نہ کی جائے ۔ نہ اس کے ناخن تراشے جائیں اور نہ بال ہی ۔ حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ تم مردے کو کنگھی کس لیے کرتے ہو ؟ یہ امور زیب و زینت سے تعلق رکھتے ہیں اور میت کو ان کی حاجت نہیں ۔ زندہ آدمی کے ناخن وغیرہ تراشنا تو اس میل کچیل کی صفائی کے لیے ہوتا ہے جو اس کے نیچے اکٹھا ہو جاتا ہے اور یہ ختنہ کی طرح ہوگا ۔ (کہ مسلمان اگر بغیر ختنہ کے فوت ہو جائے تو موت کے بعد اس کا ختنہ نہیں کیا جائے گا) ۔

فصلٌ فِی التکفینِ
کفن کے بیان میں

مسئلہ :

مرد کو تین کپڑوں میں کفن دینا مسنون ہے ۔ چادر ، قمیص اور لفافہ ۔ روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سحولیہ شہر کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا اور مرد کیونکہ زندگی میں اکثر عادت کے طور پر تین کپڑے ہی زیب تن کرتا ہے اسی طرح موت کے بعد بھی وہی تعداد مناسب ہوگی (لفافہ وہ کپڑا ہے جو سب سے اوپر لپیٹا جاتا ہے) اگر صرف دو کپڑوں پر اقتصار کیا جائے تو بھی جائز ہے ۔ دو کپڑوں سے مراد چادر اور لفافہ ہیں ۔ یہ کفن کفایہ ہے حضرت ابوبکر صدیق رض نے فرمایا تھا کہ میرے یہ دو کپڑے دھو ڈالو اور انہی میں مجھے کفن دینا نیز دو کپڑے زندوں کا کم از کم لباس ہے ۔ ازار سر سے پاؤں تک ہوتا ہے اور اسی طرح لفافہ بھی اور قمیص گردن کے شروع سے پاؤں تک ۔

مسئلہ :

جب کفن لپیٹنے کا ارادہ کریں تو اس کی بائیں جانب

سے لپیٹنا شروع کریں پھر دائیں جانب سے جیسا کہ زندگی کی حالت میں ہوتا ہے (کہ کمبل یا چادر پہلے بائیں جانب سے لپیٹی جاتی ہے) ۔

کفن بچھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے لفافہ بچھایا جائے پھر اس پر چادر بچھائی جائے ۔ پھر میت کو قمیص پہنائی جائے اور اسے ازار پر لٹا دیا جائے پھر ازار کو پہلے بائیں پھر دائیں جانب سے لپیٹ دیا جائے ۔ پھر اسی طرح لفافہ لپیٹا جائے ۔

اگر کفن کھل جانے کا اندیشہ ہو تو چھوٹے سے کپڑے سے باندھ دیں تاکہ کھل نہ سکے ۔

مسئلہ :

عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے ۔ درع ، ازار ، خمار (اوڑھنی) ۔ لفافہ (سینہ بند) ایک کپڑا ہے جو چھاتی کے اوپر باندھا جاتا ہے ۔ حضرت ام عطیہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کو پانچ کپڑے دیے ، جو آپ کی بیٹی (حضرت زینب رض) کو غسل دے رہی تھیں ، نیز عورت زندگی میں بھی پانچ کپڑے ہی پہن کر گھر سے نکلتی ہے ۔ اس لیے موت کے بعد بھی وہی تعداد بحال رکھی جائے گی ۔ یہ مسنون کفن کا بیان ہے اگر وہ تین کپڑوں ازار ، لفافہ اور خمار پر اقتصار کریں تو بھی جائز ہے اور یہ کفن کفایہ ہے ۔ لیکن اس سے کم مکروہ ہے ۔ اسی طرح مرد کے کفن میں ایک کپڑے پر اقتصار کرنا بھی مکروہ ہے ۔ ہاں اگر مجبوری ہو تو کوئی حرج نہیں

کیونکہ حضرت مُصعب بن عُمیرؓ نے جب جام شہادت نوش فرمایا تو آپ کو ایک ہی کپڑے میں کفن دیا گیا تھا اور یہ کفن ضرورۃ ہے۔ (کیونکہ وہاں دوسرا کپڑا میسر ہی نہ تھا)

مسئلہ :

عورت کو پہلے دِرع پہنائی جائے پھر اس کے بالوں کو دو حصے کر کے اس کے سینے پر درع کے اوپر ڈال دیا جائے پھر اس کے اوپر خمار لپیٹا جائے پھر ازار اور آخر میں لفافہ۔

مسئلہ :

مصنّفؒ فرماتے ہیں کہ میّت کو کفن میں رکھنے سے پہلے کفن کو طاق بار دھونی دی جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کے کفن کو طاق مرتبہ دھونی دینے کو فرمایا تھا۔ اجمار سے مراد خوشبو دار کرنا ہے (یعنی آگ پر خوشبودار مرکب ڈال کر کفن کو دھوآں دیتے ہیں تاکہ خوشبودار ہوجائے)۔ جب تکفین سے فارغ ہو جائیں تو نماز جنازہ کی تیاری کریں کیونکہ وہ ایک فریضہ ہے۔

فَصْلٌ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ

میت پر نماز پڑھنے کا بیان

مسئلہ :

نماز پڑھنے کا سب سے زیادہ حقدار سلطان ہے بشرطیکہ وہ موجود ہو ، کیونکہ سلطان کے ہوتے ہوئے اگر کسی دوسرے کو آگے کریں تو اس میں سلطان کی تذلیل ہے ۔

اگر سلطان موجود نہ ہو تو قاضی نماز پڑھائے کیونکہ وہ بھی صاحب ولایت ہوتا ہے ، اگر قاضی بھی موجود نہ ہو تو قبیلے کا امام نماز پڑھانے کے فرائض ادا کرے ، کیونکہ وہ میت کی زندگی میں بھی پسندیدہ تھا ۔ زندگی میں وہ اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتا تھا تو موت کے بعد بھی اس کی پسندیدگی قابل اعتبار ہوگی) ۔

مصنف[رح] فرماتے ہیں امام الحی کے بعد میت کا ولی مستحق امامت ہے ۔ اولیاء کی ترتیب وہی ہے جو کتاب النکاح میں بیان کی گئی ہے ۔

اگر ولی اور سلطان کے علاوہ کوئی نماز پڑھائے تو ولی کو حق پہنچتا ہے کہ اگر چاہے تو نماز کا اعادہ کر سکتا ہے جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ حق اولیاء ہی کا ہوتا ہے ۔

مسئلہ :

اگر ولی نماز پڑھائے تو بعد میں کسی اور شخص کو اعادے کا حق حاصل نہیں کیونکہ فرض تو پہلی نماز سے ادا ہوجاتا ہے ۔ اور نفل اس میں مشروع نہیں ۔ اسی لیے ہم نے دیکھا کہ تمام لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر نماز چھوڑ دی ہے ۔ حالانکہ آنحضرتؐ آج بھی قبر میں اسی طرح موجود ہیں جس طرح دفن کیے گئے تھے ۔

مسئلہ :

اگر میت کو نماز پڑھے بغیر ہی دفن کردیا جائے تو اس کی قبر پر نماز پڑھی جائے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری عورت کی قبر پر نماز پڑھی تھی ۔

نعش کے قبر میں گل سڑ جانے سے پہلے ہی اس پر نماز پڑھی جائے اس میں اعتبار غالب رائے کا ہوگا کیونکہ حال اور زمان ومکان کے اختلاف کی وجہ سے یہی صحیح ہے گرمیوں میں نعش جلد خراب ہو جاتی ہے اور سردیوں میں دیر سے ۔ اسی طرح فربہ جسم کی بہ نسبت کمزور اور دبلا پتلا جسم دیر سے خراب ہوتا ہے ۔ زمین زمین میں بھی فرق ہوتا ہے ، کسی میں جسم دیر تک محفوظ رہتا ہے اور کسی میں نہیں ۔ لہذا اس علاقے کے عاقل لوگوں کی رائے کا اعتبار ہوگا ۔

مسئلہ :

نماز جنازہ کی کیفیت حسب ذیل ہے :-

سب سے پہلے تکبیر کہے اور ثناء پڑھے پھر تکبیر کہکر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے - پھر تکبیر کہہ کر اپنے لیے، میت کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے ، پھر تکبیر کہکر سلام پھیر دے ، کیونکہ آنحضرتؐ نے جو آخری نماز جنازہ پڑھائی اس میں چار تکبیریں کہیں - اس لیے پہلی تمام صورتیں منسوخ ہونگی -

مسئلہ :

اگر امام پانچویں تکبیر کہے تو مقتدی اس میں متابعت نہ کرے بخلاف امام زفرؒ کے ، ہماری دلیل وہ روایت ہے جو ہم ابھی پیش کرچکے ہیں ، اس لیے پانچویں تکبیر والی صورت منسوخ ہوگی - ایک روایت کے مطابق مقتدی سلام کا انتظار کرے اور یہی مختار ہے -

نماز جنازہ میں دعائیں میت کی مغفرت کے لیے ہیں - ثناء اور درود کے ساتھ ابتدا کرنا سنّتِ دعا ہے. بچے کے لیے استغفار کی ضرورت نہیں بلکہ کہے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطاً وَاجْعَلْهُ لَنَا أَجْرًا وَذُخْرًا وَاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعاً وَ مُشَفَّعاً"

مسئلہ :

اگر امام ایک تکبیر یا دو تکبیریں کہ چکا ہو تو آنے والا اس وقت تک تکبیر نہ کہے جب تک کہ وہ اس کے آنے کے بعد اگلی تکبیر نہ کہے یہ طرفینؒ کا قول ہے -

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جونہی شامل ہو تکبیر کہے کیونکہ پہلی تکبیر افتتاح کے لیے ہوتی ہے اور مسبوق یہ تکبیر بلا انتظار کہتا ہے -

طرفینؒ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر رکعت کے قائم مقام ہے اور مسبوق کے لیے یہ جائز نہیں کہ پہلے مافات یعنی ادا شدہ کو ادا کرنے لگے کیونکہ یہ منسوخ ہے (البتہ ابتداء اسلام میں جائز تھا کہ صحابہ کرام اگر ایک دو رکعتوں کے بعد جماعت میں شامل ہوتے تو دوسرے صحابہ سے دریافت کر لیتے کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں وہ اشارے سے بتلا دیتے ۔ تو مسبوقین پہلے ادا شدہ رکعات پڑھتے پھر جماعت میں شامل ہو جاتے مگر بعد میں یہ طریقہ منسوخ کر دیا گیا) ۔

اگر حاضر ہو مگر امام کے ساتھ تکبیر نہ کہہ سکے تو متفقہ طور پر دوسری تکبیر کا انتظار نہ کرے (بلکہ تکبیر کہہ کر شامل ہو جائے) ۔ کیونکہ وہ بمنزلۂ مدرک ہے ۔

مسئلہ :

نماز پڑھاتے وقت امام میت کے سینے کے متوازی کھڑا ہو کیونکہ سینہ مقام دل ہے اور دل میں نور ایمان ہوتا ہے تو سینے کے متوازی کھڑا ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میت کی شفاعت اس کے ایمان کی وجہ سے کی جا رہی ہے (کیونکہ نماز جنازہ کی دعائیں بمنزلۂ شفاعت ہیں) ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ امام مرد کے سر کے متوازی کھڑا ہو اور عورت کے وسط کے متوازی ، کیونکہ حضرت انسؓ نے ایسا ہی کیا تھا ۔ اور آپؓ نے فرمایا کہ یہی سنت ہے ۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے فعل کی تأویل یہ

ہے کہ اس عورت کا جنازہ منعوش یعنی مستور نہ تھا (یعنی میت کے اوپر ستر کے لیے کوئی انتظام نہ تھا فقط کفن ہی تھا) ۔ اس لیے حضرت انس رض میت اور لوگوں کے درمیان حائل ہو گئے ۔

مسئلہ :

اگر لوگ سواریوں پر ہی نماز جنازہ پڑھ لیں تو قیاس کے مطابق وہ جائز ہے کیونکہ نماز جنازہ دعا ہے اور بلحاظ استحسان جائز نہیں کیونکہ تحریمہ کے ہونے کی وجہ سے وہ ایک طرح سے نماز ہے اس لیے احتیاط کے طور پر قیام کو بلا عذر ترک کرنا جائز نہیں ۔

مسئلہ :

ولی کے علاوہ دوسرے شخص کو نماز جنازہ کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نماز جنازہ پڑھانا ولی کا حق ہے ۔ (تو اس کی اجازت کے بغیر) کسی کو آگے کرنے میں ولی کے حق کا بطلان لازم آتا ہے (اگر ولی خود اجازت دے تو جائز ہے) بعض نسخوں میں عبارت اس طرح ہے ۔ لَا بَأْسَ بِالْأَذَانِ یعنی نماز جنازہ کا اعلان کیا جائے اور لوگوں کو چاہیے کہ دوسروں کو بھی بتائیں تاکہ سب مل کر نماز کا حق ادا کر سکیں ۔ جیسا کہ آج کل نماز جنازہ کی اطلاع کے لیے نقارہ بجایا جاتا ہے) ۔

مسئلہ :

وہ مسجد جو نماز کے لیے مخصوص ہو اس میں نماز جنازہ

نہ پڑھی جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جو شخص مسجد میں نماز جنازہ پڑھے گا اسے ذرا بھی اجر نہ ملے گا" کیونکہ مساجد فرض نمازوں کے ادا کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں ۔ نیز مسجد کے ملوث ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے ۔

اگر میت مسجد سے باہر ہو (اور نمازی مسجد میں ہوں) تو اس صورت میں بھی مشائخ میں اختلاف ہے ۔

مسئلہ :

بچہ اگر ولادت کے بعد بلند آواز سے روئے (پھر فوت ہو جائے) ۔ تو اس کا نام رکھا جائے اس کو غسل دیا جائے اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے کیونکہ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے کہ "بچہ جب (پیدائش کے بعد) آواز سے روئے تو اس پر نماز پڑھی جائے ۔ اگر نہ روئے تو نہ پڑھی جائے" نیز رونا زندگی کی علامت ہے اس لیے مردوں کے مسنون حقوق اس کے حق میں بھی ثابت ہوں گے ۔

اگر بچہ پیدائش کے بعد رویا نہیں اسے بنی آدم کی تعظیم وتکریم کے طور پر کپڑے میں لپیٹ دیا جائے لیکن اس پر نماز نہ پڑھی جائے جیسا کہ ہم پہلے روایت بیان کر چکے ہیں ۔ غیر ظاہر روایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے کیونکہ وہ بھی ایک طرح سے نفس ہے اور یہی مختار ہے ۔

مسئلہ :

(کافر) ماں باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ بچہ بھی قید ہو اور وہ مر جائے تو اس پر نماز نہ پڑھی جائے

کیونکہ وہ (مذہب میں) والدین کے تابع ہوتا ہے ۔ البتہ بچہ اگر عقلمند ہو اور اسلام کا اقرار کرے (تو نماز پڑھی جائے) کیونکہ اس کا اسلام لانا استحسان کے طور پر درست ہے یا والدین میں سے ایک مسلمان ہو جائے (تب بھی نماز پڑھی جائے) کیونکہ اسے والدین میں سے عمدہ مذہب کے حامل کے تابع قرار دیا جائے گا ۔

اگر بچے کے ساتھ ماں باپ میں سے کوئی بھی قید نہ ہو تو اس صورت میں نماز پڑھی جائے کیونکہ دارالاسلام میں اسے اسلام کے تابع ہی سمجھا جائے گا اور اس پر اسی طرح اسلام کا حکم جاری ہوگا جس طرح لقیط میں ۔ (یعنی دارالاسلام میں اگر ساقط شدہ بچہ مردہ پڑا ہوا ملے تو اس کو مسلمان سمجھ کر دفن کریں گے) ۔

مسئلہ :

اگر کافر مر جائے اور اس کا مسلمان ولی موجود ہو تو وہ اس کو غسل دے ، کفن پہنائے اور دفن کر دے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے والد ابی طالب کے حق میں اسی طرح حکم دیا گیا تھا ۔ کافر مردے کو اس طرح غسل دیا جائے جیسے کسی ناپاک کپڑے کو دھویا جاتا ہے ۔ (یعنی مسنون غسل ضروری نہیں) کپڑے کے چیتھڑے میں لپیٹ دیا جائے اور تکفین اور لحد میں مسنون امور کا لحاظ رکھے بغیر چھوٹا سا گڑھا کھودا جائے اور اس میں رکھا نہ جائے بلکہ ڈال دیا جائے ۔

فَصْلُ فِي حَمْلِ الْجَنَازَةِ

جنازہ اٹھانے کا بیان

مسئلہ :

جب میت کو چارپائی پر (رکھ کر) اٹھائیں تو اس کے چاروں پایوں سے پکڑیں ۔ سنت اسی طرح وارد ہوئی ہے اور اس میں جماعت کی تکثیر ہے ، میت کی عزت میں اضافہ ہے اور صیانت و حفاظت بھی ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں سنت طریقہ یہ ہے کہ چارپائی کو دو آدمی اٹھائیں اگلا اپنی گردن پر رکھے اور پچھلا سینے پر کیونکہ حضرت سعد بن معاذؓ کا جنازہ اسی طرح اٹھایا گیا تھا ۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ کے جنازہ کو فرشتوں کے ان پر اژدھام کی وجہ سے اس طرح اٹھایا گیا تھا ۔

مسئلہ :

چار پائی اٹھا کر ذرا تیز تیز چلیں ، دوڑ نہ لگائیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب رفتار کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ”رفتار دوڑنے سے کم ہو“ ۔

مسئلہ :

جب چارپائی لے کر قبر کے پاس پہنچیں تو جنازے کو

گردنوں سے نیچے اتارنے سے پہلے بیٹھنا مکروہ ہے، کیونکہ بعض دفعہ چارپائی رکھنے کے لیے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور کھڑے ہونے کی صورت میں مدد کرنا زیادہ آسان ہے۔

جنازہ اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ جنازے کا اگلا حصہ اپنے دائیں کندھے پر رکھے پھر اس کا پچھلا حصہ اپنے بائیں کندھے پر۔ پھر اس کا اگلا حصہ اپنے دائیں کندھے پر رکھے پھر اس کا پچھلا حصہ بائیں کندھے پر تاکہ دائیں طرف کو ترجیح حاصل رہے۔ یہ مذکورہ طریقہ باری باری اٹھانے کی صورت میں ہے (اگر صرف چار آدمی ہوں تو پائے بدلنے کی ضرورت نہیں)۔

فَصْلٌ فِي الدَّفْنِ

دفن کا بیان

مسئلہ :

قبر کھودی جائے اور لحد بنائی جائے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہ لحد ہمارے لیے ہے اور شق ہمارے غیروں کے لیے ہے" (لحد یہ ہے کہ قبر کے اندر قبلہ کی جانب میں جنازہ کو رکھنے کے لیے گڑھا کھودا جائے اور شق قبر کے وسط میں کھودی جاتی ہے ۔ یہودی اسی طرح کرتے تھے ۔ لہذا نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے لیے لحد تجویز فرمائی ۔ جس علاقے میں زمین بہت نرم ہو اور لحد کی صورت میں قبر کے گر جانے کا خطرہ ہو تو شق بنائی جائے ۔ حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اہل مدینہ کے لیے تو لحد ہے اور دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے شق ۔

مسئلہ :

میت کو قبلے کی طرف سے قبر میں داخل کیا جائے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں قبر کی پائنتی کی جانب سے اتارا جائے ۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پائنتی کی جانب سے اتارا گیا تھا ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ قبلہ والی جانب فضیلت و عظمت کی حامل ہے لہذا اس جانب سے اتارنا مستحب ہوگا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داخل کرنے میں روایات مضطرب ہیں۔

مسئلہ :

جب میت کو لحد میں رکھا جائے تو رکھنے والا یہ الفاظ کہے بِسْمِ اللهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللهِ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو دجانہؓ کو قبر میں رکھتے ہوئے یہی کلمات ادا فرمائے تھے۔

مسئلہ :

میت کا چہرہ قبلہ کی طرف پھیرا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اسی طرح حکم دیا تھا۔

کفن کی گرہیں کھول دی جائیں، کیونکہ اب کفن کے منتشر ہونے کا اندیشہ نہیں رہا۔

مسئلہ :

لحد پر کچی اینٹیں لگائی جائیں کیونکہ آنحضرت کی قبر میں کچی اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ جب تک عورت کی لحد پر اینٹیں نہ لگائی جائیں قبر پر کسی بڑے کپڑے سے پردہ کیا جائے۔ مرد کی قبر پر پردہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ عورتوں کی حالت پردے پر مبنی ہوتی ہے اور مردوں کی انکشاف پر (زندگی میں یہی حالت ہوتی ہے کہ عورتیں پردہ کرتی ہیں اور مرد کھلے بندوں پھرتے ہیں)۔

مسئلہ :

لحد میں پختہ اینٹیں اور لکڑیاں لگانا مکروہ ہے کیونکہ یہ اشیاء تو عمارت کی پختگی کے لیے ہیں مگر قبر تو بوسیدگی کی جگہ ہے ۔ نیز پختہ اینٹوں میں آگ کا اثر ہوتا ہے اس لیے تفاؤل کے طور پر بھی (ان کا لگانا) مکروہ ہے ۔

مسئلہ :

لحد ہموار کرتے وقت سرکنڈے استعمال کرانے میں کوئی حرج نہیں اور الجامع الصغیر میں ہے کہ سرکنڈوں اور کچی اینٹوں سے کام لینا مستحب ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر سرکنڈوں کا پورا گٹھا رکھا گیا تھا ۔

(لحد ہموار کرنے کے بعد) قبر میں مٹی ڈالی جائے قبر کو کوہان نما بنایا جائے اور مربع شکل میں نہ بنایا جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو مربع بنانے سے منع فرمایا جس نے بھی آپ کی قبر مبارک دیکھی ہے اس نے یہی بتایا کہ وہ کوہان نما ہے ۔

بَابُ الشَّهِيدِ

شہید کا بیان

مسئلہ :

شہید وہ ہے جسے مشرک قتل کر دیں یا میدان جنگ میں مردہ پایا جائے اور اس کے بدن پر زخموں کے نشانات ہوں - یا مسلمان اسے ظلماً قتل کر دیں اور اس کے قتل کی دیت واجب نہ ہوئی ہو -

شہید کو کفن دیا جائے اور نماز پڑھی جائے مگر غسل نہ دیا جائے کیونکہ وہ معنوی لحاظ سے شہداء اُحد کے حکم میں ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''انہیں اپنے زخموں اور خون سمیت کفن دو مگر انہیں غسل نہ دو'' - لہذا ہر وہ شخص جو ظلماً ہتھیار سے قتل کیا جائے اور وہ پاک اور بالغ ہو اور اس کے قتل کے عوض میں مال واجب نہ ہو تو وہ معنوی طور پر شہید ہے اور شہداء کے حکم میں ہوگا -

متن میں ''اثر'' سے مراد زخم ہے کیونکہ زخم قتل کی علامت ہوتا ہے اسی طرح آنکھ وغیرہ غیر معتاد جگہ سے خون کا نکلنا (بھی قتل کی علامت ہوگا) -

امام شافعیؒ کو نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف ہے

وہ فرماتے ہیں کہ تلوار شہید کے تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے ۔ اس لیے تلوار نے شفاعۃ اور دعاء استغفار کی ضرورت نہیں رہنے دی ۔

ہم کہتے ہیں ۔ میت پر نماز پڑھنا اس کی کرامت اور تعظیم کے اظہار کے لیے ہے اور شہید اس تعظیم کا زیادہ حق دار ہے اورگناہوں سے پاک شخص بھی دعاء سے اس طرح مستغنی نہیں ہوتا جیسے نبی اور بچہ ۔

مسئلہ :

جس شخص کو اہل حرب یا باغی یا ڈاکوؤں نے قتل کیا ہو خواہ کسی چیز سے قتل کیا ہو اسے غسل نہ دیا جائے کیونکہ اُحد کے سارے شہداء تلواروں اور ہتھیاروں ہی سے قتل نہیں کئے گئے تھے (بلکہ بعض کو پتھروں اور لاٹھیوں سے بھی شہید کیا گیا تھا) ۔

مسئلہ :

اگر کوئی شخص جنابت کی حالت میں شہید ہو تو اسے امام اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق غسل دیا جائے ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں غسل نہ دیا جائے کیونکہ جنابت سے جو واجب ہوا وہ موت سے ساقط ہوگیا ۔ (وہ موت کے بعد غسل کرنے کا مکلّف نہیں رہا) اور غسل ثانی (جو موت سے واجب ہوتا) شہادت کی وجہ سے واجب نہیں رہا ۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ شہادت وجوب غسل سے مانع ہے ۔ غسل کی رافع نہیں (یعنی جو غسل پہلے ہی واجب

تھا ، اُسے رفع نہیں کر سکتی) ۔ لہذا شہادت سے جنابت رفع نہ ہوگی اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حضرت حنظلہؓ نے حالت جنابت میں جام شہادت نوش فرمایا تو فرشتوں نے انہیں غسل دیا تھا ۔ (اسی لیے حضرت حنظلہ کو غسیل الملائکہ کہا جاتا ہے) ۔ حائضہ اور نفاس والی دونوں ہی جب حیض و نفاس سے پاک ہو جائیں (اور غسل سے پہلے شہید ہو جائیں تو ان) کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے ۔ اسی طرح صحیح روایۃ کے مطابق حیض و نفاس کے انقطاع سے پہلے کی صورت میں بھی اختلاف ہے اور بچے کے بارے میں بھی ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ عدم غسل کی کرامت کا بچہ زیادہ حق دار ہے (اس لیے اسے غسل نہیں دیا جائے گا) امام اعظمؒ کا ارشاد ہے کہ شہداء احد کے حق میں تلوار ہی غسل کا کام کر گئی کیونکہ اس میں پاک کرنے (یعنی گناہ مٹا دینے) کی صفت ہوتی ہے اور بچہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے ۔ لہذا شہداء احد کے حکم میں نہ ہوگا ۔

مسئلہ :

شہید سے نہ تو اس کا خون دھویا جاتا ہے اور نہ اس کا لباس ہی اتارا جاتا ہے جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں ۔ البتہ پوستین ، جیکٹ ٹوپی ، ہتھیار ، جوتا اور موزہ اتار لیا جائے گا کیونکہ یہ اشیاء جنس کفن سے نہیں ۔

اور (اگر کفن عدد مسنون سے کم ہو تو (تمام کفن کے لیے ضرورت کے مطابق کمی بیشی کر سکتے ہیں ۔

مسئله :

جس شخص کی وفات تأخیر سے ہو (یعنی میدان جنگ میں زخمی ہونے کی جگہ فوت نہ ہو بلکہ بعد میں وفات پائے) اسے غسل دیا جائے وہ دنیاوی لوازمات حاصل کرنے کی وجہ سے شہادت کے حکم سے پیچھے رہ گیا ہے کیونکہ اس سے ظلم کے اثر میں تخفیف ہو جاتی ہے ۔ لہذا معنوی لحاظ سے شہداء احد کے حکم میں نہیں رہا ۔ ارتثاث یہ ہے کہ کچھ کھا لے یا پی لے یا سو جائے یا دوا دارو کرے یا میدان جنگ سے زندہ اٹھا لیا جائے کیونکہ اس نے زندگی کے بعض لوازمات حاصل کر لیے ۔ لیکن شہداء احد نے پیاسے ہی جام شہادت نوش کیا حالانکہ پانی کے گلاس انہیں پیش کئے جا رہے تھے ۔ لیکن شہادت میں کمی آنے کے خوف سے انھوں نے پانی قبول نہیں کیا ۔ ہاں اگر زخمی کو اس کے گرنے کی جگہ سے اس لیے ہٹا لیا جائے کہ کہیں گھوڑے نہ روند ڈالیں (تو وہ شہداء احد کے حکم میں ہوگا) کیونکہ اس نے راحت (زندگی) میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ۔ اگر زخمی کو بڑے خیمے یا چھوٹے خیمے میں لا کر ڈال دیا جائے تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ ارتثاث کی صورت ہوگی ۔

اگر وہ ہوش وحواس کی حالت میں اتنی دیر زندہ رہے کہ نماز کا وقت گذر جائے تو وہ مرتث ہے کیونکہ وہ نماز اس کے ذمے واجب ہوگئی اور نماز کا یہ وجوب زندہ لوگوں کے احکام میں سے ہے ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ سے اسی طرح مروی ہے ۔

اگر اس نے امور آخرۃ کے بارے میں کچھ وصیّۃ کی تو ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ بھی ا تثاث کی صورت ہو گی کیونکہ یہ ارتفاق ہے (اس میں بھی استعانۃ اور انتفاع ہے) امام محمدؒ کے نزدیک ارتثاث نہیں ہوگا کیونکہ وصیّۃ تو مرنے والوں کے احکام میں سے ہے -

مسئلہ :

جو شخص شہر میں مقتول ملے اسے غسل دیا جائے کیونکہ قتل کے سلسلے میں قسم اور دیت واجب ہوگی (اہل محلہ قسم کھائیں گے کہ ہمیں قاتل کا علم نہیں یا ہم مقتول کی دیت ادا کریں گے) اس لیے ظلم کے اثر میں تخفیف آ جائے گی - ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی ہتھیار سے ظلماً قتل کیا گیا ہے (اور قاتل کا علم بھی ہو جائے تو بھی غسل نہ دیا جائے) کیونکہ اس قتل میں قصاص واجب ہے اور یہ سزا ہے جس سے قاتل عموماً نہیں بچ سکتا - (اگر اس کا پتا چل جائے) تو دنیا ہی میں (سزا پا لیتا ہے ورنہ آخرۃ میں) - امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جس چیز سے قتل ہونے میں دیر نہ لگے وہ بھی تلوار کی طرح ہے (اگر لوہے کے ہتھیار کے بجائے پتھر یا لاٹھی مار کر مار ڈالا جائے اور قاتل کا پتا چل جائے تو غسل نہیں دیا جائے گا) ان شاء اللہ اس پر تفصیلی بحث باب الجنایات میں کی جائے گی -

مسئلہ :

جو شخص کسی سزا کے تحت قتل کیا جائے یا قصاص میں

تو اسے غسل دیا جائے اور نماز پڑھی جائے کیونکہ وہ اپنی جان ایک ایسے حق کے ایفاء میں دے رہا ہے جو اس پر واجب ہے، لیکن شہداء احد نے اپنی عزیز جانیں محض اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں صرف کی تھیں اس لیے یہ مقتول ان کے ساتھ شامل نہیں ہوگا۔

مسئلہ :

اگر باغیوں یا ڈاکوؤں میں کوئی شخص مارا جائے تو اس پر نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ حضرت علیؓ نے باغیوں پر نماز نہیں پڑھی تھی۔

بَابُ الصَّلٰوةِ فِی الْکَعْبَةِ

خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کا بیان

مسئلہ :

بیت اللہ کے اندر فرض اور نفل نماز پڑھنا جائز ہیں ۔ امام شافعیؒ فرضوں اور نفلوں دونوں میں اختلاف کرتے ہیں اور امام مالکؒ نفل میں اختلاف رکھتے ہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن بیت اللہ کے اندر نماز ادا فرمائی تھی کیونکہ وہ نماز ہے اور قبلہ کے موجود ہونے کی وجہ سے اس میں نماز کی تمام شرائط اکٹھی ہیں ۔ کعبہ کا استیعاب ضروری نہیں (کیونکہ اگر کعبہ کے باہر بھی نماز پڑھی جائے تو بھی استیعاب نا ممکن ہے ۔ اس لیے کہ استیعاب تو صرف سامنے والی جانب کا ہوتا ہے) ۔

مسئلہ :

اگر امام کعبے کے اندر جماعت سے نماز پڑھائے اور کوئی مقتدی امام کی طرف پیٹھ کرلے تو بھی نماز جائز ہے کیونکہ وہ قبلہ کی طرف متوجہ ہے اور وہ اپنے امام کو غلطی پر تصور نہیں کرتا بخلاف مسئلہ تحری کے (کہ رات کی تاریکی

میں تحری کرکے لوگ امام کے ساتھ نماز ادا کریں تو ان میں سے بعض اس خیال سے اپنی پیٹھ امام کی پیٹھ کی طرف کرلیں کہ امام کی جہت غلط ہے تو ایسے مقتدیوں کی نماز جائز نہیں کیونکہ وہ امام کی جہت کو غلط شمار کرتے ہیں) ان میں سے جس شخص نے اپنی پیٹھ امام کے منہ کی طرف کی اس کی نماز جائز نہیں کیونکہ وہ امام سے آگے بڑھ گیا ہے (اور اقتداء میں یہ ضروری ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کھڑا ہو)۔

مسئلہ :

امام اگر مسجد حرام میں جماعت کرا رہا ہو اور لوگ خانہ کعبہ کے گرد حلقہ بنالیں اور امام ہی کی نماز پڑھیں پھر جو شخص امام کی نسبت کعبہ کے زیادہ قریب ہو اس کی نماز جائز ہے، جب کہ وہ امام کی جانب نہ ہو کیونکہ تقدم اور تأخر تو جانب کے اتحاد کے وقت ہی ظاہر ہوتا ہے جبکہ جانب متحد ہو (اور مذکورہ صورت میں جانب مختلف ہے)۔

مسئلہ :

جو شخص کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے تو اس کی نماز بھی جائز ہے اس میں امام شافعیؒ کو اختلاف ہے۔
ہماری دلیل یہ ہے کہ کعبہ نام ہے زمین وآسمان کی درمیانی فضاء اور خلاء کا، صرف عمارت کا نام کعبہ نہیں، کیونکہ عمارت تو کئی بار بدلی گئی ہے (اگر عمارت ہی کا نام کعبہ ہوتا تو عمارت کی تبدیلی سے کعبہ کعبہ نہ رہتا) اسی لیے اگر کوئی شخص ابو قبیس پر نماز پڑھے تو جائز ہے حالانکہ عمارت اس

کے سامنے نہیں ہوتی ۔

البتہ کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے میں کراہت ضرور ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے ۔ (اس لیے سقف کعبہ پر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے) ۔

فہرست ترجمة كتاب الصلاة من الهداية

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ نمبر

---:o:---